جرمِ وفا

محی الدین نواب

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے دوران بنگالیوں
بہاریوں اور مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستانیوں
نے جو الم ناک صعوبتیں برداشت کیں اور انسانی تاریخ کے جس
خونچکاں اور غیر انسانی دور سے وہ گزرے ہیں ماضی کی حکومت
نے اس دور کے اذیت ناک واقعات پر پردہ ڈالنے کی پوری
کوشش کی تھی لیکن اب صحافیوں، ادیبوں اور مبصروں کو اظہارِ
حقیقت کی مکمل آزادی ہے اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان
(ستارۂ پاکستان) اور بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن
صدیقی نے المیۂ مشرقی پاکستان کا بھرپور عسکری
تجزیہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسا ہی آئینہ
ہے جس میں ہم اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

نام کتاب : جرمِ وفا
مصنف : محی الدین نواب
قیمت : تیس روپے
سنِ اشاعت ۱۹۸۵ء
مطبوعہ: ایس، ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس دہلی
ناشر: کتاب والا ۲۷۹۴، پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

محی الدین نواب

جرم وفا

میں راقم الحروف محی الدین نواب پیدائشی طور پر بنگالی ہوں۔ آباؤاجداد کی نسبت سے مدراسی ہوں۔ مشرقی پاکستان میں جب وہاں کے باشندوں نے بہاری، یوپی، سی پی، پنجاب، سرحد اور مدراس وغیرہ کے لوگوں کو مجموعی طور پر ماوڑا (بہاری) کہنا شروع کیا تو میں بھی بہاری کہلانے لگا۔ بنگالی لغات میں ماوڑا لفظ نہیں ہے۔ یہ لفظ محض بہاریوں سے نفرت کے اظہار کے لیے تراشا گیا ہے۔ جب ہم اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے ماوڑا جیسے نفرت انگیز الفاظ تراش کر لسانی تاریخ میں نت نئے الفاظ کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ ایک فخریہ حقیقت ہے کہ اپنے وطن کی کوئی بات ہو تو ہم سینہ تان کر خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم صوبائی، قومی اور ذات برادری کی برتری ثابت کرتے وقت تقسیم ہو جاتے ہیں۔ خود کو پاکستانی کہنا بھول جاتے ہیں۔ ایسی بھول کا عبرتناک انجام ہمارے سامنے بنگلہ دیش کی صورت میں ہے۔

مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک وہاں کے بنگالیوں، بہاریوں، پنجابیوں نے بڑی اذیت ناک صعوبتیں برداشت کی ہیں اور تاریخ کے سب سے خونچکاں اور غیر انسانی دور سے گزرتے آئے ہیں۔ ماضی کی حکومت نے تاریخ کے اس ندامت انگیز دور پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی لیکن موجودہ حکومت نے صحافیوں اور مبصروں کو اظہار حقیقت کا حوصلہ دیا ہے۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان ستارۂ پاکستان، اور بریگیڈیر (ریٹائرڈ) عبدالرحمن صدیقی نے البتہ مشرقی پاکستان کا بھرپور عسکری تجزیہ کیا ہے۔ میں بھی زیر نظر کہانی میں عسکری، سماجی اور اقتصادی تجزیہ پیش کر رہا ہوں۔

میں یہ واضح کر دوں کہ یہ داستان موضوع کے اعتبار سے سیاسی ہے لیکن یہ ابتدا سے انتہا تک مکمل رومانی داستان ہے۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی، سسکتی اور تڑپتی ہوئی اور پھول کھلاتی ہوئی محبتوں کے پہلو بہ پہلو اسمگلنگ، سازشوں اور تحیر انگیز واقعات کے ایسے چونکا دینے والے سلسلے اس داستان میں ہیں کہ آپ ایک قسط پڑھنے کے بعد دوسری اقساط کا بے چینی سے انتظار کریں گے لیکن آپ پہلی قسط کو یہ سوچ کر پڑھیں کہ ابھی کہانی کی اٹھان ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کسی کو گولی ماری گئی۔ وہ گولی ایک طرف کی کنپٹی کو توڑتی ہوئی دوسری کنپٹی سے پار ہو گئی اور وہ شخص ابھی اورنگی ٹاؤن کراچی میں زندہ ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک شخص کا گلا نرخرے تک کاٹ دیا گیا۔ وہ دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لیے آدھی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اسپتال تک پیدل چلتا رہا۔ وہ سید پور بنگلہ دیش میں آج بھی زندہ ہے۔

میں اس کہانی میں ایسے جتنے ناقابل اعتبار کردار پیش کروں گا، ان سب کے نام اور پتے درج کرتا جاؤں گا۔ آپ ان معمر کرداروں کی میڈیکل رپورٹ وغیرہ پڑھ کر ایمان لے آئیں گے کہ جو باتیں انسان کے امکان میں نہیں ہیں وہ رب کریم کے دست غیب میں ہے اور ایسے معجزے ہم سب کو ربوبیت پر دعوت فکر دیتے ہیں۔

اس سچی اور ناقابل فراموش داستان کو قلمبند کرنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے اخباری کالموں اور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے

۱۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم امراؤ خان ستارۂ پاکستان ۲۔ بریگیڈیر (ریٹائرڈ) عبدالرحمان صدیقی ۳۔ میاں ظفیر احمد ۴۔ ممتاز مورخ ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "پاکستان ڈیوائیڈڈ" ۵۔ میجر (ریٹائرڈ) معین باری، سابق رکن قومی اسمبلی، ۶۔ منظور احمد بحوالہ روزنامہ "جنگ"۔

راقم الحروف

محی الدین نواب

کلثوم نے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ اپنی جوان بیٹی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "تارا! مائیں دودھ پلانے کے لیے ہوتی ہیں لیکن میں تجھے ہر پیالی دل سے نجات کا یہی ایک راستہ رہ گیا ہے اسے پی لے۔"

مگر تارا نے اپنی جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر ماں کو دیکھا جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کی کٹورا جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر باپ نے کہا تھا: "اس کا نام بھی تارا ہونا چاہیے۔"

تارا نے سر گھما کر اپنے ابا جان کو دیکھا وہ خیمے کے ایک طرف لکڑی کے صندوق پر ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ خیمے کا ایک پٹ اٹھا ہوا تھا باہر دور تک اور بہت سے خیمے نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر اور باہر مرد، عورتیں اور بچے گھر گرہستی کے سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کے کارکنان کے درمیان راشن تقسیم کرتے پھر رہے تھے۔

ابھی تارا کے آگے بھی زہر ملا راشن رکھا ہوا تھا۔ وہ رونے لگی۔ کلثوم نے پوچھا "کیوں روتی ہو؟ کیا عزت کی موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی! موت چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو، زندہ رہنے والوں کو ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں تو ڈر نہیں لگتا۔ مجھے دیکھو، اپنے ابا کو دیکھو، ہم نے تمہارے سامنے قسم کھائی ہے جب تم مر جاؤ گی جب ہمیں تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے گا تو ہم بھی اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

"آپ کے لیے جان پر کھیلنا آسان ہے، کیونکہ آپ دونوں اپنی عمر تقریباً گزار چکے ہیں اور میں ابھی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

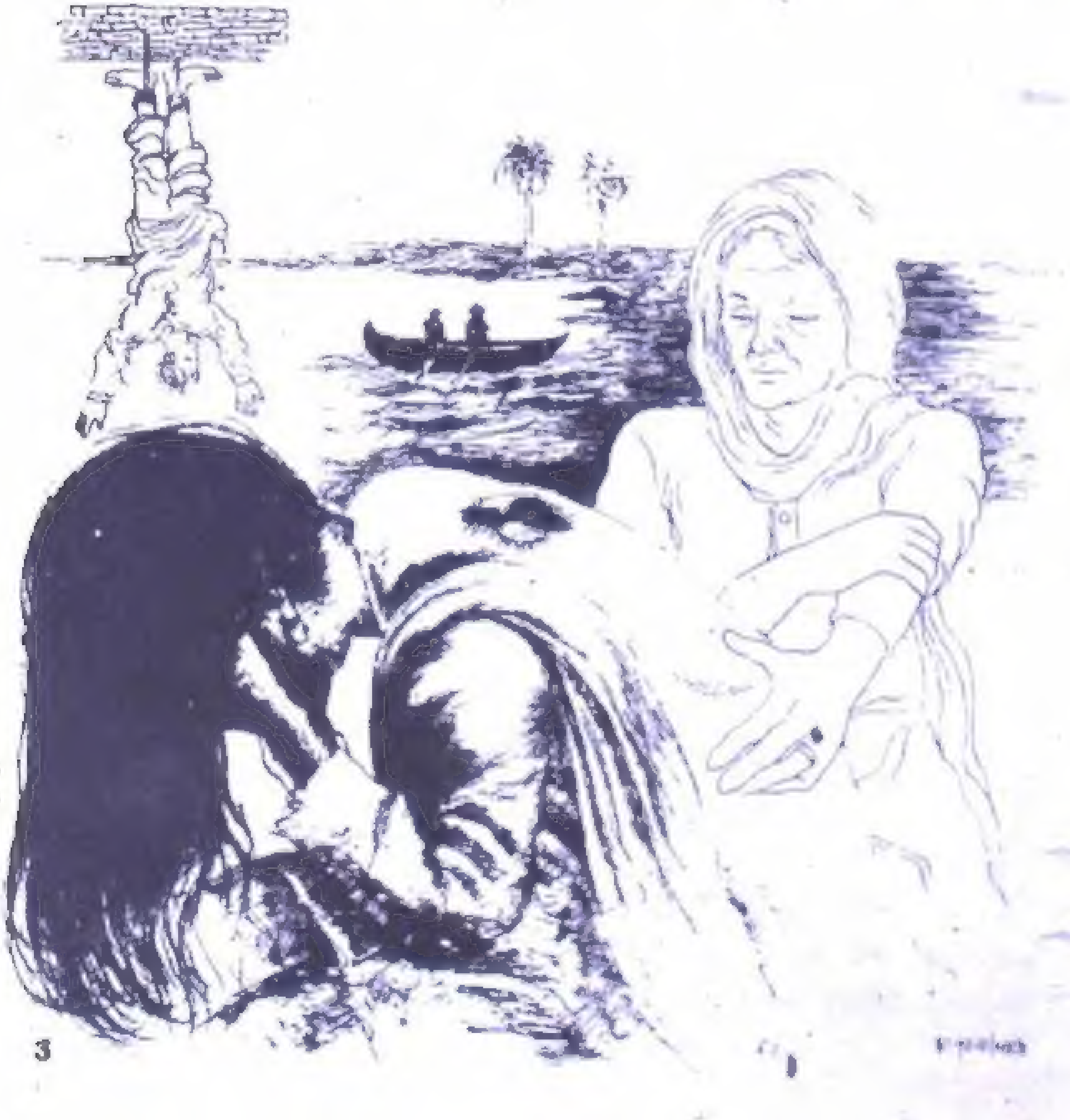

باپ نے سر اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معصوم کلی کی طرح تھی۔ ابھی اس کے کھلنے کا موسم آیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے متعلق وہ سوچ رہے تھے۔ حالات بھی بگڑتے جا رہے تھے کہ برا وقت آنے والا ہے۔ سب سے پہلی بڑی خبر سولہ دسمبر کی رات کو سنائی دی۔ ریڈیو سے بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی سب لوگوں نے اپنے اپنے گھر کے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لیا تھا۔ تمام مرد، عورتیں، بچے سہمے ہوئے سے تھے۔ رات کو رہ رہ کر جے بنگلہ کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی بیک فائرنگ ہوتی تھی۔ امیر علی نے بیٹی تارا اور اس کی ماں کو تاکید کی تھی کہ وہ فرش پر لیٹی رہیں۔ وہ خود چاروں شانے چت پڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کوئی گولی دروازے یا کھڑکی کو توڑ کر آئے گی اور کسی کا قصہ تمام کر دے گی۔ تارا بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی۔ باہر سے جے بنگلہ کے نعرے سن کر کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں آپ ہی آپ پاکستان زندہ باد کے نعرے مچل رہے تھے۔ اس نے کروٹ بدل کر کہا: "ابا جان! اب کیا ہوگا؟"

وہ سرگوشی میں ڈانٹ کر بولے: "خاموش رہو۔ جوان لڑکی کی آواز خواہ کتنی ہی دھیمی ہو، بندوق کی گولی کی طرح باہر جاتی ہے۔"

وہ چپ رہی۔ سبھی چپ رہے۔ سبھی بے یقینی کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ ان کا یقینِ محکم کہہ رہا تھا یہ سیاہ رات گزر جائے گی۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح کل بھی پاکستان کی صبح دیکھ سکیں گے۔

اس رات کسی کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی آنکھیں یوں کھلی رہیں جیسے وہ پلک جھپکنا بھول گئی ہوں۔ آدھی رات کے بعد فائرنگ میں کچھ کمی ہوئی۔ انہوں نے فرش پر سے اٹھنے کی ہمت کی۔ دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ سہمے ہوئے انداز میں کھڑکیوں اور دروازوں کو وہ تکتے رہے۔ کبھی کبھی سڑک پر سے بھاری بھرکم گاڑیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس طویل سناٹے کے بعد اچانک ہی فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تو وہ خوف سے لرز جاتے تھے۔

صبح ہوتے ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان ہونے لگا: "خاص طور سے بہاریوں کو وارننگ دی جاتی ہے کہ جب تک ان کے گھروں کی تلاشی نہ لی جائے اس وقت تک وہ باہر نہ نکلیں۔ جن کے پاس ریوالور، پستول، رائفل یا دوسرے ہتھیار ہیں وہ تھانے میں لا کر جمع کر دیں۔ جو چالاکی دکھائے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔"

سب اپنے اپنے گھروں میں بند رہے۔ امیر علی نے آنگن میں آ کر پڑوسی کو آواز دی: "موسیٰ بھائی کہاں ہو؟ میری آواز سن رہے ہو؟"

دوسری طرف سے موسیٰ بھائی نے کہا: "ہاں سن رہا ہوں مگر کچھ بول نہیں سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہمارا انجام کیا ہوگا؟"

"اپنے انجام سے زیادہ اپنی جوان بیٹیوں کی فکر کرنی چاہیے۔"

پڑوسن نے کہا: "بھائی صاحب! لڑکیوں کا سوچ سوچ کر جان آدھی ہو رہی ہے۔ یہ آپ کے بھائی جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے گھروں کی تلاشی لینے والے دوست نہیں ہو سکتے اور جو دشمن ہوتے ہیں وہ جان و مال کے ہی نہیں عزت کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔"

موسیٰ بھائی نے کہا: "سنو امیر بھائی! تلاشیاں لینے والے بیک وقت تمام گھروں کی تلاشیاں نہیں لے سکیں گے۔ ہم یہاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ وہ لوگ جن گھروں میں آئیں گے ان گھروں کی لڑکیاں پیچھے گندی گلیوں میں چلی جائیں گی۔ وہاں سے وہ دوسرے گھروں میں جا کر چھپ جائیں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

وہ تلاشی لینے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی، کوئی نہیں آیا۔ گھروں کے اندر اور باہر سناٹا چھایا رہا۔ سڑک پر کبھی کبھی گاڑیوں کے گزرنے کی آواز آتی اور کبھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ پتہ چلا کہ نیو کالونی کی دکانوں کو لوٹا جا رہا ہے۔ جن کی دکانیں تھیں وہ بے چارے گھر سے نکل نہیں سکتے تھے۔

شام کو چند گھروں کی تلاشی لی گئی۔ رات کو پھر وہی تاریکی اور پر ہول سناٹا چھایا رہا۔ عورتیں اور بچے اپنے اپنے کمروں میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ مردوں نے احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آنگن کی کچی زمینوں کو کھود کر وہاں چاقو، دوسرے ہتھیار، نقد رقم اور زیورات وغیرہ چھپا رہے تھے تاکہ کسی اور وقت انہیں کام میں لا سکیں۔ جن گھروں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی تھیں وہاں ایک آنگن سے دوسرے آنگن تک کوئی ضروری خبر آسانی سے

پہنچادی جاتی تھی۔ کبھی کسی کے آنگن میں کہیں سے کاغذ کا ایک گولہ آکر گرتا تھا۔ اس طرح ایک گھر والا دوسرے گھر والے کو تحریر کے ذریعے اطلاع فراہم کرتا تھا کہ فلاں گھر کی تلاشی لی جارہی ہے۔ ٹولی میں ملاؤں کے ساتھ مکتی باہنی کے غنڈے بھی ہیں اور ان کے پاس خطرناک قسم کے ہتھیار ہیں۔

چار دن تک گھر گھر کی تلاشی لی گئی۔ سب نے ان مکتی باہنی کے خطرناک جوانوں کو دیکھا۔ ابتدا میں ان کی پہچان یہی تھی کہ ان کی بڑی بڑی زلفیں نظر آتی تھیں، جو کاندھے تک ہوتی تھیں اور ان کا کوئی مخصوص لباس نہیں تھا۔ وہ پتلون اور شرٹ پہنتے تھے یا پھر ہندوستانی فوج کی اترن وردی میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کے پاس روسی ساخت کی بندوقیں تھیں جو ایک وقت میں اٹھائیس کارتوس کا ایک راؤنڈ فائر کرتی تھیں۔

پہلے انھوں نے بڑی نرمی سے تلاشی لی۔ یہ پوچھتے رہے کہ انھوں نے اپنا مال کہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ ریڈیو اور دوسرے قیمتی سامان اٹھا کر لے جاتے تھے لیکن انہیں حیرانی ہوتی تھی کہ کسی بھی بہاری کے گھر سے پچاس روپے! سو روپے سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ کسی کے ہاں زیور بھی نکلا نہیں نکلے۔ یہ تعجب کرنے والی بات یوں تھی کہ عام طور پر بنگالیوں کے مقابلے میں بہاری زیادہ دولت مند سمجھے جاتے تھے اور ڈھونڈنے والوں کو دولت نہیں مل رہی تھی۔

آخر انھوں نے جھنجھلا کر کہا: "یہ [illegible] بہاری بہت بدمعاش ہیں۔ ان کا دانہ پانی بند کردو۔"

دوسرے دن سے دانہ پانی بند تو نہیں کیا گیا لیکن مہنگائی بڑھ گئی۔ صبح کے وقت آٹا تین روپے سیر تھا رات کو دس روپے سیر ہوگیا۔ چاول پندرہ روپے سیر کے حساب سے فروخت ہونے لگے۔ مضافاتی علاقوں سے سبزی اور انڈے لاکر بیچنے والے بنگالیوں نے منہ مانگی قیمت وصول کرنا شروع کردی۔ اب کھانے کے لالے پڑے تھے۔ پیٹ مہنگائی کو نہیں دیکھتا۔ وہ زمین میں چھپائی ہوئی نقدی۔ تو نکال نکال کر خریدنے لگے۔ جو غریب تھے وہ کبھی فاقے کرنے لگے کبھی سستی دال اور ستو سے پیٹ بھرنے لگے۔

ایک ہفتے بعد کھانے پینے کا سامان بیچنے والوں نے پاکستانی روپے لینے سے انکار کردیا۔ جو بھی مال خریدنے جاتا تھا اس سے کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی کرنسی لے کر آؤ۔ یہ اعلان بنگلہ دیش حکومت کا نہیں تھا۔ مکتی باہنی کے غنڈوں نے بہاریوں کی چھپی ہوئی دولت نکلوانے کے لیے ہندوستانی کرنسی کی اہمیت بڑھادی تھی۔ اب پاکستانی نوٹوں کے عوض ہندوستانی نوٹ نہیں ملتے تھے۔ اشیاء

گل فروش نے اپنے سامنے سے گزرنے والے ایک نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کا ایک ہار لیے جائیے جناب۔"

"میری کوئی محبوبہ نہیں ہے" نوجوان نے جواب دیا۔

"تب اپنی بیوی کے لیے ایک ہار لے جائیے۔"

"افسوس، ابھی تک میں غیر شادی شدہ ہوں۔"

"اے دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان!" گل فروش نے نوجوان کی طرف ہار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تب یہ ہار میری طرف سے اپنی خوش قسمتی کے تحفے کے طور پر بالکل مفت لے جائیے۔"

* * *

ایک روز شاہد میاں اپنے پڑوسی حامد میاں کے باغیچے میں پہنچے اور ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ "تم اس گڑھے میں کیا دبا رہے ہو؟"

"چند بیج بو رہا ہوں۔" حامد میاں نے روکھا سا جواب دیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" شاہد میاں نے غصے سے کہا۔ "مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم میری مرغی کو دفن کر رہے ہو۔"

"تم بھی درست کہتے ہو۔" حامد میاں نے جواب دیا۔ "اور میں بھی درست کہہ رہا ہوں کیونکہ بیج تمہاری مرغی کے پیٹ میں ہیں۔"

کرنسی حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے گھر کا سامان اور زیور بیچنے پڑتے تھے۔ اس طرح مٹی میں چھپے ہوئے زیورات بھی نکلنے لگے۔

روٹی ہر دور میں سونے سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ روٹی کو خریدنے کی قوت ہوتی ہے اس لیے اس کی مہنگائی کا احساس نہیں ہوتا لیکن قوتِ خرید کمزور ہو جائے یا ختم ہو جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے بدلے سونا بھی سستا ہے اور اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ ہندوستانی زرگر بہاری بستیوں میں گشت کرتے رہتے تھے

بنیے وہاں آتے

سو اور پچاس روپے تولے کے حساب سے سونا خریدتے تھے اس سے زیادہ وہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ محصور پاکستانی ان کی مقرر کردہ قیمت پر سب کچھ فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر وہ فروخت نہ کرتے تو انہیں ہندوستانی کرنسی نہ ملتی۔ پھر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بنیے خرید کر نہیں لے جائیں گے تو مکتی باہنی کے غنڈے چھین کر لے جائیں گے۔ بی ای ال ہندوستانی فوجیوں نے ان غنڈوں کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا تھا۔

بارہ دن کے بعد جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کی امداد پہنچ گئی۔ آٹا، چاول، دودھ، شکر، کپڑے، کمبل اور دوائیں وغیرہ ملنے لگیں۔ اگرچہ تین وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کافی نہیں ملتا تھا لیکن اس حد تک اطمینان ہو گیا تھا کہ اب گھر کا بچا کھچا سامان فروخت نہیں کرنا پڑے گا۔ دن کو بھوکے رہیں گے، کوئی بات نہیں، رات کو پیٹ بھر کر سوئیں گے۔ ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے سے نیند آ جائے۔ نیند کے لیے لازمی ہے کہ دماغ فکر سے آزاد ہو اور وہ اپنی عورتوں اور جوان لڑکیوں کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ ایک ماہ کے بعد پتہ چلا کہ محصور رہنے والے بہاریوں کے گھروں سے کتنی ہی لڑکیاں غائب ہو گئی ہیں۔ کتنے ہی بوڑھوں اور جوانوں کو رات کی تاریکی میں گولی مار دی گئی ہے۔ کس کی زندگی کب ختم ہو جائے گی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس وہ اس امید پر جی رہے تھے کہ مغربی پاکستان کے بھائی ان کے لیے فکرمند ہوں گے۔ انہیں امداد پہنچانے یا انہیں اپنے پاس بلانے کی کوشش میں مصروف ہوں گے۔

دو ماہ گزر گئے۔ تیسرے ماہ پتہ چلا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے سیاسی اور جنگی مبصرین، اخباری رپورٹر اور فوٹوگرافر وغیرہ آ رہے ہیں۔ ایسے وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں نے گھر گھر پہنچ کر مردوں اور عورتوں کو سمجھانا شروع کیا: "ہم پاکستانی ہیں۔ ملکی یا غیر ملکی اخبارات کے رپورٹر کوئی بھی سوال کریں تو ہم پاکستانی کی حیثیت سے جواب دیں گے۔"

نعیم الدین شیروان پاکستانی جوانوں میں پیش پیش تھا۔ اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ نیو کالونی میں اس کی ایک الیکٹریکل گڈز کی دکان تھی۔ اسے بجلی کے کاموں میں مہارت حاصل تھی۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی سند نہیں تھی لیکن وہ اچھا خاصا الیکٹریکل انجینئر تھا۔ اس نے امیر علی کے ہاں آ کر پوچھا: "چچا میاں! کیا آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"نہیں بیٹے! میری بیوی اور بیٹی کسی پڑوسیوں کے ہاں گئی ہیں۔"

"ہم نے ایک ٹیم بنائی ہے اور ہم تمام لوگوں کو سمجھاتے پھر رہے ہیں کہ ہم پاکستانی تھے۔ پاکستانی ہیں اور پاکستانی رہیں گے۔ کوئی بھی ہم سے سوال کرے تو ہم سب کا ایک جواب ہونا چاہیے۔"

امیر علی نے کہا: "لیکن بیٹے! بنگالی اخبارات یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہاں کوئی پاکستانی نہیں رہا۔"

"لیکن ریڈ کراس سوسائٹی کی یہ رپورٹ جینوا تک پہنچ چکی ہے کہ کسی بہاری نے اپنے مکان کی چھت پر اب تک بنگلہ دیش کا پرچم نہیں لہرایا ہے۔ آپ اپنے آس پاس رہنے والے بزرگوں اور جوانوں کو بلا کر لے آئیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کریں گے۔"

"تم یہاں بیٹھو میں ابھی لوگوں کو بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ مکان کا اگلا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ادھر وہ گیا، ادھر گندی گلی کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔ نین تارا کسی پڑوسی کے ہاں سے آ رہی تھی۔ شیروان اگلا دروازہ بند کر رہا تھا۔ آواز سن کر اس نے کمرے کے اندر سے دور آنگن کی طرف دیکھا۔ وہ آتے جاتے کسی لڑکی کو دیکھتا تھا تو نظریں جھکا لیتا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں جھک نہ سکیں۔ پہلے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اچھی کیوں لگ رہی ہے۔ جیسی عمر کی لڑکیاں ہوتی ہیں ویسی ہی وہ بھی تھی۔ بہت سے لوگ پھولوں کو دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ وہی پھول کسی کے جوڑے میں لگا ہو تو نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ قدم رک جاتے ہیں۔ دراصل دیکھنے والی نگاہیں وقت اور ماحول کے مطابق کسی لگاؤ سے متاثر ہوتی ہیں۔ جنگ کے شعلے میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ شعلے نوکیلے سے تھے۔ ایسے میں نین تارا ایک ٹھنڈی چاندنی سی لگی۔ بارود کے کان پھاڑ

دینے والے دھماکوں میں وہ ایک سرگوشی کی طرح سنائی دی۔ دھواں دھواں فضاؤں میں ایک نور کی کرن کی طرح نگاہوں کے سامنے چلی آئی۔ جیسے وہ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ البتہ ایک مدت کے بعد اسے دیکھا تھا اس نے۔

وہ بڑے اطمینان سے آنگن میں آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ابا جان گھر پہ نہیں ہیں، کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے دوسرے کمرے کے اندر نہیں دیکھا۔ آنگن سے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔ والدین اپنی جوان بیٹیوں کو کبھی باہر دشمنوں کی نظروں سے چھپا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کچھ یوں احتیاطی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ انہیں شوخ رنگ کا لباس پہننے نہیں دیتے تھے۔ کنگھی چوٹی سے منع کرتے تھے۔ نین تارا نے میلا سا لباس پہنا ہوا تھا لیکن بدن کا رنگ تو اجلا تھا وہ لباس کی طرح نہ میلا ہو سکتا تھا نہ اس پر دھبہ لگ سکتا تھا۔ دھبہ بھولے سے لگ جاتا تو وہ چاند کا داغ کہلاتا۔ اس نے کنگھی نہیں کی تھی، چوٹی نہیں گوندھی تھی۔ اس کی زلفیں رات کی طرح کالی، آرزوؤں کی طرح گھنی اور انجانی منزل کی مسافت کی طرح لانبی تھیں۔ کوئی بھی مسافر بھٹک جاتا۔ بہتر تھا کہ وہ چوٹی گوندھ لیتی یا جوڑا باندھ لیتی۔ وہ اپنے حسن کو چھپانے کی کوشش میں کچھ اور حسین ہو گئی تھی۔

وہ بھوکی تھی، کھانے کے لیے باورچی خانے میں آئی تھی۔ ایک طرف چولہا ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ موری کے پاس جھوٹے برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک پلیٹ کو دھونے کے بعد ہانڈی سے بھات نکالنے لگی۔ اسی وقت اسے آہٹ سنائی دی۔ اس کے ابا جان کھڑاؤں پہنتے تھے۔ چلتے تھے تو دور ہی سے ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ جوتا پہن کر چلنے والوں کی چاپ کچھ اور ہوتی ہے۔ نین تارا کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے ذرا سر گھما کر دیکھا۔ پھر ایک دم سے چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔

"ڈرو نہیں، میں تمہارا ہی ہوں۔ میرا نام نعیم الدین خسرو ہے۔ تم نے وہ الیکٹریکل گڈز کی دکان دیکھی ہوگی، وہی جو تمہارے اسکول کے راستے میں پڑتی ہے۔ کوئی ڈیڑھ دو برس پہلے تم ادھر سے اسکول جایا کرتی تھیں مگر تب

آخری تجویز

جب مریض کو ڈاکٹروں سے اپنی صحت یابی کے بارے میں پوری نا امیدی ہو گئی تو اس نے لیٹے لیٹے لڑکوں کو وصیت وغیرہ کرنے کے لیے جمع کیا۔ جب وہ انہیں اہم ضروری تمام ہدایتیں دے چکے تو لڑکوں نے خوشنودی کے لیے اپنی طرف سے اظہار رائے شروع کیا۔ ایک بیٹے نے کہا۔ "پاپا جی! ہم نے آپ جیسا محبت اور شفقت کرنے والا باپ نہیں دیکھا۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کی تجہیز و تکفین کے انتظام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ آپ یقین کریں تو آپ کے تابوت کے ساتھ عزیز و اقارب اور پھولوں سے لدی ہوئی کم از کم ایک سو کاریں ہوں گی اور . . ." دوسرے بیٹے نے بات کاٹ کر کہنا شروع کیا۔ "ذرا ہوش کی بات کریں۔ پاپا نے اتنی محنت سے جو دولت کمائی ہے کیا ہم اسے اس طرح ضائع کرنے پر تل گئے ہیں۔ صرف دس کاریں اور چند قریبی عزیز رشتہ دار کافی ہوں گے۔" اس کے چپ ہوتے ہی منجھلا بیٹا بول پڑا۔ "بھئی آپ لوگ خواہ مخواہ خرچ بڑھانے پر مصر ہیں۔ بس دو کاریں ٹھیک رہیں گی۔" سب چھوٹے نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا۔ "یہ کار والا چکر ہی فضول خرچ کی بات ہے۔ سادگی کا طریقہ ہی مناسب ہے کہ ٹیکسی گھوڑا گاڑی۔" یہ تمام گفتگو سن کر مریض مرنے والے نے بستر ہی میں اپنا فیصلہ سنایا۔ "ابھی کچھ وقت باقی ہے ذرا میرے کپڑے لادو۔ میں پیدل ہی قبرستان تک چلا جاؤں گا۔"

میں اور اب میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ میں پہلے تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم تارا ہو؟ نین تارا ہے نا؟"

وہ سہمے ہوئے انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلاتے ہوئے بولی: "ہاں مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تمہارے والد سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر پڑوسیوں کو بلانے گئے ہیں۔ ابھی یہاں ایک اہم میٹنگ ہے۔"

وہ چپ چاپ اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس نے کہا: "تارا! میں ایک بات کہتا ہوں۔ تمہیں برا لگے گا مگر میں ضرور کہوں گا۔ ابھی تمہیں دیکھ کر میرے دل سے دعا نکل رہی ہے کہ ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں خوبصورت نہ ہوں۔"

نین تارا کو اپنی امی کی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی کہتی تھیں: "ارے جنم جلی! موتی بھائی کی بیٹی کو دیکھ، کیسی سانولی ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور دانت بڑے بڑے ہیں۔ تو بھی ذرا سی بدصورت ہو جاتی تو کیا فرق پڑ جاتا؟ اس بات کا دھڑکا تو نہ رہتا کہ کوئی تجھے اٹھا کر لے جائے گا۔"

خسرو نے کہا: "میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ بنگالی مجھے بنگالی سمجھتے ہیں اور بہاری مجھے بہاری۔"

نین تارا نے سہم کر پوچھا: "تم کون ہو؟ بہاری؟"

خسرو نے انکار میں سر ہلایا۔ نین تارا نے اسی طرح سہم کر پوچھا: "بنگالی؟"

خسرو نے پھر انکار میں سر ہلا کر کہا: "نہ میں بنگالی ہوں نہ بہاری۔ صرف پاکستانی ہوں۔"

وہ آگے بڑھا۔ وہ خوف کے مارے پیچھے ہٹی۔ پھر دیوار سے جا کر لگ گئی۔ خسرو نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے برتنوں کے پاس ایک توا اوندھا رکھا ہوا تھا۔ وہ ادھر گیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں توے پر رکھیں۔ توے کو سہلایا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نین تارا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "میں اگر تم پر کوئی ظلم کروں تو تم زیادہ سے زیادہ چیخ سکتی ہو۔ اگر میں ظالم ہوتا تو تمہارا گلا بھی دبا سکتا ہوں۔ تم چیخنا بھی بھول جاؤ گی۔"

وہ جیسے چیخنا بھول گئی تھی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ بالکل قریب چلا آیا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اس کی ہتھیلیاں توے کی کالک سے سیاہ پڑ گئی تھیں۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کی ساری سیاہی اس کے چہرے پر مل دی۔

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ پہلی ملاقات میں دشمن ہی اتنے قریب آتے ہیں اور کسی اچھی نیت سے نہیں آتے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی غیر نے اسے ہاتھ لگایا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر اس کے ہاتھوں کو محسوس کر رہی تھی۔

سیاہی مل کر خسرو پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے ذرا دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور ایک میلے کپڑے سے اپنے ہاتھوں کی کالک کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پچیس دسمبر کی رات کو ایک غنڈا غفار ماسٹر کے گھر سے ایک لڑکی کو کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ میں نے موقع پا کر اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ اسے ختم کر دیا۔ اس کی تلاشی لی تو جیب سے صرف ایک ریوالور نکلا۔ اس میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی۔ میں نے اس ریوالور کو رکھ لیا۔"

وہ بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے بولی: "تت۔۔ تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں چپ چاپ سنو۔ میرے لیے بڑی مشکل ہے۔ میں کھل کر دشمنوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ مجھے بنگالی سمجھتے ہیں۔ میں انہیں خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ وہ ایک بہاری لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اس لڑکی کی عزت بچا سکتا ہوں۔ میرے پاس ریوالور تھا لیکن اس میں صرف ایک ہی گولی تھی۔ جانتی ہو میں نے کیا کیا؟"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا: "میں نے اس گولی کو ضائع نہیں کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ کسی طرح اس لڑکی کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی ہے تو میں نے لڑکی کو گولی مار دی۔"

وہ دم سادھ کر رہ گئی۔ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ خسرو نے اس کے کالک زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج میں نے تمہاری صورت بگاڑی ہے۔ کبھی حالات بگڑیں گے تو تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔"

وہ دیوار سے لگی ہوئی ایک طرف چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر فوراً ہی پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے

[illegible] انکار کرنے لگے کہ [illegible]
سے زیادہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔

[illegible] مشہور تھا [illegible] ہوتی ہے اور [illegible]

[illegible]

[illegible]
سے بڑھ کر کوئی عورت بیوقوف نہیں ہو سکتی۔

[illegible] نقصان نہیں ہو سکتا ہے کہ
کیا عورتیں بھی آپس میں برابر ہوتی ہیں یا نہیں۔

[illegible]

[illegible]
ایسا ہے کہ ہر شخص [illegible] ہے وہ کہتا ہے۔

[illegible]

شادی [illegible] اپنے [illegible] ہیں کچھ ایسے [illegible]
اور [illegible]

[illegible] اپنے کمرے میں ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی

[illegible]

ایک تو ہم [illegible] رہیں گے۔ دوسرے تو [illegible]

[illegible] کریں گے کہ ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم

نہیں کیا ہے؟

[illegible]

بیٹے! تم لوگ جوشیلے اور جذباتی جوان ہو۔ ہم
دنیا دیکھی ہے۔ بھلا پچھتاوا دیواروں سے نکل کر کہتے ہیں [illegible]

[illegible]

سے محفوظ رہنے کے لیے یقیناً مضبوط چار دیواری کی ہی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ہم الگ الگ چار دیواریوں میں رہتے ہیں۔ اگرچہ ایک ہی بستی میں رہتے ہیں لیکن ہمارے مکانات ایک دوسرے سے دور دور ہیں۔ رات کی تاریکی میں غنڈے بدمعاش آتے ہیں۔ کسی ایک مکان پر دھاوا بولتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہم کھلے میدان میں متحد ہو کر ایک کیمپ میں رہیں گے تو [illegible]! ان کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ ہم متحد ہو کر کم سے کم نقصان اٹھائیں گے۔ دشمن اگر کسی کی بیٹی یا بہن کو اٹھا کر لے جانا چاہیں گے تو سب مل کر ان کے آگے دیوار بن جائیں گے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ تصور کی آنکھ سے مین تارا نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے دشمن کے درمیان بھی دیوار بن سکتا تھا۔ اس کی حفاظت کر سکتا تھا مگر کس رشتے سے؟

خسرو نے دل ہی دل میں کہا: "انسانیت کے رشتے سے۔ میں دوسری لڑکیوں کے لیے بھی فکر مند رہتا ہوں۔ مین تارا کے لیے بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

دل نے کہا: "دوسری لڑکیوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ ایک کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے گولی مار دی تاکہ عزت کی موت مر جائے اور دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھے۔ کیا مین تارا کو گولی مار سکتے ہو؟"

اس سوال کے بعد ہی مین تارا سہمی سہمی نظر آئی۔ وہ باورچی خانے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور خوفزدہ نظروں سے خسرو کو دیکھ رہی تھی۔ کیسی اجلی رنگت تھی۔ خوف سے اس کا سفید چہرہ کچھ زرد پڑ گیا تھا۔ شاید چولہے کی گرمی سے یا موسم کی گرمی سے یا ایک اجنبی کی موجودگی سے پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ حیا سے سرخ پڑ رہی تھی۔ خسرو نے اب سے پہلے اتنے قریب سے ایسا حسن نہیں دیکھا تھا جو بیک وقت چاند کی طرح زرد ہو، اجلی اجلی صبح کی طرح سرد ہو اور حیا کی گرمی سے سرخ ہو۔ نظر آتا ہو مگر خواب سا لگتا ہو۔

وہ مرد آہن تھا۔ اس کے پاس فولاد کا دل اور سپاہی کے بازو تھے مگر وہ انسان بھی تھا۔ اس لیے شاعری کی پرواز رکھتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی اچھی، بہت اچھی لگی تو اس کے اندر بیٹھے ہوئے شاعر نے کہا: "اسے گولی نہیں ماری جا سکتی۔ اس کے لیے گولی کھائی جا سکتی ہے۔"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ ایک بزرگ پوچھ رہے تھے "کیا بات ہے بیٹے! تم بولتے بولتے رک کیوں گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

"آں ہاں۔" اس نے آس پاس خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ چند بوڑھے نظر آئے۔ پھر اس کی نظریں بے اختیار اس دیوار کی طرف گئیں جس کے دوسری طرف دوسرا کمرہ تھا۔ دوسرے کمرے میں مین تارا دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس دیوار کے پاس آ گئی جو خسرو سے نسبتاً قریب تھی۔ ایسے پردے کی طرح حائل تھی جسے ہٹا کر دیکھ نہیں سکتی تھی مگر سن سکتی تھی۔ وہاں پڑوس کے بزرگ حضرات نہ ہوتے تو وہ ضرور پوچھتی: "تم مجھے گولی مارنے والے کون ہوتے ہو؟ کیا میرے ماں باپ نے مجھے تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟"

وہ دیوار سے لگ کر ہٹ گئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک بڑا سا آئینہ نظر آیا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئی۔ اس نے قریب آ کر آئینے میں دیکھا۔ گویا رنگ کالا ہو گیا تھا۔ چہرے کی گوری رنگت کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ سیاہی پوڈر کی طرح نہیں لگی تھی۔ چہرے پر ایک سے زیادہ تل نکل آئیں تو لڑکیاں اسے برداشت نہیں کرتیں۔ گوری رنگت پر کسی طرح کا نشان بیٹھ جائے تو منہ دھو دھو کر اس نشان کو مٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک وہ تھی جو اب تک سیاہی کو برداشت کر رہی تھی۔

دراصل آئینہ دیکھنے سے قبل اسے اس کالک کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ آئینہ دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ کالک تو گنہگاروں کے منہ پر لگائی جاتی ہے۔ اس نے کیا سوچ کر ایسا کیا اور کیا سوچ کر برداشت کر لیا۔

دراصل وہ کالک لگانے والے سخت اور کھردرے ہاتھ خیالوں میں اسے ستا رہے تھے۔ اپنے منہ کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر سوچا۔ یہ کوئی دلیری سی دلیری ہے کہ پہلی ملاقات تک پہنچتے پہنچتے پہنچ گئے اور یہ بزدلی سی بزدلی [illegible]

اس نے ایک انگلی اٹھا کر اپنے رخسار کو چھو کر دیکھا۔ ارادہ تھا، پہلے کپڑے سے چہرے کو پونچھے پھر صابن سے منہ دھوئے لیکن اس کی انگلی اپنے رخسار پر ٹھہر گئی ____

وہ سوچتی جا رہی تھی۔ جہاں جہاں گوری رنگت جھلک رہی تھی وہاں ایک انگلی سے کالک کو پھیلاتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ چہرہ پوری طرح کالا ہو گیا۔ صرف دیدے سفید رہ گئے تھے۔ رات کو آئینہ دیکھتی تو اپنے

آپ سے مُڑ جاتی۔ تب اس نے تسلیم کیا، دشمن بھی اس سے ڈریں گے تو نہیں لیکن منہ پھیر کر چلے جائیں گے۔

وہ جو آیا تھا وہ بڑا ہنر والا تھا۔ صورت بنانے کے لیے صورت بگاڑ کر گیا تھا۔ وہ آئے گا، ہر نقش آئے گا وہ بگاڑے گا بار بار بگاڑے گا۔ دنیا کی ہر صورت اپنے مربی کے ہاتھوں بڑے پیار سے بگڑتی ہے۔ ہاں بگڑتی ہے تب ہی اس کی بن آتی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ خسرو کے دن بڑی مشکل سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنی دکان میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا تھا۔ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہزار مصروفیات کے باوجود وہ روشن آنکھوں اور کالے چہرے والی دھیان میں آجاتی تھی۔ اس کے کالے چہرے کی یاد آتے ہی وہ بے اختیار مسکرانے لگتا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی بہانے امیر علی کے مکان کی طرف جائے۔ شاید وہ نظر آجائے گی۔ شاید بات کچھ آگے بڑھے۔

لیکن وہ بار بار بہاریوں کے گھروں میں جا کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بنگالیوں کا اعتماد حاصل تھا۔ دکان کے پیچھے اپنا دو کمروں کا ایک مکان تھا جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ بنگالی دوستوں کی محفل جمتی تھی۔ اس کے رشتے دار سید پور میں تھے جن سے دور کی صاحب سلامت تھی۔ بچپن میں پہلے اس کی والدہ کا پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ پندرہ برس کی عمر تک اس نے رشتے داروں کے رحم و کرم پر زندگی گزاری ——— ایک ایک وقت فاقے کر کے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں تھا تو اس کی چچی نے اس پر چوری کا الزام لگایا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر کھلنا آگیا۔ کھلنا میں اس نے ایک بنگالی مستری کے ہاں ملازمت کی۔ اس سے کام بھی سیکھتا رہا اور روزی بھی حاصل کرتا رہا۔ تعلیم بھی جاری رکھی۔ اس کی مسلسل محنت اور مستقل مزاجی نے اور تعلیمی صلاحیتوں نے آج اسے اس مقام پر پہنچایا تھا۔ آج وہ کسی کا محتاج نہیں تھا۔ اپنی دکان تھی، اچھا کماتا تھا، اچھا کھاتا اور پہنتا تھا۔

پھر اردو بولنے والا کوئی رشتے دار اس کے ہاں نہیں آتا تھا۔ اس کے دوستوں میں بنگالیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے پاس بنگالی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کا سرٹیفکیٹ موجود تھا اس لیے سب اسے بنگالی سمجھتے تھے۔

ایسی صورت میں وہ ہر وقت بہاریوں سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی اس بہانے سے ان کے گھروں کی طرف چلا جاتا تھا کہ شاید وہ کوئی سامان سستا بیچ رہے ہوں تو ان سے خرید کر لے آئے گا۔ کئی بہاری اس کی دکان میں سامان خریدنے یا بیچنے کے بہانے آتے تھے۔ وہ انہیں بتاتا رہتا تھا کہ مکتی باہنی کے غنڈے کہاں ہیں اور کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس طرح بیرونی ممالک سے لوگ یہاں آنے والے ہیں اور اس معاملے میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ بہاریوں کے لیڈر رحمان محمد نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے ان کی بستی میں آئے اور ان کے بڑے بوڑھوں کو سمجھائے ورنہ کوئی اپنا گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں رہنے کے لیے نہیں جائے گا۔

یہی سمجھانے کے لیے وہ ایک گھر سے دوسرے گھر گیا۔ پھر امیر علی کے گھر پہنچ کر اپنے گھر کا بھی نہ رہا۔ اپنے گھر میں بھی وہی وہ نظر آتی تھی۔ عجیب بات تھی دو برس پہلے جب وہ دکان کے سامنے سے اسکول جایا کرتی تھی تو اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ایک عام سی اسکول میں پڑھنے والی لڑکی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے اسکول چھوڑ دیا۔ شاید اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ تب ہی وہ دو سال سے نظر نہیں آتی تھی اور اب اچانک نظر آئی تو بالکل بدل چکی تھی۔ اتنی بدل چکی تھی کہ اب بھی بدل رہی تھی۔

چند دن بعد بہت سے بہاری اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنا تمام سامان سمیٹ کر اسکول کے سامنے والے میدان میں جمع ہو گئے تھے۔ ایسے لوگ جو خود مکان مالک تھے یا زیادہ دولت مند تھے وہ اپنی دولت اور جائیداد کو چھوڑ کر کیمپ میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ امیر علی،

ماہرِ نفسیات اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی روزی کمانے کے لیے دوسرے لوگوں کا دماغ استعمال کرتا ہے۔

* * *

دریافت کیا ایک دریافت کرنے والے نے کسی ماہر نفسیات سے "میں ایسی لڑکی کو اس کے گھر سے بھگانا چاہتا ہوں جو چھٹی منزل پر رہتی ہے لیکن میرے پاس اتنی طویل سیڑھی نہیں ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

جواب دیا ماہر نفسیات نے "کسی دوسری کو جو پہلی منزل پر رہتی ہو، بھگانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

* * *

زیادہ دولت مند تو نہیں تھے لیکن خوش حال تھے۔ [illegible] [illegible] رہے تھے۔

[illegible] سامان کیمپ میں [illegible] تھا۔ [illegible] والا آیا تھا جو اسے [illegible] دیکھنا چاہتا تھا۔ [illegible] لایا گیا تھا [illegible]

[illegible]

"ہاں، شادی ہو رہی ہے۔ مگر کیا وقت آ گیا ہے [illegible] رہا ہے۔"

[illegible] آخر اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا [illegible]

[illegible] ماں باپ کے [illegible] کسی طرح [illegible] ہو جائے تو [illegible] میں آتی ہے۔ اگر بیاہ دی جائے تو اس کا [illegible] اس کا شوہر ہو جاتا ہے۔ وہی اس کی حفاظت کرتا ہے۔ حفاظت کرنے میں ناکام ہے تو اپنی بیوی کی [illegible] کا الزام نہیں دے سکتا۔"

امیر علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "ٹھیک کہتی ہو۔ ماں باپ کے گھر میں لڑکی پر الزام نہیں آنا چاہیے۔ الزام لگنے سے پہلے ہی اسے اٹھا دینا چاہیے۔"

"[illegible] بہت اچھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہاں اچھا ہے [illegible]"

[illegible] آج کل میں تو اپنی بیٹی [illegible]

[illegible] سے نکال رہے ہیں۔"

[illegible] کے تالے وہ بھاری ہے۔"

[illegible]

"[illegible] تمہیں یہاں کیا ملے گا؟"

[illegible] سے محبت کرتا ہوں۔"

[illegible]

"سمجھ میں نہیں آتا ہم کیا کریں [illegible] ختم ہو گیا ہے۔ کوئی مشورہ دینے والا نہیں ہے۔"

"جبھی مشورہ کیا لینا ہے سیدھی سی بات ہے۔ اس کیمپ میں لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ہماری لڑکی

لاکھوں میں ایک ہے۔ وہی جو، شادی کے لیے راضی ہو جائے گا اور تمہارے ساتھ پاکستان چلے گا۔"

"یہاں کیمپ میں روزی اچھی کمانے والا لڑکا نہیں ہے۔"

"یہاں کم کماتا ہو لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد وہ ملازمت یا کاروبار کر سکتا ہے۔"

"پہلے لڑکے کا گھر، کاروبار، آمدنی دیکھی جاتی ہے اور یہ سب کچھ خسرو کے پاس ہے۔"

"تم آخر خسرو کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ کیا بیٹی کو یہاں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟"

نین تارا اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے سن رہی تھی اور مایوس ہو رہی تھی۔ خسرو سے یہی اختلاف تھا۔ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا اور وہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس طرح دریا کے دو کنارے بن کر وہ مل نہیں سکتے تھے۔

امیر علی نے فیصلہ کر لیا۔ نین تارا کی شادی موسیٰ بھائی کے بیٹے سے ہوگی۔ دوسرے دن صبح نکاح کا وقت مقرر کیا گیا۔ ماں باپ نے بیٹی کی رضامندی نہیں پوچھی۔ ان کے ہاں بیٹیوں سے پوچھنے کا دستور نہیں تھا۔ لڑکیوں کی زندگی میں عزت چار دیواری سے آتی ہے اس لیے وہ چپ رہتی ہیں۔ زبان سے کچھ کہنے کی جرات نہیں کرتیں۔ جرات ہوتی ہے تو شرم آڑے آتی ہے۔

اس رات نین تارا کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ وہ دوسری صبح سہاگن بننے والی تھی۔ تمام رات بستر پر پڑی رہی۔ ماں نے کہا: "کیوں جاگ رہی ہو۔ سو جاؤ۔"

وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ کلثوم نے کہا: "نین جانتی ہوں تمہیں [illegible] ہوگا۔ مہندی کی رسم ادا ہو رہی ہے۔ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے ہیں۔ میں تمہارے لیے دلہن کا جوڑا تیار کر رہی ہوں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ہم تمہاری شادی کی تقریب خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔"

دوسرا دن بیت گیا۔ رات کے گیارہ بجے موسیٰ بھائی نے سامنے آکر اطلاع دی۔ امیر علی نے کہا: "[illegible] ہماری بیٹی تو آپ کی ہو چکی ہے۔"

موسیٰ بھائی نے کہا: "[illegible] میرا اکبر شام کو گھر سے نکلا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔"

واقعی پریشانی کی بات تھی۔ اسے تلاش کرنے کے لیے کوئی کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی دن کے وقت بھی تنہا بازار یا جوڑا گیٹ وغیرہ کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کہیں جانا ہوتا تو چار چار، چھ چھ کی ٹولیوں میں جاتے تھے۔ موسیٰ بھائی نے کہا: "میں جان کی پروا کیے بغیر اسے تلاش کرنے جا سکتا ہوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہاں تلاش کروں، کس سے پوچھوں کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟ میرا دل بڑا گھبرا رہا ہے۔ اس کی ماں نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔"

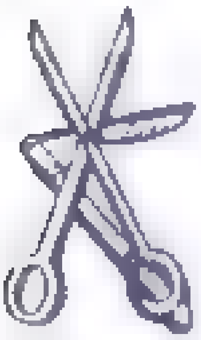

حجام کی دکان میں ایک شخص داخل ہوا اور کرسی پہ بیٹھ کر شیو بنانے کے لیے کہا۔

حجام کے نوعمر نائب نے حجام سے درخواست کی: "ازراہ کرم مجھے ان صاحب کا شیو بنانے کی اجازت دے دیجیے۔ میری کچھ پریکٹس ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے جاؤ شیو بناؤ۔" حجام نے اپنے نوعمر نائب سے کہا، "لیکن ذرا ہوشیاری سے شیو بنانا۔ کہیں اپنے ہاتھ کو زخمی نہ کر بیٹھنا۔"

نین تارا چادر میں لپٹی ہوئی بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی: "خدایا! کسی کی گود نہ اجڑے۔ مجھے اکبر سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ زندہ سلامت واپس آجائے۔ بس ایک ہی دعا ہے کہ یہ شادی ٹل جائے۔"

صبح ہو گئی۔ اکبر واپس نہیں آیا۔ شادی کا وقت بھی گزر گیا۔ دوپہر کو پتہ چلا، اس کی لاش جوڑیا گھاٹ کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے لاش شناخت کی تھی۔ کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔ لاش کو دیکھتے ہی کہرام مچ گیا۔ شادی کے گھر میں ماتم شروع ہو گیا۔ اس کی ماں نے سینہ پیٹ پیٹ کر بین کرتے ہوئے کہا: "میں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ [illegible] منحوس تھی۔ [illegible] میرے بیٹے کی جان لے لی۔"

[illegible]

"ٹھیک [illegible]

سمجھو۔ وہ خسرو سے جلتی ہوئی ہے۔ اس نے رقابت کے مارے مکتی باہنی کے کسی غنڈے سے قتل کرا دیا ہے۔"

"دیکھو بہن! تمہیں جوان بیٹے کا صدمہ ہے۔ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے لیکن میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں کہ غصے میں میری بیٹی کو بدنام نہ کرو۔"

ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ تیر کمان سے نکلا ہوا اور بات زبان سے نکلی ہوئی واپس نہیں آتی۔ یہ بات سارے کیمپ میں پھیلنے لگی۔ یوں تو کیمپ کے پہلے ہی دن سے لوگوں نے خسرو کو امیر علی کے خیمے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتا رہتا تھا۔ کلثوم نے پہلے کبھی کسی عورت سے کہا تھا کہ لڑکا اچھا ہے۔ پاکستان جانے کے لیے راضی ہوگا تو اسے داماد بنائیں گے۔ یہ بات اس عورت سے دوسری عورتوں میں پھیل گئی تھی پھر سب نے دیکھا تھا کہ خسرو سے طے ہونے والا رشتہ اکبر سے طے ہوگیا تھا اور اب اکبر قتل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ پہلے بھی کتنے ہی بہاری نوجوانوں کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن بات نین تارا کے حوالے سے ہو رہی تھی اس لیے اسے ایک عاشق کا انتقام سمجھا جا رہا تھا۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زبانِ خلق نقارۂ خدا ہو۔ خلق کے اندیشے اور اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں لیکن ان کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی حمایت میں بولنے کے لیے خسرو موجود نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں سے کیمپ میں نہیں آ رہا تھا اس لیے اس کے خلاف رائے عامہ مضبوط ہو رہی تھی۔

نین تارا پریشان ہو کر کبھی خیمے میں بیٹھی رہتی، کبھی خیمے کے باہر آ کر دور دور تک دیکھتی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ خسرو ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی باتوں سے، حرکتوں سے اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ اس نے چاہت کے اظہار کے لیے شادی پر رضامندی بھی ظاہر کی۔ یہ معاملہ اس بات پر کھٹائی میں پڑ گیا کہ وہ یہیں رہنا چاہتا تھا۔ اب وہ ایسا دیوانہ تو نہیں تھا کہ رشتہ نہ ملنے پر انتقامی کارروائیوں پر اتر آتا اور کسی ایسے شخص کو قتل کر دیتا جس سے اس کی دشمنی نہیں تھی۔

ادھر خسرو خالص پور چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے کھلنا چلا گیا تھا۔ خالص پور میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔ بار بار کیمپ کی طرف دھیان جاتا تھا۔ دل ادھر جانے کو مچلتا تھا۔ وہ کھلنا سے جیسور چلا گیا۔ وہاں بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار پتہ چل رہا تھا، دل کی لگی کیا ہوتی ہے۔ آدمی دور جا کر نئی بستیاں بسا سکتا ہے مگر دل کی بستی، دل والی سے ہی آباد ہو سکتی ہے۔

ایک بنگالی دوست نے آ کر بتایا: "نین تارا کی شادی جس لڑکے سے ہونے والی تھی اسے مکتی باہنی کے جوانوں نے گولی مار دی ہے۔"

جسے گولی ماری گئی تھی اسے خسرو نہیں جانتا تھا لیکن ذکر محبوب کا تھا اس لیے وہ نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگی۔ اس کے دوست نے پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو۔ واپس چلو۔ وہ تمہارے نصیب میں لکھی گئی ہے۔"

"میں اس سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اس کا خاندان دو ملکوں میں تقسیم ہو جائے۔"

"ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ کیا دوسرے لوگ شادی کرنے کے بعد اپنی بیویوں کو دوسرے ملک نہیں لے جاتے ہیں۔ وہاں اپنے ساتھ رکھ کر ملازمت نہیں کرتے ہیں؟ کیا لڑکیاں ماں باپ سے دور ہزاروں میل کے فاصلے پر نہیں رہتی ہیں؟"

"ایسا ہوتا ہے لیکن بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان نفرت کی خلیج ہے۔ یہ خلیج کب پٹے گی۔۔۔ کب آنے جانے کی سہولتیں ہوں گی، یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اگر وہ میری شریکِ حیات بن کر ادھر رہے گی تو اس کا دل ادھر لگا رہے گا اور میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا دل صرف میری طرف لگا رہے۔"

"تم اسے بہت چاہتے ہو لیکن یہ بھول رہے ہو کہ مکتی باہنی والے ان میں سے کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری نین تارا کو بھی نقصان پہنچائیں۔ تمہیں وہاں رہنا چاہیے۔"

دوست کے سمجھانے پر وہ خالص پور واپس آیا۔ جب وہ جیٹ مل ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب پہنچا تو اس کے محلے کے ایک بنگالی نے اسے دیکھتے ہی کہا: "خسرو میاں! کدھر کو چلے گئے تھے ہو خسرو میاں! تم کہاں تھے؟ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمہاری دکان لوٹ لی ہے۔ تمہارے گھر پر قبضہ جما لیا ہے۔"

خسرو یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ایسا اب تک نہیں ہوا تھا۔ کسی مکتی باہنی نے کسی بنگالی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ خسرو نے اپنے محلے کے اس بزرگ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"واہ! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا مگر خالص پور میں دور دور تک یہ خبر پھیل گئی ہے کہ تم بنگالی نہیں بہاری ہو۔"

اس نے چونک کر پوچھا: "یہ خبر کس نے اڑائی ہے؟"

"تمہارے دور رشتے دار سید پور سے تمہیں تلاش کرتے آئے ہیں۔ وہ مکتی باہنی والوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے ذریعے انہیں پتہ چلا کہ تمہارا تعلق سید پور کے ایک بہاری خاندان سے ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے اپنی دکان کی طرف دوڑ لگائی۔ راستے میں اور بھی شناسا ملے۔ محلے کی دو چار عورتوں نے اسے دیکھا تو کسی نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ کسی نے دور ہی سے آواز دی: "خسرو میاں! اے کی سنتر ہی تی کی بہاری ہو (خسرو میاں! یہ ہم کیا سن رہے ہیں کیا تم بہاری ہو؟)"

اس نے کسی کی باتوں کا جواب نہیں دیا۔ وہ دکان کے راستے سے اپنے گھر کے اندر جانے لگا تو مکتی باہنی کے دو جوانوں نے اسے پکڑ لیا۔ جب پتہ چلا کہ وہی ضمیر الدین خسرو ہے تو وہ اسے کھینچتے ہوئے مکان کے اندر لے گئے۔ وہاں چار مکتی باہنی کے جوان تھے۔ باہر آنگن میں اس کے ایک بوڑھے چچا اپنے جوان بیٹے کے ساتھ اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی اچھی خاصی پٹائی کی گئی ہے۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم پر کئی جگہ زخم کے نشانات تھے۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ چچا نے اسے دیکھتے ہی کہا: "بیٹا! دیکھو ہماری کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔ خدا کے لیے بچاؤ۔ یہ تمہاری بات مان لیں گے۔ تم تو یہاں بنگالی بنے ہوئے ہو۔"

خسرو نے غصے سے کہا: "چچا جان! آپ ذرا اپنے الفاظ پر غور کریں۔ آپ کی باتیں انہیں گمراہ کر رہی ہیں۔ بنگالی بنے ہونے کا تو مطلب یہی ہوا کہ میں بنگالی نہیں صرف بہاری ہوں۔ بےشک میں پیدائشی طور پر پہلے بہاری، پھر پاکستانی اس کے بعد بنگالی ہوں۔ میں نے بنگالی زبان کو، بنگالی تہذیب کو اپنایا ہے اور بنگالی سوسائٹی میں دوست بن کر رہتا آرہا ہوں۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مکتی باہنی کے ایک جوان نے رائفل کا ایک کندا اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا پھر زمین پر گر پڑا۔ اس نے کہا: "بس ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم پیدائشی طور پر بہاری ہو۔ تم نے خود اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔"

خسرو کے دانت جیسے ہل رہے تھے۔ ایسی سخت ضرب لگائی گئی تھی کہ منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے پھر بھی ہکلاتے ہوئے کہا: "بہاری ہونا کوئی جرم نہیں ہے لیکن بنگالی بننا دوستی کی، محبت کی علامت ہے۔"

وہ سب فوجی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ایک نے جوتے کی نوک اس کے سینے پر مارتے ہوئے کہا: "تم ہمیں بکا (بے وقوف) بناتے رہے ہو۔ تم بنگالیوں کے دوست نہیں بلکہ بہاریوں کے لیے جاسوس بن کر آتے ہو۔ یہی تو ہم سمجھ نہیں پا سکے تھے کہ آخر ہم لوگوں کا پروگرام بہاریوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کیسے ان لوگوں نے ایک ایک کرکے اپنے گھر چھوڑ دیے ہیں اور کیمپ میں جا کر پاکستانی جھنڈا لہرا دیا ہے۔ اب غیر ملکی مبصرین یہاں آئیں گے تو وہ یہی تاثر لیں گے کہ بنگلہ دیش کی زمین پر آج بھی پاکستان سے محبت کرنے والے اور اس کا پرچم لہرانے والے موجود ہیں۔"

پھر اسے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ہر طرف سے لاتیں اور جوتے پڑنے لگے۔ کوئی گھونسے مار رہا تھا۔ کوئی بندوق کے کندے سے اسے ضربیں لگا رہا تھا۔ اگر اسے مہلت ملتی تب بھی لوگ اس کا یقین نہیں کرتے کیونکہ اس کے دو بہاری رشتے دار ٹھوس ثبوت کے طور پر یہاں آ پہنچے تھے۔ پھر بھی اس نے خاموشی سے مار کھاتے رہنا گوارا نہیں کیا۔ مارنے والوں کے حملوں کو کبھی روکتا رہا، کبھی جوابی حملے کرتے ہوئے کہتا رہا: "میں کسی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میں یہیں پیدا ہوا۔ یہیں میں نے بنگالی زبان سیکھی، بنگالی تہذیب کو اپنایا۔ تم جیسے غنڈوں سے ڈر کر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

وہ جواب دیتا جا رہا تھا اور سوال کے طور پر وہ حملے کرتے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تھک ہار کر گر پڑا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کے مقابلے میں چھ سات دشمن تھے۔ وہ مار کھاتے کھاتے بے سدھ ہو گیا تھا۔ دماغ کام کرنے سے انکار کرنے لگا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ کسی وقت ایک شخص نے آکر کہا: "خسرو میاں تو بنگالی ہے لیکن آج کل کسی بہاری لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس لڑکی کی وجہ سے وہ بہاریوں کی حمایت کر رہا ہے اور ان کو یہاں کی خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔"

ایک غنڈے نے پوچھا: "کون ہے وہ لڑکی؟"

دوسرے نے پوچھا: "کہاں رہتی ہے؟"

تیسرے نے پوچھا: "کیا نام ہے اس کا؟"

ہنسنے والے شخص نے جواب دیا: "مین تارا۔"

مین تارا کا نام سنتے ہی خسرو کے اعصاب سست پڑ گئے۔ اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بے ہوش ہونے لگا۔ پتہ نہیں وہ کب تک بے ہوش رہا۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ دیکھا کہ دو تین باغی سپاہی ٹھوکر اس کے منہ پر مار رہے تھے۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک نے پوچھا: "کیا مین تارا بنگالی جانتی ہے؟"

اس نے سر جھکا کر سوچا۔ [illegible] اسے کیا معلوم تھا، مین تارا بنگالی جانتی ہے یا نہیں جانتی ہے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ اپنی مین تارا کو چاہتا ہے۔ وہ اسے دل سے اور دل کی آنکھ سے اور دل کسی کی چاہتا ہے، کسی کا مذہب کسی کا عقیدہ اور کسی کے نظریات نہیں دیکھتا۔

وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ [illegible] کراہتے ہوئے بولا: "مجھے نہیں معلوم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بنگالی زبان جانتی ہے یا نہیں۔"

ایک نے [illegible] ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "اسے [illegible]"

"محبت [illegible] سے ایک ہوتی ہے۔ [illegible] جھوٹ بول کر اسے نہیں بلاؤں گا۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے آگے بڑھ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "یہ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ وہ یہاں آئے گی تو تمہاری شادی اس سے کرا دی جائے گی۔"

"میں خوب سمجھتا ہوں۔ وہ درندوں کی ہوس کا نشانہ بن جائے گی۔"

اس کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی۔ وہ پھر زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ تکلیف سے کراہتا رہا، درد سے تڑپتا رہا۔ ایک نے کہا: "ایک بہاری لڑکی سے اتنی محبت۔ [illegible] مار کھا رہے ہو [illegible] نہیں چاہتے ہو۔"

دوسرے نے پوچھا: "کیا تم نہیں جانتے [illegible] بنگالی ہو [illegible] کتنے مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ اگر [illegible] بنگالی ہو، وہ بنگالی [illegible]"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا: "میں محبت [illegible] وہ نفرت نہیں [illegible] جانتی ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی کے آخری لمحے پہلے اسے مین تارا کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں اور وہ بے ہوشی یا خواب کے عالم میں اس کے پاس پہنچ رہا تھا۔

مین تارا بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بالکل اپنے سامنے ہو۔ دوپہر کے وقت اپنے ابا جان کے ساتھ ٹہلتے راشن لینے کے لیے جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کے دفتر میں گئی۔ وہ دفتر اسکول کے ایک کمرے میں تھا۔ اس اسکول میں بنگالی، بہاری، مکتی باہنی اور ہندوستانی فوجی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ امیر علی اپنی بیٹی کو ادھر نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن ان دنوں مجبور تھے۔ حالات نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ راشن اٹھا کر لانا ان کے بڑھاپے کے بس میں نہیں تھا اس لیے وہ جوان بیٹی کو ساتھ لے گئے۔

وہاں کیمپ کی اور بھی جوان عورتیں راشن اور دوائیں لینے کے لیے وہاں جایا کرتی تھیں لیکن کچھ اجنبیوں نے مین تارا کے کانوں میں یہ سحر پھونکنا شروع کیا کہ خسرو اسے یاد کر رہا ہے۔ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیمپ میں یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے اپنے پاس بلا رہا ہے۔

مین تارا نے جانے سے انکار کر دیا حالانکہ دل ادھر کھنچا جا رہا تھا مگر وہ مشرقی تہذیب کی پروردہ تھی۔ اپنے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا کر اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مکتی باہنی کے ایک جوان نے اس انکار کو اپنے تماشے سے شکایا پھر اچانک ہی مین تارا کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چیخنے لگی: "بچاؤ! مجھے بچاؤ...!"

دشمن نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ایک ذرا جھٹک کر اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ اس کے ساتھی اس کے آگے چلنے لگے۔ چند بہاری جوانوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ وہ سب مل کر چیخنے چلانے لگے۔ اتنی دیر میں ریڈ کراس کیمپ کے کئی ہی لوگ دوڑے چلے آئے۔ اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ عورتیں بھی زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ [illegible] رو رہی تھیں۔ اسی وقت سامنے والی سڑک پر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ لڑکی چیخ رہی تھی اور دشمن اسے گاڑی میں لاد کر لے جا رہے تھے۔ [illegible] فائرنگ شروع ہو گئی۔ جو جدھر تھا ادھر منہ اٹھا کر بھاگنے لگا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی

گئے تھے۔ جب فوجی آتے تھے تو کچھ ہی غنڈے چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہی ہنگامہ سرد پڑ گیا۔

امیر علی زمین پر اوندھے منہ پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ ایک غنڈے نے ان کے منہ پر زبردست گھونسا رسید کیا تھا وہ چکرا کر گر پڑے تھے۔ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے گئے تھے مگر بیٹی تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کا سر زمین پر جھکا ہوا تھا۔ آنسو بھرے چہرے سے بے بسی جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے: "میں کیسے منہ اٹھاؤں، دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ اب کیمپ والے آئیں گے۔ مجھ سے زبانی ہمدردی کریں گے لیکن آپس میں یہی کھسر پھسر کریں گے کہ وہ درندے جوان لڑکی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ یقیناً اس کی عزت کی دھجیاں اڑا رہے ہوں گے۔"

وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ شرم سے اندر زمین میں گڑنے لگے۔ عورتوں اور مردوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں: "ارے لے گئے۔ وہ بدمعاش رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے۔"

کسی عورت نے کہا: "اللہ کرے ان کی ماؤں بہنوں کو بھی کوئی اٹھا کر لے جائے۔ کوئی ان کے بھی جوان بیٹوں کو الٹا لٹکا کر گولی مارے۔ ہائے، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کوئی ہماری مدد کرنے والا، کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔"

ہندوستانی فوجی ان فریاد کرنے والی عورتوں اور مردوں کو چپ کرا رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ وہ اغوا کی جانے والی لڑکی کو واپس لے آئیں گے۔ امیر علی زمین پر سے اٹھ بیٹھے تھے۔ تکلیف کم ہو گئی تھی لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی یہی چاہتا تھا کہ وہیں پڑے پڑے موت آ جائے۔

اسی وقت ان کے ہاتھ پر ایک نرم ملائم سا ہاتھ آیا۔ پھر بیٹی کی آواز سنائی دی: "ابا جان!"

وہ ایک دم سے چونک گئے۔ سر اٹھا کر دیکھا تو مین تارا ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ ان کے آس پاس چند عورتیں اور بوڑھے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک عورت نے کہا: "یہ جیسے ہی پرے جا رہی تھی دیکھا کہ بدمعاش مین تارا کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں تو اس نے مرچوں کا پاؤڈر ان کی آنکھوں میں جھونک دیا۔"

ایک امریکی بیوی نے اپنے [illegible] شوہر سے: "آج تمہیں جھوٹے برتن دھونے کی ضرورت نہیں۔ آج تو تمہاری سالگرہ ہے کیونکہ کل کے ساتھ دھو لیں۔"

ایک بوڑھے نے کہا: "تم نے مین تارا کو بچا لیا مگر دوسرے غنڈے رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ افسوس ہنگامے سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔"

ایک اور شخص نے کہا: "کس کی آئی تھی اور کس پر بیت گئی۔ وہ سب مین تارا کو اٹھانے آئے تھے اور بے چاری رشیدہ کو اٹھا کر لے گئے۔"

ایک اور شخص نے کہا: "یہ مصیبتیں صرف اس لڑکی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہیں ورنہ غنڈے بدمعاشوں کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کیمپ میں آ کر بدمعاشی کرتے۔"

یہ باتیں تمام کیمپ میں پھیلنے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا: خسرو نے مین تارا کو اٹھوانے کے لیے کتنے ہی لوگوں کو بھیجا تھا۔

کہیں سے آواز آئی تھی: "جب تک یہ لڑکی کیمپ میں رہے گی، دوسری لڑکیوں کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ بدمعاش تو آخر بدمعاش ہوتے ہیں۔ ایک کو نہ لے جا سکے تو دوسری کو لے جاتے رہیں گے۔"

بات بڑھتی رہی۔ کیمپ میں ایک پنچایت کمیٹی بنائی گئی۔ اس پنچایت نے فیصلہ دیا کہ خسرو سے بات کی جائے، اسے سمجھایا جائے اور سمجھوتے کی کوئی راہ نکالی جائے۔ یا تو خسرو مین تارا کو حاصل کرنے کی ضد سے باز آ جائے یا پھر مین تارا کو اس سے بیاہ کر کیمپ سے رخصت کر دیا جائے۔ ریڈ کراس سوسائٹی کے فادر [illegible] سے مدد لی جائے۔ وہ اس سلسلے میں خسرو سے رابطہ قائم کرے گا اور اسے سمجھوتے پر آمادہ کرے گا۔

کلثوم نے ناگواری سے کہا: "میں اپنی بیٹی کبھی اس غنڈے کو نہیں دوں گی۔ جب وہ شادی سے پہلے میری بیٹی کو اغوا کروا رہا ہے تو شادی کے بعد کیا کرے گا؟" سب جانتے تھے کہ یہاں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ "نہیں کلثوم [illegible] جشن ہونا بھی

پہنچا دیا جاتا تھا جو بہاری کیمپوں میں بنگال زبان روانی سے بولنا جانتے تھے وہ بنگالی بن کر ایک شہر سے دوسرے شہر آتے جاتے تھے۔ مختلف کیمپوں کے بہاریوں سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ کلکتہ تک سفر کرتے تھے اور آنکھوں دیکھا حال قسمیں کھا کر بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ہندوستان کے کتنے ہی بازاروں میں بہاری لڑکیوں کو دیکھا ہے۔

یہ سن سن کر جوان لڑکیوں کے والدین کانپ کانپ جاتے تھے۔ اس رات امیر علی نے روتے ہوئے نین تارا کو دیکھا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے کرب سے پوچھا: "بیٹی! کیا تم کسی طرح مر نہیں سکتیں؟"

کلثوم نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر جوان بیٹی کو دیکھا تو نظریں جھک گئیں۔ وہ بھی کئی دنوں سے، کئی راتوں سے یہی دعائیں مانگ رہی تھی کہ بیٹیوں سے کوئی رابطہ قائم ہو اور نین تارا کراچی پہنچ جائے یا پھر کسی طرح مر جائے۔

ماں کی زبان پر بیٹی کے لیے دعا بھی تھی اور بددعا بھی۔ وہ روتے ہوئے بولی: "جلنے! ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ وقت آئے گا۔ تیری ڈولی اٹھانے کی آرزو تھی۔ تیری میت ہی اٹھانے کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ وقت آنے سے پہلے ہم مر کیوں نہ گئے۔ مریں بھی کیسے؟ جب تک تو ٹھکانے نہیں لگے گی، ہمیں مر کے بھی چین نہیں آئے گا۔"

نین تارا یوں ندامت سے سر جھکائے ہوئے تھی، جیسے واقعی کسی سے گناہ کا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ خیمے کے باہر بارش ہو رہی تھی۔ اندھیرے کیمپ میں دور دور تک لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنا سامان سمیٹ کر خیموں میں لے جا رہے تھے۔ کہیں کہیں لالٹین کی روشنی تھی۔ جن کے پاس خیمے نہیں تھے وہ بانسوں کی کھپچیوں سے بنائی ہوئی چھت کے نیچے بارش سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے اس لیے اسکول کے برآمدے میں پناہ لینے جا رہے تھے۔ ایسے وقت دور کہیں سے رات کے سناٹے میں دو بار فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

وہاں سبھی لوگ فائرنگ کی آواز سنتے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ کان لگا کر سنتے تھے اور سمت کا تعین کر دیتے تھے کہ فلاں سمت سے فائرنگ ہوئی ہے۔ چونکہ دو بار فائرنگ کی آواز دور سے آئی تھی اس لیے سب مطمئن تھے۔ خوف و دہشت عداوت، نفرت، دکھ اور بیماری کے ماحول میں رہنے والے رفتہ رفتہ خطرے کی گھنٹی سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے ہیں کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ وقت آنے پر بچاؤ کی اپنی سی کوششیں کر لی جائیں گی۔

آدھی رات کو اچانک شور اٹھا: "رضو آگئی، رضو آگئی۔"

امیر علی اس وقت اونگھ رہے تھے۔ سونا ہی چاہتے تھے کہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ کان لگا کر آوازوں کو سننے لگے۔ بارش کے شور میں اچھی طرح سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کلثوم نے کہا: "ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ یہ لوگ کیوں چلا رہے ہیں؟"

بڑے میاں نے بستر سے اٹھ کر کھڑاؤں پہنے، سر پر برساتی رکھی۔ پھر لالٹین کی لو اونچی کر کے باہر آ گئے۔ آس پاس کے خیموں سے بھی لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر نکل آئے تھے۔ امیر علی نے پوچھا: "کیا ہوا؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"پتہ نہیں، آؤ دیکھتے ہیں۔"

وہ اپنی اپنی برساتی اور چھتریاں سنبھال کر ادھر جانے لگے۔ بڑی دھواں دھار بارش تھی۔ لالٹین کی روشنی میں دھواں دھواں سی لگ رہی تھی۔ آگے کا راستہ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مختلف خیموں کے قریب سے گزرتے ہوئے سڑک کے قریب پہنچے۔ وہاں کچھ لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے درمیان حیات مستری کی لڑکی رضو کھڑی ہوئی تھی۔ حیات مستری جماعت اسلامی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اس لیے سترہ دسمبر کی رات کو مکتی باہنی کے جوانوں نے اسے، اس کے جوان بیٹے اور اس کی بیوی کو گولی مار دی۔ پھر رضو کو اٹھا کر لے گئے۔ تب سے وہ لاپتہ تھی۔ کچھ روز تک اس کا چرچا ہوتا رہا۔ پھر سب نے اسے بھلا دیا کیونکہ سب کو اپنا اپنا دکھ بھاری تھا۔ سب اپنی اپنی فکر سے آدھے ہو رہے تھے۔

ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر لالٹین کو اونچی کرتے ہوئے اسے دیکھا، پھر پوچھا: "بیٹی! یہ تم ہو؟ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ کہاں سے آ رہی ہو؟"

وہ گم صم کھڑی خلا میں تک رہی تھی۔ پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ بارش کی تیز دھار کے باوجود اس کی پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر بڑے میاں نے پوچھا: "تم چپ کیوں ہو؟ بولو۔"

وہ بولنے لگی۔ اگر نہ بولتی تو اس کے مردہ ہونے کا گمان ہوتا۔ اس کی آواز جیسے اندھے کنوئیں سے آ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی: "جاؤ ننگا کی سرحد پر ہمارا بازار لگتا ہے۔ سونا گاچی کے دلال آتے ہیں اور لڑکیوں کو چھانٹ کر لے جاتے ہیں۔ مجھے بھی وہاں لے جایا گیا تھا مگر کسی نے مجھے پسند نہیں کیا۔ میرے منہ پر چیچک کے داغ ہیں۔ میں کالی ہوں۔ وہاں دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں ہمیشہ بدصورت سمجھی گئی اسی لیے کسی نے میری قیمت نہیں لگائی۔"

کسی نے پوچھا: "اتنے دنوں تک تم کہاں تھیں؟"

وہ ایک بڑی سی چادر لپیٹے ہوئے کھڑی تھی۔ گردن سے نیچے اس کا جسم چھپا ہوا تھا۔ بارش کے شور میں اس کی کربناک آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی: "میرا کوئی مول نہیں تھا، اس لیے مجھے کبھی کوئی لے جاتا تھا اور کبھی کوئی۔ میں نہیں جانتی کہ کہاں کہاں گئی۔ کہاں کہاں رہتی رہی۔ وہ مجھے مارتے تھے، پھر سہلاتے تھے۔ پھر تھوک کر چلے جاتے تھے۔ تھوک کر چلے جاتے تھے۔ تھوک کر چلے جاتے تھے۔۔۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر خلا میں تک رہی تھی اور ایک ہی فقرے کو بڑبڑا رہی تھی۔ بڑبڑانے کے دوران اس نے اپنے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ اچانک ہی بادل زور سے گرجے۔ بجلی ایک کڑک دار آواز کے ساتھ چمکی۔ پھر بجھ گئی۔ اس کی لمحاتی چمک میں اس کا ناکردہ گناہ چمک اٹھا

سب کی گردنیں جھک گئیں۔ بارش کا پانی اس کے چیچک زدہ چہرے پر پھسل رہا تھا۔ اسے سر سے پاؤں تک بھگو رہا تھا۔ اس نے چادر کو سنبھال کر دوبارہ اپنے جسم کو چھپا لیا۔ پھر اسی طرح خلا میں تکتے ہوئے، پلکیں جھپکائے بغیر آگے بڑھنے لگی۔ لوگ ایک طرف ہٹنے لگے۔ اب اس سے پوچھنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ اب تو اس کے سر پر ہمدردی سے ہاتھ رکھنا تھا مگر کون رکھتا؟

کسی نے آگے بڑھ کر نہیں پوچھا۔ اب تم کیا کرو گی؟ اب تم کہاں جاؤ گی؟

نہ پوچھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سب بے حس، بے غیرت اور سنگ دل تھے۔ وہ سب یقیناً اس پر ترس کھا رہے تھے لیکن ان کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ جن کے خیموں میں جوان لڑکیاں تھیں وہ اس کو وہاں نہیں لے جانا چاہتے تھے اور جن کے ہاں جوان لڑکے تھے وہ بھی اس کو اپنے ہاں نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ ایک خیمے کے سامنے جا کر رکی۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر دوسرے خیمے کے سامنے پہنچی۔ اس کے پاؤں کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ اس کا لباس تر بتر تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپتے ہوئے تیسرے خیمے کے سامنے گئی۔ وہاں سے پھر ایک اور خیمے کے سامنے پہنچی۔ امن اور خوشحالی کے دور میں بھی لوگ ایسی لڑکیوں کو اپنے گھروں میں جگہ نہیں دیتے۔ اس وحشت و جنون کے دور میں سب اپنی اپنی بچی کھچی عزت کو سمیٹنے کی فکر میں مبتلا تھے۔ ایسے میں کون اسے اپنے ہاں بلاتا؟

ایک خیمے سے آواز آئی: "بیٹی! بھیگتی رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ اسکول کے برآمدے میں چلی جاؤ۔"

بادل گرج رہے تھے ۔۔۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ان کے چمکنے سے تاریکی دور نہیں ہو سکتی تھی ۔۔۔ ہمدردی کے ایک بول سے بدنصیبی کا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک اور خیمے سے کسی نے کہا: "[illegible] پیاس بجھانے کے لیے پانی اور اوڑھنے کے لیے کمبل دے دیں گے۔ آج کی رات وہاں گزار لو۔ صبح تمھارا کہیں ٹھکانہ بنا دیا جائے گا۔"

اب تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو شریف محلوں میں جگہ نہیں ملتی، انھیں بدنام محلوں میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ وہ ایسی بدنصیب تھی کہ اسے کسی بازار میں بھی جگہ نہیں ملی تھی۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے: خوشبو نہ ملے تو غلاظت بھی نہ ملے۔ جزا نہ ملے تو سزا بھی نہ ملے۔ آنسو ہوں تو آنسو پونچھنے والا نہ ملے۔ آنکھ ویران ہو تو کوئی رلانے والا نہ ملے۔ اے شہرِ بے خبراں و ناپرساں! تم سے یہ بھی نہ ملے وہ بھی نہ ملے تو پھر تمھاری دنیا میں کیا ملے؟ میں پھر پھر کے تھک گئی۔ چلو پاک سرزمین نہ ملے، دو گز زمین تو ملے۔

وہ بھیگتے بھیگتے، چلتے چلتے تھک گئی۔ ایک قدآور نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب ملک کے بٹنے میں جانے کتنے لوگ اس کا راستہ روکتے رہے تھے۔ وہ اعتراض کرنا بھول چکی تھی۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ خلا میں تکتی رہی۔ بارش میں بھیگتی رہی۔

نوجوان کے ہاتھ اس کے شانوں پر سے رینگتے ہوئے گردن تک پہنچ گئے۔ شاید وہ گلا دبانا چاہتا تھا۔ وہ چپ رہی۔ جان کے دشمن ہوں یا عزت کے، اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

کچھ لوگ ذرا دور رہ کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ [illegible] کے خیموں سے عورتیں [illegible] نوجوان کے ہاتھ اس کی گردن پر سے رینگتے ہوئے دونوں رخساروں پر

اس رات کوئی سو نہ سکا۔ یہاں سے وہاں تک تمام خیمے جاگتے رہے۔ پچھلے پہر بارش کا زور کم ہو گیا۔ پھر بھی کسی کو نیند نہیں آئی۔ آسمان پر سیاہ بادل امڈ امڈ کر دھمکیاں دے رہے تھے کہ ابھی اور برسیں گے۔

وہ سب سہمے ہوئے تھے — حالات بھی دھمکیاں دے رہے تھے۔ رضو پہلی لڑکی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بے شمار لڑکیوں پر قیامتیں گزر چکی تھیں اور رضو آخری لڑکی نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی جانے کتنی لڑکیوں پر یہ قیامتیں گزرنے والی تھیں۔

مین تارا خیمے کے اندر لکڑی کے ایک صندوق پر سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک کھاٹ پر کلثوم اور امیر علی بیٹھے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ اب اسے ہی دیکھنا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے ہی غم کھانا تھا اور اس کی طرف سے خوف زدہ رہنا مقدر بن گیا تھا۔

بڑی دیر بعد مین تارا نے سر اٹھا کر اپنے والدین کو دیکھا پھر کہا: "رات جا رہی ہے۔ شاید تین بج گئے یا چار بج رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے؟"

کلثوم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا: "میں نہیں کھاؤں گی۔ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گی جب تک تو عزت آبرو سے ٹھکانے نہیں لگے گی۔"

"جی، یہ آپ کی ضد ہے۔ آپ کو کھا لینا چاہیے۔ کتنے ہی پیارے آنکھوں کے تارے مر جاتے ہیں۔ ماں کے سوگ میں بھوک نہیں لگتی۔ پھر رفتہ رفتہ لگنے لگتی ہے۔"

"تم مرنے والوں کی بات کر رہی ہو۔ رضو مر گئی ہوتی تو ہم کچھ دن سوگ میں بھوکے رہتے۔ پھر رفتہ رفتہ انھیں بھوک لگنے لگتی۔ لیکن تم زندہ ہو۔ زندوں کا دکھ آنکھوں کے سامنے زندہ رہتا ہے۔ کم نہیں ہونے پاتا۔"

"دکھ کم کرنے کا ایک راستہ ہے۔"

والدین اپنی بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولی: "آپ اس سے سمجھوتہ کر لیں۔ وجاہت اچھا ہے۔ اس نے آج تک مجھ پر کبھی میلی نظر نہیں ڈالی۔"

کلثوم اور امیر علی نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں باتیں کیں۔ پھر امیر علی نے کہا: "مگر وہ تو بنگالی ہے۔"

"نہیں، بہاری ہے۔"

"وہ دوغلا ہے۔ کبھی بہاری بنتا ہے کبھی بنگالی۔"

"ہر قوم کی تہذیب کو گلے لگانے والا، اِس زبان کے بھی اور اُس زبان کے بھی چٹخارے لینے والا انسان دوست ہو سکتا ہے۔"

کلثوم سر جھکا کر سوچنے لگی۔ امیر علی نے کہا: "جب ہم بیٹی پر کسی کا سایہ پڑنے سے پہلے اس کے مرنے کی تمنا کرتے ہیں تو کیوں

گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر کہا: "انسان کو صرف ایک بار مرنا چاہیے اور تم ہزار بار مر چکی ہو۔ اب میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔"

وہ اب تک جذبات سے عاری تھی۔ چلتی پھرتی تھی مگر بے حس لاش کی طرح تھی۔ نوجوان کی بات سن کر پہلی بار اس کے سپاٹ چہرے سے حیرانی ظاہر ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوال کرنے لگیں، جیسے پوچھ رہی ہوں: "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

نوجوان نے کہا: "اگر آج تمھیں سہارا نہ ملا، اگر آج تمھیں کسی نے گلے نہ لگایا تو تم سے پہلے انسانیت مر جائے گی۔"

پھر وہ یکبارگی زور سے چیخ کر بولا: "اے کیمپ والو! سنو، یہ اکیلی لاوارث نہیں ہے۔ آج سے میں اس کے آنچل کا محافظ ہوں۔ آج سے برسوں پہلے بہار کے شہر پٹنہ میں اس کی ماں نے اسے پیدا کیا تھا۔ اس ننھی سی بچی کو دیکھ کر اس کی ماں نے ہر ماں کی طرح اس کے دولہا کا سپنا دیکھا ہوگا۔ میں اس کی ماں کے سپنوں سے آیا ہوں۔ یہ آج بھی وہی ننھی سی معصوم بچی ہے اور معصومیت جسم کے پیمانے سے نہیں، خیالات کی پاکیزگی سے قائم رہتی ہے۔"

اس نے اِدھر سے اُدھر دیکھتے ہوئے کہا: "ماؤں، بہنوں، بیٹیوں والو! گواہ رہنا، میں رضو کو قبول کر رہا ہوں۔ اس کے بچے کو قبول کر رہا ہوں۔ یہ میری ہے۔ اس کا ہونے والا بچہ بھی میرے نام سے منسوب رہے گا۔"

اچانک رضو کی ایک زور کی ہچکی آئی۔ نوجوان نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا: "کیا ہوا؟"

وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ اوپر اوپر سانس لے رہی تھی۔ مارے خوشی کے اس کی سانس اٹک رہی تھی۔ اچانک ملنے والی خوشی گلے میں ہڈی کی طرح اٹک جاتی ہے۔

اس کا چہرہ مسرتوں سے مالا مال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ جیسے مر جانا چاہتی ہو کہ مر سکتی ہو۔ ان چند لمحوں میں اس نے اتنا کچھ پا لیا تھا جسے برسوں کی زندگی میں بھی نہیں پا سکی تھی۔ پھر اس کا کانپتا ہوا جسم یکبارگی ساکت ہو گیا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک کڑک دار آواز کے ساتھ بجلی چمکی، بادل گرجنے لگے۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ خیموں کی طنابیں ٹوٹ رہی تھیں۔ بجلی پھر چمکی پھر چمکی۔ وہ بجلی نہیں تھی۔ وہ [illegible] چہرے کی تصویر کبھی دکھاتی تھی، کبھی چھپاتی تھی۔

اے خدا! تو نے غبارے کی گنجائش سے زیادہ ہوا بھر دی۔ جب نصیب کی اوقات سے زیادہ خوشیاں دے دیں۔ یہ کیسا ظلم کیا۔ دکھ جسے [illegible] سے مارتے رہے، نہ مار سکے۔ تو نے محبت سے ایک پل میں مار ڈالا۔

⁂

د خسرو پر بھروسہ کر لیں؟

کلثوم نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں کہا: میں نہیں جانتی کہ آپ کس پر بھروسہ کریں گے اور کس پر نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب تک ہم اس کا صحیح ٹھکانہ نہیں کریں گے یا پھر اسے موت نہیں آئے گی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"کہہ تو دیا خسرو سے بات ہو جائے گی۔"

"پہلے بات ہو جائے۔ اس وقت تک ایک دانہ بھی میرے لیے حرام ہے۔"

رات گزر گئی۔ دوسری صبح اس نے کھانا بھی نہیں لیا۔ امیر علی نے کہا: جب تک خسرو سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوگا۔ میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

دن کے دس بجے وہ خود زمان سے ملنے کے لیے گئے۔ فادر ایشیائی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ امیر علی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ایک ترجمان نے کہا: وہ کل شام کو خسرو سے ملنے گئے تھے۔ میں خود ان کے ساتھ تھا۔ وہاں آس پاس کے بنگالیوں نے بتایا: مکتی باہنی والے خسرو کے گھر میں آئے تھے۔ انھوں نے اس کے چچا اور چچا کے بیٹے کو گولی مار دی۔ خسرو کو خوب مارنے پیٹنے کے بعد کہیں پکڑ کر لے گئے۔ تب سے وہ لاپتہ ہے۔"

خاص پور کے تقریباً سبھی لوگ نسیم الدین خسرو کو جانتے تھے۔ اگر اسے خاص پور کے کسی گھر میں، کسی دفتر میں یا چھوٹے ہوٹل میں چھپا کر رکھا جاتا تو لوگ اسے ڈھونڈ نکالتے۔ محلے والوں کی درخواست پر پولیس والوں نے بھی بڑی تلاش کی تھی۔ بعد میں یقین سے کہہ دیا: خسرو خاص پور میں نہیں ہے۔ غنڈے اسے یہاں سے کہیں دور لے گئے ہیں۔"

حفاظت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نیا نیا جنم لینے والی بنگلہ دیشی حکومت بے دست و پا تھی۔ بی۔ ڈی۔ آر (بنگلہ دیش رائفلز) کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ ہر جگہ غنڈہ گردی اور فرقہ پرست دنگائیوں کے ہتھکنڈوں پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ پولیس والے بھی بے بس تھے۔ پھر مکتی باہنی نے پاکستان کو دولخت کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ اس لیے کوئی ان کے منہ نہیں لگتا تھا۔

خسرو کو ہوش آیا تو آنکھ کھلنے سے پہلے اسے تکلیف کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ وہ اس قدر کمزور تھا کہ کراہتے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ زمین پر نہیں ہے۔ کہیں ہوا میں جھول رہا ہے۔ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اسے ہوش آیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ گہری تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ نظر آنے لگا تو پہلے ہاتھوں سے ٹٹولا جاتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اپنے آپ کو ٹٹولا۔ اس وقت تک پتہ چل گیا تھا کہ ٹانگیں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ دونوں پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ الٹا لٹک رہا ہے۔

وہ بدحواس سا ہو کر سوچنے لگا کیا کرے۔ اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹانگوں کو پکڑ لیتا پھر کمر کے بل اٹھ کر پاؤں کی رسی تک پہنچ سکتا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس

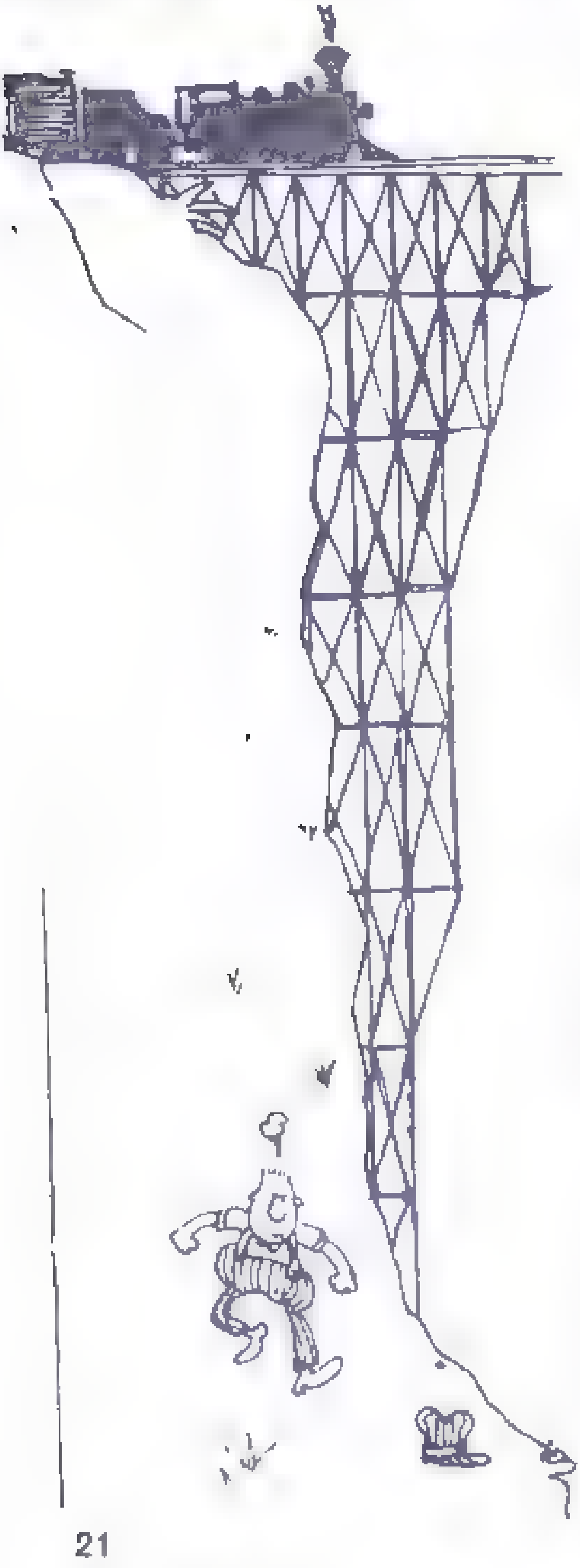

کی سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ وہ سیدھا ہو جائے۔ آدمی اگر شریف اور سیدھا سادہ ہو تو آرام سے زندگی گزار لیتا ہے لیکن جسمانی طور پر سر کے بل الٹا رہ کر نہ تو سکون سے رہ سکتا ہے نہ ہی زندگی گزار سکتا ہے۔

اس کا تمام جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ ظالموں نے بُری طرح پٹائی کی تھی —— جوتوں سے گھونسوں سے ڈنڈوں سے اور رائفل کے کندوں سے خوب مارا تھا۔ وہ مارتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے۔ "بتاؤ دھن کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

وہ مار کھاتا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا "میرے پاس دولت نہیں ہے۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔"

"تم جالس پور میں آٹھ برس سے دکانداری کر رہے ہو، اکیلے رہتے ہو۔ تم نے خوب کمایا ہے اور خوب بچایا ہے۔ یہ سمجھا کہ ہم نے تمہارے چچا کو گولی ماردی ہے تو تمہیں بھی مار کر قصہ تمام کر دیں گے، نہیں۔ تمہیں پائی پائی کا ایک ایک پیسہ ہمارے سامنے لا کر رکھنا ہوگا تب ہی تمہاری جان چھوٹے گی۔"

اور اس کی جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ لوگ اُسے پکڑ کر جالس پور سے دو منڈی کے پار دولت پور لے آئے تھے اور ایک ستارہ جوٹ مل میں لا کر اس کی پٹائی کی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب ہوش میں آنے کے بعد خود کو گہری تاریکی میں الٹا لٹکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اس کے پاس دولت تو نہیں تھی لیکن جو کچھ تھا وہ اس کے لیے دولت سے کچھ کم نہیں تھا۔ نقد، بینک، کرنسی ملا کر روپے ہندوستانی کوئی دس ہزار روپے کے قریب تھے۔ اس کے علاوہ پچیس بھری سونا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اپنی بڑو دیدی (بڑی بہن) کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اگرچہ وہ اس کی اپنی کوئی سگی بہن نہیں تھی۔ تلسی رام مارواڑی کی دھرم پتنی کو اس نے بڑی بہن بنایا تھا۔ تقریباً پانچ برس سے وہ بھائی بہن کے رشتے کو بڑی محبت سے نباہتے آرہے تھے۔ ہندو مسلمان یا کسی بھی ملک کا سرمایہ دار ہو۔ کوئی بیوپار یا کاروباری بھید کسی کو نہیں بتاتا لیکن خسرو اور بڑو دیدی میں اتنی محبت تھی کہ وہ چپکے سے بتا دیا کرتی تھی۔

جب سنگین حالات بگڑنے لگے تو بڑو دیدی نے کہا۔ "تمہیں پتہ ہے۔ یہاں جتنے ہندو مارواڑی ہیں وہ کماتے پاکستان میں ہیں اور دولت ہندوستان میں جمع کرتے ہیں۔ اب تمہارے جیجا جی مجھے اور بچوں کو ہندوستان بھیج رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے، یہاں جنگ چھڑنے والی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

"دیدی۔ آپ کو چھوڑ کر رہنے کا جی تو نہیں چاہتا لیکن مجھے اس بستی میں یہاں کے لوگوں سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم سب سمجھ رہے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے اور حالات کچھ زیادہ بگڑ ہی جائیں گے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ آپ بچوں کے ساتھ جا رہی ہیں —— حالات بہتر ہوئے تو ہم پھر ملیں گے۔"

بڑو دیدی نے کہا "پچیس بھری سونا اور اٹھارہ ہزار روپے میں نے ہندوستان بھیج دیے ہیں۔ تمہارا وہ سب کچھ میرے پاس امانت رہے گا۔ کبھی تم اُدھر آؤ گے تو میں ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گی۔ یہاں اپنے جیجا جی سے جب چاہو اپنی ضرورت کے مطابق رقم لے لینا۔"

خسرو نے کہا "میرے پاس تقریباً دس ہزار روپے ہیں۔ یہ میرے لیے کافی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ حالات بدتر ہوں۔ کبھی یہاں کی زمین میرے لیے تنگ ہوئی تو میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔"

وہ گہری تاریکی میں الٹا لٹکتے ہوئے اپنی بڑو دیدی کو تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اسے پچھلی تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس نے مار کھانے کے دوران کئی بار بھی ان غنڈوں سے کہا تھا "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ تھا وہ تلسی رام مارواڑی کی دھرم پتنی ہندوستان لے گئی ہے۔ یقین نہ ہو تو تلسی رام کو بلا کر پوچھ لو۔"

ایک غنڈے نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا "چالاکی کی کوشش کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم کسی ہندو کے گھر جا کر نہ تو لوٹ مار کر سکتے ہیں نہ ہی بینک سے کسی ذریعے اس سے رقم وصول کر سکتے ہیں۔ تلسی رام کو ہم مار ڈالیں گے تو ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر تلسی رام [illegible] دوستانہ تعلقات ہوئے تو وہ تمہیں [illegible] پڑ جائے گا۔"

اس کے پاس جو دس ہزار روپے تھے ان میں سے اس نے چار ہزار روپے اپنے پڑوسی سراج دین [illegible] کے پاس رکھے تھے تقریباً چھ ہزار روپے گھر میں رکھے تھے جو ملٹری [illegible] کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اب وہ باقی رقم بھی ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ اگر انہیں سب کچھ مل جاتا تو اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ وہ اب تک قتل کر چکے ہوتے۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی امید میں ہی اسے الٹا لٹکا رکھا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چیخ کر آواز دی "[illegible] مجھے کوئی سیدھا کرو۔ یہاں کوئی ہے، ہے کوئی؟"

اس کی آواز تاریکی میں دور تک گونجتی گئی مگر بڑی دیر تک گونجتی رہی۔ باہر سے کوئی جواب نہ آیا لیکن اس کی آواز کے جواب میں کہیں قریب ہی کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے بہت زیادہ سہمے ہوئے انداز میں کہا "میں... میں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے [illegible]

جانے دو:

خسرو چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا: ”تمہاری زبان اور لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ تم بہاری ہو۔“

”نہیں، میں یوپی کا رہنے والا ہوں۔“

”تم یوپی کے ہو یا سی پی کے، بہار کے ہو یا مدراس کے، پنجاب کے ہو یا گجرات کے۔ جو بھی مشرقی پاکستان میں آکر آباد ہو گیا یہاں کے بنگالی اسے بہاری کہنے لگے۔ اس لحاظ سے تم بہاری ہو۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس کے کراہنے۔۔۔ اور گھگھیانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہتے ہوئے ڈر رہا ہو۔ خسرو نے کہا: ”میں دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری طرح مظلوم ہوں۔ جب میں یہاں لایا گیا تو جوٹ مل کے اس باتھ روم میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہاں مجھ پر ظلم کیا گیا۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ شاید تمہیں میرے بعد لایا گیا ہے۔“

تاریکی سے آواز سنائی دی: ”یہ لوگ مجھے کھلنا سے پکڑ لائے ہیں۔ جب میں یہاں پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ یہاں اتنا اندھیرا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں جیسے اندھا ہو گیا ہوں۔ کہیں سے ذرا روشنی نظر آجائے تو بینائی کا یقین ہوگا۔“

”کیا تمہارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں؟“

”نہیں، انہوں نے مجھے یہاں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔ کہہ رہے تھے، میں بھاگنے کی کوشش کروں گا تو مجھے گولی مار دیں گے [illegible] باپ کے یہاں سے ایک لاکھ [illegible] پورا ہونے تک مجھے خاموشی سے رہنا ہے۔“

وہ ذرا چپ ہوا، پھر بولا: ”میں عبداللہ جھنگ والا کا بیٹا حبیب ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے میرے باپ سے ایک لاکھ روپے طلب کریں گے۔ اگر مطالبہ پورا نہ ہوا تو مجھ کو مار ڈالیں گے۔“

”ان لوگوں نے مجھے الٹا لٹکا دیا ہے۔ میرے پاؤں میں رسی بندھی ہوئی ہے اور رسی یقیناً اس راڈ سے منسلک ہے جو ہمارے اوپر ہے۔ جوٹ مل کی چھت بہت اونچی ہے۔ وہ اتنی اونچائی پر مجھے باندھ نہیں سکتے تھے۔ تم کوشش کرو تو میرے پاس پہنچ سکتے ہو۔ مجھے رسیوں سے آزاد کر سکتے ہو؟“

وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا: ”میں تم سے ہمدردی کروں گا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ ایسی آزادی کا کیا فائدہ، ہم یہاں سے بچ کر نہ نکل سکیں۔“

”میں سمجھتا ہوں، ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔ شاید جوٹ مل کے باہر وہ لوگ موجود ہوں لیکن میں کب تک الٹا لٹکا رہوں۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے جیسے کلیجہ منہ کو آ رہا ہو۔ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔“

وہ لڑکا پہلے تو سہما رہا، پھر خسرو کی التجا [illegible] اندھیرے میں تلاش کرنے لگا لیکن وہ کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ وہ دیر تک [illegible] رہا تھا اور [illegible] رہا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر راستہ ٹٹول رہا تھا۔ کہیں کسی چیز سے ٹکراتا تھا پھر راستہ بدل دیتا تھا۔

خسرو کی آواز سن کر قریب پہنچتا تھا لیکن وہ اوپر سے اور یہ نیچے سے ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے۔

دونوں ہی مار کھانے کے بعد نڈھال ہو گئے تھے، کمزور ہو گئے تھے۔ وہ دیر تک کوشش کرنے کے بعد تھک ہار کر اپنی اپنی جگہ رہ گئے۔ وہ رات کسی طرح گزرتی گئی۔ صبح کی روشنی میں اندر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ خسرو نے اس لڑکے کو دیکھا۔ [illegible] کوئی چودہ پندرہ برس کا ہوگا۔ ایک طرف [illegible] بیٹھا ہوا تھا۔ [illegible] سے ڈر گیا پھر بولا: ”میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اندھا نہیں ہوں مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا [illegible] ہے۔ میں کسی [illegible] الٹا لٹکا ہوں گا۔ پلیز میری رسیاں کھولنے کی کوشش کرو۔“

اس لڑکے نے [illegible] سے تکتے ہوئے کہا: ”تم کافی اونچائی پر ہو۔ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ اور پھر تمہاری رسی کھولوں گا تو رسی چھوٹ جائے گی۔ اسے چھوڑ کر تمہارے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ تم سر کے بل گر پڑو گے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ خسرو ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ شاید رہائی کی کوئی صورت نظر آئے مگر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ دن کے گیارہ بجے کے بعد گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہو سکتا ہے [illegible] بنگالی۔ [illegible] سے چیخنے لگا: ”مجھے بچاؤ، میں بنگالی ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ دشمن سمجھا جا رہا ہے۔ [illegible] حبیب، حبیب۔“

تھوڑی دیر کے بعد باتھ روم کا بڑا سا دروازہ کھل گیا۔ خسرو نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ بی ڈی آر کے مسلح جوانوں، مکتی باہنی کے مسلح غنڈوں کے ساتھ خالص [illegible] کا تھا [illegible]

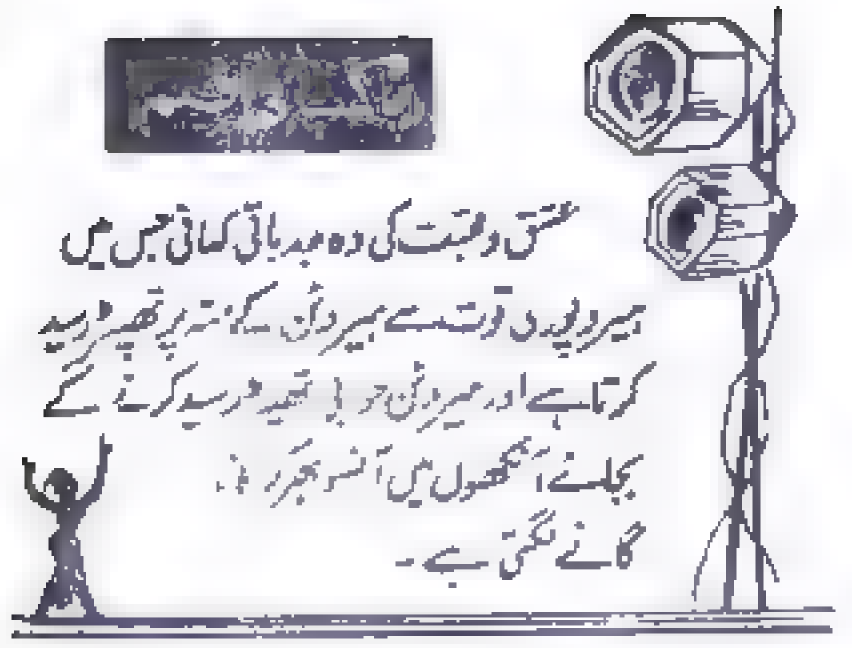

عشق و محبت کی وہ جذباتی کہانی جس میں ہیرو پہلی فرصت سے ہیروئن کے منہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے اور ہیروئن جواباً تھپڑ رسید کرنے کے بجائے آنکھوں میں آنسو بھر کر گانے لگتی ہے۔

نظر آ رہے تھے۔ تلسی رام کو دیکھتے ہی خسرو نے چیخ کر کہا: "جیجا جی! میں یہاں ہوں۔ اوپر دیکھیں۔"

تلسی رام نے اوپر دیکھتے ہی چیخ کر کہا: "وہ دیکھو — ان بدمعاشوں نے اسے وہاں باندھ رکھا ہے۔"

مکتی باہنی کے ایک غنڈے نے کہا: "تلسی رام جی، ہم لوگوں کو بدمعاش مت بولو۔ ان بہاریوں نے بنگالیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اب اس کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔"

کچھ فوجی جوان آگے بڑھ کر خسرو کو آزاد کر رہے تھے۔ تلسی رام نے غصے سے کہا: "بکواس مت کرو۔ تم لوگوں کو ہندوستان میں اس لیے ٹریننگ نہیں دی گئی۔ اس لیے ہتھیار نہیں دیے گئے کہ تم ہمارے ہی آدمیوں کو مارو اور ان کے ذریعے بلیک میل کرنا شروع کر دو۔"

تلسی رام نے خسرو سے پوچھا: "کیوں خسرو! تم نے ان لوگوں کو نہیں بتایا تھا کہ تم ہمارے آدمی ہو؟"

خسرو نے کہا: "میں ان سے بار بار کہتا رہا لیکن انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ تلسی رام کے پاس جائیں گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ آپ مجھے یہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہی ہو رہا ہے۔"

وہ ٹرک کی چھت سے فرش پر پہنچ گیا۔ سیدھا بیٹھ کر اپنے سر کو تھام کر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ تلسی رام نے قریب آ کر کہا: "تمھیں کیا ضرورت تھی ان بہاریوں سے ہمدردی کرنے کی۔ ان لوگوں کے پاس جاتے رہنے کی وجہ سے تم اس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہو۔ یہ لوگ تم پر شک کرنے لگے ہیں۔"

خسرو نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا: "آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میں پیدائشی طور پر بہاری ہوں۔ پھر آپ میری مدد کرنے کے لیے یہاں کیوں آئے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم میری پتنی کے منہ بولے بھائی ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔"

"جیجا جی! آپ میری محبت میں یہاں آئے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے بہاری بھائیوں سے محبت ہے۔ اگر میں ان سے ہمدردی کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں؟"

تلسی رام نے چند لمحوں تک اسے گھور کر دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے لے گیا۔ ان لوگوں سے دور آ کر سرگوشی میں بولا: "میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کبھی یہاں رہتا ہوں کبھی سرحد پار جاتا ہوں۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ تمھاری دیدی تمھارے لیے بہت پریشان ہوگی۔"

"نہیں جیجا جی! میں اپنے لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

تلسی رام نے پھر اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا: "کیا جو کچھ میں سن رہا ہوں۔ وہ درست ہے؟"

خسرو نے تعجب سے پوچھا: "کیا؟"

"یہی کہ تم کسی بہاری لڑکی سے محبت کر رہے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

خسرو نے خاموشی سے سر کو جھکا لیا۔ تلسی رام نے کہا: "تم نادانی کر رہے ہو۔ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمھارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ تمھارے محلے کے پڑوس کے تمام لوگوں نے تمھاری حمایت کی۔ اس کے باوجود یہ تمھیں یہاں قتل کرنے لے آئے۔ میں جانتا ہوں یہ لوگ بہاریوں کو قتل کرنے یا ان کے ذریعے ان کے رشتے داروں کو بلیک میل کرنے کے لیے کسی بھی خالی گودام یا جوٹ مل میں لے جاتے ہیں۔ جب خالص پور کے تھانیدار نے مجھے تمھارے متعلق بتایا تو میں بی ڈی آر کے جوانوں کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ بی ڈی آر کے جوان اور مکتی باہنی کے جوان اپنے بنگالی بھائیوں کی بات نہیں مانتے ہیں لیکن مجھ ہندو کی بات مانتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

خسرو نے کہا: "میں سمجھتا ہوں، یہ لوگ بھارتی حکومت کے احسان مند ہیں۔"

"جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تمھارا کیا ہوگا؟ کیا یہ تمھیں چھوڑ دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اسی لیے تمھیں سمجھا رہا ہوں — ہندوستان نہیں جانا چاہتے تو کم از کم خالص پور چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چٹاگانگ چلے جاؤ مگر یہاں نہ رہو۔"

خسرو نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان تھے۔ جسم پر بھی ایسے ہی زخم آئے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ تلسی رام نے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا: "میرے ساتھ آؤ۔ تمھیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔"

وہ آگے بڑھا۔ خسرو نے اس کے پیچھے چلنا چاہا۔ اسی وقت اسے چکر سے لگا، بدن میں تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا پھر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

◆

کلثوم نے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ زمین تارا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "تارا! مائیں دودھ پلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ آج میں زہر پلا رہی ہوں۔ نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔ اسے پی لے۔"

نین تارا نے جھجکی جھجکی نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کے باپ نے اس کی کٹورا جیسی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر خوشی سے کہا تھا "میری بیٹی کا نام نین تارا ہونا چاہیے۔"

وہی باپ اس وقت خیمے کے ایک گوشے میں لکڑی کے صندوق پر سر جھکائے یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اتنی خوبصورت آنکھوں والی بیٹی کا باپ بن کر اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہو۔

خیمے کے ایک طرف کا پلہ اٹھا ہوا تھا۔ باہر دور تک بہت سے خیمے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے خاندان ایسے تھے، جو کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر گرہستی کے سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں برتن [illegible] رہی تھیں، کھانا پکا رہی تھیں۔ بوڑھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بچے حالات سے بے خبر کھیلوں میں مصروف تھے۔ کچھ نوجوان [illegible] اور بے پروا خیمے کے باہر بیٹھے آپس میں [illegible] رہے تھے۔ جوان لڑکیاں کسی شدید ضرورت کے تحت ہی خیمے سے باہر نکلتی تھیں۔ ورنہ انھیں سختی سے خیمے کے اندر رکھا جاتا تھا۔ دوپہر کے دو بجے تھے جینوا ریڈ کراس سوسائٹی کے کارکن ان کے درمیان راشن تقسیم کرتے پھر رہے تھے۔

نین تارا کے درمیان ہی کٹورے میں زہر ملا راشن رکھا ہوا تھا۔ وہ رونے لگی۔ ماں نے پوچھا: "کیا عزت کی موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"موت کیسی ہی کیوں نہ ہو زندہ رہنے والوں کو ڈراتی ہے۔ کوئی بھی موت [illegible] ایک بار جانے والی رہ گی کوئی [illegible] نہیں کرتا۔"

وہ بھی ہوش مند تھی۔ [illegible] سے سمجھوتے رہ کر جان دے دیں گے۔

نجانے [illegible] خیمے سے [illegible] جائے گی تو لوگ [illegible] کیا ایسا کبھی [illegible] لیے ہاتھ [illegible] ہو۔

"تو ابھی [illegible] ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ جب [illegible] پاکستان بنا تب بھی ہندو مسلم فسادات کے دوران کتنی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو عزت سے موت کی نیند سلا دیا تھا۔"

امیر علی نے ایک گہری سانس لے کر شکست خوردہ لہجے میں کہا: "میں یقین سے کہتا ہوں۔ آج تم عزت سے جان دو گی اور ہم بھی مر جائیں گے تو دوسری لڑکیوں کے والدین سنجیدگی سے ہماری تائید کریں گے کہ عزت دینے سے جان دینا زیادہ بہتر ہے۔"

"ابا جان! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میری موت عزت کی موت کہلائے گی، کیا آپ میری لاش کی نمائش کریں گے؟"

امیر علی نے حیرانی سے پوچھا: "یہ کیسا سوال ہے؟"

"ہماری لڑکیاں بدنام کی جا رہی ہیں۔ کیمپ میں یہی چرچا ہے کہ ہندوستان کے بدنام علاقوں میں لڑکیوں کو پہنچایا جا رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی تو میرے متعلق [illegible] باتیں ہوں گی۔ کیا آپ کے پاس کوئی کیمرہ ہے [illegible] کے دوران تصویر تیار کریں گے اور دنیا والوں کے سامنے پیش کر سکے؟ کیا یہاں کوئی مؤرخ [illegible] اپنے قلم سے ہماری تاریخ کا ایک محترم حصہ بنا رہا ہے؟ کیا یہاں کوئی [illegible] اگر ایسا نہیں ہے تو ہم اس طرح [illegible] کیوں دیں [illegible] ہو۔ ہم اپنی جان وہاں دو عزت کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے اور ان پر تھوکتے ہوئے کیوں نہ جان دیں؟"

"یہ بات سننے سنانے میں اچھی لگتی ہے لیکن جن پر گزر رہی ہے وہ بھی اپنے حالات کو دوسرے اندیشوں کو زیادہ سمجھتے ہیں اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔"

"[illegible] کچھ بھی ہو میں حرام موت نہیں مروں گی۔"

کلثوم اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ [illegible] نے [illegible] نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہا: "میں [illegible] ہوتی ہوں کسی کو مرنے کا مشورہ دینے والی [illegible] نہیں کر سکتے۔ [illegible] دل لیے۔"

اس نے پیالے کو دونوں ہاتھوں سے [illegible] "یہ میرے لیے ہے؟"

نین تارا نے ماں کے ہاتھوں [illegible] میرے پیٹ تو آپ کے لیے بھی [illegible] لیے مر جائیں گے تمہیں زندہ [illegible] گے۔"

"[illegible] زندگی تمہیں [illegible]"

"اپنی [illegible] دشمنوں کے [illegible] ہے۔"

نین تارا [illegible] کی طرف کھینچ [illegible] کا وہ کہنے سے [illegible] تو مجھے پینے نہیں دے [illegible] بھی کھلا دے گی۔ میں کل سے بھوکی ہوں [illegible] بھوک کی [illegible] مر جاؤں گی۔"

اس کی باتوں کے دوران نین تارا نے پیالہ چھین لیا اور

چھلک کر ادھر سے ادھر گرا۔ باقی جو رہ گیا اسے کٹورے سمیت مٹی میں پھینک دیا۔ کلثوم پہلے تو سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر تڑاخ سے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا: ”ذلیل، کمینی میں تیری بے حیائی کو خوب سمجھتی ہوں۔ تجھے یقین نہیں ہے کہ ان لوگوں نے خسرو کو کہیں لے جا کر مار ڈالا ہے تو اس کا انتظار کر رہی ہے۔ میں کہتی ہوں وہ مر چکا ہے۔ وہ مر چکا ہے۔ اگر نہیں مرا تو اللہ کرے اب مر جائے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر سے شور سنائی دیا۔ لوگ [illegible] رہے تھے: ”خسرو آگیا۔ خسرو آگیا:“ ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا ہوا خیمے میں آیا۔ پھر ہانپتے ہوئے بولا: ”تارا باجی۔ تارا باجی! آپ نے کہا تھا نا، خسرو بھائی آئیں گے تو آپ گڑ اور چنے کھلائیں گی:“

تارا ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے اسے ہوش نہ رہا کہ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ اور اسے خسرو کی آمد پر والدین کے سامنے خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے لیکن بعض خوشیاں بے اختیار چھلک جاتی ہیں۔ پھر آپ پر قابو نہیں رہتا۔ وہ دوڑتے ہوئے خیمے سے باہر نکلی۔ یہ بھی بھول گئی کہ پردہ واجب ہے اور کیمپ کی لڑکیوں کو اپنا حسن چھپا کر رکھنا ہے مگر یہی تو ہے، پھول کو گلدان میں قید کرو تب بھی خوشبو اڑنے سے باز نہیں آتی۔

کیمپ کے سامنے وہ لوگ خیموں سے نکل آئے تھے جو [illegible] تھے جو یتیم ہو گئے تھے۔ [illegible] جلوس کی شکل میں [illegible] سرِ فہرست تھا اسے دیکھتے ہی تارا کے قدم رک گئے۔ جہاں آئی تھی وہیں ٹھہر گئی۔ حالانکہ [illegible] لیکن اسے زخموں کی بھیڑ دیکھ کر پاؤں پر جیسے [illegible]

جو لوگ خسرو کو دشمن سمجھتے تھے، اس پر طرح طرح کے الزامات [illegible] اب وہی اسے اپنے ساتھ لیے [illegible] دشمنی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ دوستی اور ہمدردی کا [illegible] تھا۔ خسرو نے [illegible] انہیں سمجھا دیا [illegible] ان کی طرح مظلوم ہے اور وہ بھی کسی نا انصافی کے [illegible] کا شکار ہو چکا ہے۔

اس کے سر اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔ ان پر مرہم لگا ہوا تھا۔ [illegible] سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ بھی سوج گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر [illegible] ظالموں نے اسے کس بری طرح مارا ہے۔ قریب [illegible] دیکھ کر وہ تڑپ کر الٹے پاؤں پلٹ گئی۔ دوڑ کر خیمے کے اندر چلی گئی۔ کلثوم اور امیر علی باہر آ گئے۔ خسرو نے کہا: ”ماں جی، میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی، وقت کی ایک ہی ٹھوکر نے سمجھا دیا میرا گھر جل چکا ہے۔ میری دکان تباہ ہو گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ تقدیر اچھی تھی اس لیے زندہ نظر آ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ بنگالی اگرچہ مذہب اور اللہ اچھے دوست ہیں لیکن نفرت کی آگ نے انہیں شدت پسند بنا دیا ہے، وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے:“

امیر علی نے آگے بڑھ کر کہا: ”تم میرے بیٹے ہو۔ انسان کا سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے لیکن رشتے ختم نہیں ہوتے:“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا: ”آپ اپنا بوجھ مجھ پر ڈال دیں۔ نکاح کے بعد ہمیں یہ کیمپ چھوڑ دینا چاہیے۔ تلسی رام جی میری منہ بولی بہن کے پتی ہیں۔ ان کے ذریعے ہم سرحد پار کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ نیپال پہنچ کر وہاں سے پاکستان جا رہے ہیں۔ ہم بھی یہی راستہ اختیار کریں گے:“

تارا خیمے کے اندر بیٹھی سن رہی تھی۔ خوشی سے کھل رہی تھی اور شرما رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کانوں میں ڈھولک کی طرح بج رہی تھیں۔ اگرچہ بے سروسامانی کے عالم میں شادیانے نہیں بجے۔ تاہم اس کے خیالوں میں سکھیاں آ کر سہاگ کے گیت گا رہی تھیں۔ عصر کے بعد نکاح پڑھانے کا وقت مقرر ہو گیا۔ امیر علی کچھ انتظامات کرنے لگے اور انتظامات بھلا کیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار براتیوں کو ایک ایک پیالی چائے پلائی جاتی۔ کلثوم خیمے کے اندر آئی تو اسے دیکھ کر تارا کھڑی ہو گئی، سر کو جھکا لیا۔ ماں کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی وہ ممتا کی ماری آگے بڑھی پھر بیٹی کو اپنے سے لپٹا کر رونے لگی: ”ہائے میری بچی، ہم پر ایسا بھی وقت آنا تھا۔ تیرے لیے جوڑا ہے نہ گہنے، نہ سہرا ہے نہ برات۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا۔ دل میں کتنے ارمان تھے۔ بیٹی میں جانتی ہوں میرا خدا جانتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو رہا ہے۔ ابھی تو یہی بہت ہے۔ ابھی پرائی ہو جائے گی:“

کیا حالات تھے، کیا جذبات تھے، حالات یہ تھے کہ ابھی ماں باپ ہاتھوں سے بیٹی کو [illegible] تھی۔ جذبات یہ تھے کہ بیٹی کو سہاگن بنا کر رخصت کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ بیٹی کو پرائے ہاتھوں میں دینے کا مطلب بھی تو یہی ہوتا ہے کہ اپنے آنگن سے اس کا انتقال کرایا جا رہا ہے۔ اس لیے ماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹی کی مصیبتوں پر رو رہی ہے یا اسے سہاگن بناتے وقت [illegible] تڑپ رہی ہے۔

عصر کا وقت قریب تھا۔ اسے غسل کرایا گیا۔ اس کے پاس کوئی سرخ جوڑا نہیں تھا۔ صرف ایک گلابی لباس نیا سا تھا۔ اسے ہی پہنا دیا گیا۔ اس کی کنگھی چوٹی کی گئی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا گیا

جو ہلکا پھلکا سا ایک ماپ ہو سکتا تھا۔ اس کے ذریعے اسے دلہن کا روپ دینے کی کوشش کی گئی جسو پاس والے ایک خیمے میں تھا۔ ٹھیک چار بجے مولانا وہاج الدین نکاح پڑھانے کے لیے تشریف لے آئے۔

وہ مولانا اور قاضی صاحب بھی کیمپ کے ہی ایک فرد تھے [illegible] حکومت کی طرف سے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے پاس حکومت پاکستان کا شائع شدہ نکاح نامہ اور پاکستانی حکومت کی طرف سے ریکارڈ رکھنے کے لیے نکاح کا رجسٹر موجود تھا۔ یہ گئے وقت کی بات ہو گئی تھی لیکن کیمپ کے سارے ہی لوگ ابھی پاکستانی تھے۔ دنیا کے تمام مسلمان شریعت کے مطابق نکاح پڑھاتے ہیں لیکن نکاح نامہ اپنے ملک کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اس وقت بھی وہ پاکستانی نکاح نامے پر دولہا دلہن کا نام لکھ رہے تھے۔

جب نکاح نامے کی خانہ پری ہو گئی تو ایک وکیل اور دو گواہ خیمے کے اندر آئے جہاں تارا ایک چادر میں لپٹی، گھونگھٹ کے سائے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں اس کے قریب بیٹھ گئے۔ وکیل نے کہا: بیٹی کلمہ پڑھو۔

وہ وکیل کے ساتھ ساتھ زیر لب کلمہ پڑھنے لگی۔ پھر اس سے پوچھا گیا: بیٹی میں تارا، تمہارا نکاح شریعت محمدی کے مطابق صبیح الدین [illegible] کیا تمہیں قبول ہے؟

[illegible]

اور دو بار اس سے پوچھا گیا۔ دو بار اور [illegible] پاس بیٹھی [illegible] کے ہاتھ میں قلم پکڑا کر [illegible]

دستخط ہو گئے۔ وکیل اور گواہ خیمے سے باہر آ گئے۔ [illegible] چھوٹ گئے۔

خسرو کچھ لوگوں کے درمیان ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

دلہن کی آواز سنتے ہی سب اچھل پڑے تھے۔ خسرو نے دور پڑے ہوئے نکاح نامے کو دیکھا پھر اس کی طرف دوڑ لگائی لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک زبردست دھماکا ہوا کسی نے ہینڈ گرینیڈ پھینکا تھا۔ دھواں دھواں ہو گئی۔ قیامت کا شور [illegible] عورتیں اور بچے افراتفری کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگنے لگے [illegible]

[illegible]

[illegible] منصوبے کے تحت ایک وقت چاروں طرف سے حملہ کیا تھا۔

[illegible] سب پیچھے [illegible] کی طرف [illegible] چاہتے تھے۔ وہ خیمہ آگ کے شعلوں [illegible] گیا۔ اندر سے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ اسی وقت

ایک کمسن لڑکا اپنی زخمی ماں کو گھسیٹتے ہوئے پیچھے سے باہر نکال لے جا رہا تھا [illegible] دور جاتے ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی [illegible] ہے۔ وہ وہیں زمین پر گر گیا۔ پھر بوڑھی ماں کی چیخوں کے ساتھ تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، کھلی رہ گئیں۔

[illegible] سے کسی عورت [illegible]

[illegible]

اسی لمحے خسرو نے اس کا [illegible] گولیاں ادھر ادھر سے گزر [illegible] جمعیت ہونے کے بعد اپنے اندر [illegible] وقت [illegible]

نازلی کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی —

[illegible] دو نمازی بس زندہ تھے اور وہاں [illegible]

خسرو نے اس کے ہاتھ کو تھام [illegible] ہوئے کہا: وعدہ کرو، تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی [illegible] پڑی رہو گی۔ میں ابھی آتا ہوں

[illegible] جانا چاہتا تھا [illegible] دونوں ہاتھوں سے اس کے [illegible] تھام لیا۔ [illegible] اس کے بازو پر گرنے لگے۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی [illegible] نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں [illegible] کر رہی تھیں۔ میرا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ [illegible] ایک [illegible] میں تھام رہی ہوں۔

[illegible] نے کہا۔ مجھے جانے دو۔ بوڑھے اور جوان [illegible] ہونے کے باوجود دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان پر پتھر پھینک رہے ہیں۔ خیمے کے بانس نکال کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ کچھ مر رہے ہیں، کچھ دشمنوں سے ہتھیار چھین رہے ہیں۔ مجھے بھی جانے دو۔

شاید ہم زندہ نہ رہ سکیں لیکن مریں گے تو دشمنوں سے لڑتے ہوئے۔

اس نے بازو کو نہیں چھوڑا اور سختی سے پکڑ لیا۔ ایسے وقت وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کچھ بول نہیں رہی تھی لیکن اس کی [illegible] دل میں اتر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خسرو نے ذرا کان [illegible] فائرنگ کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ باہر مرنے والوں [illegible] تھا۔ زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ زمین پر لیٹے رہے۔ باہر کی آوازیں [illegible] زمین پر رینگتے ہوئے خیمے کے پچھلے حصے تک آئے اور وہاں سے سر نکال کر دیکھا۔

[illegible] پر قیامت گزر رہی تھی [illegible] تک [illegible] جل چکے تھے۔ اب وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا [illegible] کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ معصوم بچے [illegible] آگے بڑھتے ہوئے ڈگمگاتے [illegible] اپنے والدین کو تلاش کر رہے تھے [illegible] اپنی محبتوں کے پیارے پیارے [illegible] کو پکار رہے تھے۔ ابو! خاموش کیوں ہو۔ صدا دو کہ ہم مسافر رہے ہیں —

[illegible] کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں میرے لوگ مر رہے ہیں
کوئی غنچہ ہو کہ گل ہو، کوئی شاخ ہو شجر ہو
وہ ہوائے گلستاں ہے کہ سبھی بکھر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطۂ زمیں پر
وہی خطۂ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
[illegible]
ہمی قتل ہو رہے ہیں ہمی قتل کر رہے ہیں

[illegible] بھی مسلمان ہیں، ہمارے بھی مسلمان ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمان ہی قتل ہو رہے تھے اور مسلمان ہی قتل کر رہے تھے۔ [illegible] اپنے باپ کی لاش کے سامنے سر جھکا رہی تھی۔ کبھی [illegible] کے فاصلے پر ماں کی لاش کے پاس پہنچ کر رونا بھول جاتی تھی۔ [illegible] آنکھوں میں آنسو [illegible] ایک [illegible] کا غبار نکال کر [illegible] بار بار رشتوں کے بچھڑنے کا زخم لگتا ہے [illegible] کہاں تک [illegible]۔ وہ ایک بار ماں باپ کے پاس گئی۔ دوسری بار ماں کے پاس آئی۔ پھر باپ کے پاس آ رہی تھی کہ ان کے درمیان ہی چکرا کر گر پڑی۔

[illegible] وہ سکول کے برآمدے میں ایک چٹائی کے سرے پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس [illegible] تک

بہت سی عورتیں، بچے اور زخمی مرد پڑے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اسکول کے باہر اور برآمدے میں لالٹینوں کی روشنیاں تھیں۔ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان میں کچھ کھڑے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دال بھات کھا رہے تھے اور کچھ غم چبا رہے تھے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت خسرو اس کے پاس آیا۔ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا: "تحصیل تلاؤ کے پاس ایک بڑا سا گڑھا کھود کر تمام لاشوں کو ایک ساتھ دفن کر دیا گیا ہے۔ جس کے لیے جو کپڑا نصیب ہوا اسی کو کفن کے طور پر لپیٹ دیا گیا۔ کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔"

نین تارا خلا میں گھور رہی تھی۔ خسرو سمجھ رہا تھا کہ وہ رو دے گی مگر اس کی آنکھیں خشک اور ویران تھیں۔ وہ سُنی تھی۔ جو ہو چکا تھا، جو ہو رہا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ سب سے راضی تھی۔ جیسے عورت اپنے سسرال کے بدترین حالات سے راضی رہتی ہے۔

اس کیمپ میں ایسی فائرنگ اور ایسے زبردست دھماکے ہوئے تھے کہ دور دور تک اس کی خبر پہنچ گئی تھی۔ بی ڈی آر کے مسلح سپاہی آ گئے تھے۔ لوگوں کو اطمینان تھا کہ غنڈے حملہ نہیں کریں گے۔ جمال پور کے بنگالی کچھ تو تماشا دیکھنے آئے تھے۔ کچھ اپنے بہاری دوستوں سے ملنے اور ہمدردی کرنے آئے تھے۔ ان میں خسرو کا پڑوسی سراج الاسلام بھی تھا۔ سراج الاسلام نے کہا: "خسرو بھائی تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں چلے جاؤ۔ جب حالات تمہارے موافق ہوں گے تو آ جانا۔"

"میں کہاں جاؤں، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ جانے کے لیے تو بہت سی جگہ ہے لیکن میرے ساتھ اب میری دلہن بھی ہے۔"

"صبح سات بجے ماکٹ لانچ یہاں سے جاتی ہے۔ اگر تم کسی طرح بھابی کو لے کر بھیری گھاٹ پہنچ جاؤ تو یہاں کے غنڈوں سے نجات مل جائے گی۔"

"میں کیسے جاؤں۔ غنڈوں نے یقیناً یہ سوچ رکھا ہوگا کہ کیمپ کے کچھ لوگ زندہ رہ گئے ہیں، ان میں سے کچھ بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ غنڈوں نے بھاگنے کے تمام راستے مسدود کر دیے ہوں گے۔ وہاں اپنے اپنے آدمی بٹھا دیے ہوں گے۔"

سراج الاسلام نے کہا: "آج صبح میں بھیری گھاٹ گیا تھا۔ وہاں میں نے کسی بھی مکتی باہنی کے آدمی کو نہیں دیکھا۔"

خسرو نے کچھ سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلا کر کہا: "ہاں مجھے یاد آ رہا ہے۔ مکتی باہنی کے جوان آدھی رات تک سڑکوں اور کھیتوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پھر لوٹے ہوئے مال کو تقسیم کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اس کے بعد نشے کی حالت میں بے سُدھ ہو کر صبح تک سوئے پڑے رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم بھیری گھاٹ تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے۔ تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"یہ کیا پوچھ رہے ہو بھائی! تمہارے لیے تو جان بھی دے سکتے ہیں۔ تم برسوں تک ہمارے بہترین پڑوسی رہے ہو۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ تمہاری شرافت کا سب سے معتبر گواہ تمہارا پڑوسی ہوتا ہے اور میں تمہارا پڑوسی ہونے کے ناتے تمہاری شرافت کا گواہ ہوں۔ تمہارے چھ ہزار روپے میرے پاس امانت کے طور پر ہیں۔ میں یہاں سے گھاٹ جاؤں گا اور تم دونوں کے لیے ٹکٹ لے کر رکھوں گا۔ مگر ایک بات ہے۔ بھابی نے شلوار اور قمیص پہن رکھی ہے۔ یہ بہاریوں اور پنجابیوں کا لباس ہے۔ کیا ان کے پاس ساری نہیں ہے؟"

خسرو نے نین تارا کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک خلا میں تک رہی تھی۔ شاید ان کی باتیں سن رہی تھی مگر باتوں میں شریک نہیں تھی۔ اس نے سراج الاسلام کی اس بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ خسرو نے جھینپ کر کہا: "یہ بہت دکھی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں ہیں۔ کھایا بھی نہیں ہے۔ اتنا بڑا صدمہ گزرا ہے کہ۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن چپ رہنے سے، کچھ نہ بولنے سے، کھانا نہ کھانے سے، نیند پوری نہ کرنے سے کوئی بھی دکھ ہلکا نہیں ہوتا۔"

سراج الاسلام کچھ دیر تک سمجھاتا رہا، تسلیاں دیتا رہا، پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خسرو نے کہا: "کچھ کھا لو۔"

وہ چپ رہی۔ پھر اس نے پوچھا: "کیا تم ساری پہنتی ہو؟ تمہارے پاس ساری ہے؟"

وہ پھر بھی چپ رہی۔ وہ بولا: "ہماری منزل انجانی ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکنا ہوگا۔ تمہاری یہی حالت رہی تو میرے لیے قدم قدم پر دشواریاں پیدا ہوں گی۔"

وہ خلا میں تک رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا: "آخر کب تک خاموش رہو گی۔ کیا میری موجودگی گراں گزر رہی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ میری وجہ سے تم پر مصیبتیں نازل ہوئیں۔ پہلے تم میرے نام سے بدنام ہوئیں۔ پھر شادی کا وقت آیا تو تمہارے ماں باپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ میری محبت، میری ہی موجودگی تمہارے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں تم سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر جانا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ نین تارا نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا تھا۔ جیسے بچی ہو اٹھی۔۔ رو رہی تھی۔۔ کہتی،

[illegible] جانے والے کو دامن پکڑ کر روک لیتی تھی۔ اتنی دیر بعد اس نے خسرو کو دیکھا۔ پھر اپنی نظریں جھکالیں۔ خسرو نے کہا: "بولو، تارا! بولو، خاموش رہوگی تو دل میں دھواں بھرتا رہے گا۔ یہ تمھارے لیے اچھا نہیں ہے۔ تمھیں خوب چیخ چیخ کر رونا چاہیے یا بے تحاشہ بولنا چاہیے۔"

وہ چپ رہی، سر جھکائے بیٹھی رہی۔ خسرو نے کہا: "میں تمھارے خیمے کی طرف جارہا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہاں چل کر ساری پہن لو۔ ضروری نوعیت کا سامان ایک چھوٹی سی اٹیچی میں رکھ لو۔ ہم اس برآمدے میں سب لوگوں کے ساتھ رات گزاریں گے اور وہاں سے تقریباً چار بجے صبح روانہ ہو جائیں گے۔"

وہ اٹھ کر برآمدے کے زینے تک گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے پیچھے آرہی تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے خیموں کی طرف جانے لگے۔ وہاں ابھی لوگ رات گزار رہے تھے۔ بی ڈی آر کے سپاہیوں کی موجودگی میں انھیں کسی حد تک اطمینان تھا۔ خسرو نے اپنی رفتار سست کر دی۔ مین تارا چلتے ہوئے اس کے برابر آگئی۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک خیمے سے ایک عورت نے انھیں جھانک کر دیکھا۔ اس نے ان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ کچھ کہنے کے لیے پاس والے خیمے میں چلی گئی۔ مین تارا اپنے خیمے کے پاس آکر رک گئی۔ اندر تاریکی تھی۔ شاید وہ تنہا اندر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ خسرو نے جیب سے ماچس نکالی۔ پھر ایک تیلی جلا کر پہلے خود اندر گیا۔ پھر اس سے پوچھا: "لالٹین کہاں رکھی ہوئی ہے؟"

وہ لالٹین تلاش کرنے کے لیے خیمے کے اندر آگئی۔ اس وقت تک تیلی بجھ گئی تھی۔ اس نے ڈبیہ سے دوسری تیلی نکالی۔ اسے سلگانے لگا لیکن وہ سلگ نہیں رہی تھی۔ شاید تیلی کا مسالہ سیل گیا تھا۔ اس نے دو چار بار کوشش کرنے کے بعد اس تیلی کو پھینک دیا۔ پھر تیسری نکالی۔ وہ سلگ گئی۔ ننھے سے شعلے نے خیمے کے اندر ہلکی سی روشنی پیدا کی۔ مین تارا نے لالٹین کو اٹھا کر اسے دیا۔ پھر تیل کی ٹنکی کھول کر دیکھی۔ لالٹین لوٹا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لالٹین میں تیل نہیں ہے۔

وہ تیلی بھی بجھ گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر خسرو نے آہستگی سے کہا: "لالٹین جلانا کیا ضروری ہے۔ میں تیلی جلاتا ہوں۔ تم جلدی جلدی اپنا ضروری سامان نکال کر چھوٹی سی اٹیچی میں رکھ لو۔ اس کے بعد باہر جاؤں گا۔ تم ساری پہن لینا۔"

تیلی روشن ہو گئی۔ وہ لکڑی کے صندوق کے پاس گئی۔ پھر اسے کھول کر سامان نکالنے لگی۔ اس میں ماں بیٹی کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ماں کے کپڑے دیکھتے ہی دل سے ایک آہ نکلی۔ وہ تھوڑی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ پھر اس نے ماں کی ایک ساری کو اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے بعد اس ساری میں اپنا منہ چھپا لیا۔ اسی وقت تیلی بجھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر خسرو نے ایک اور تیلی نکالی۔ اسے سلگانا ہی چاہتا تھا کہ رک گیا۔ تاریکی اور خاموشی میں سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے سوچا اچھا ہے، ذرا کھل کر رو لے۔ دل کا غبار نکل جائے۔ روشنی میں شاید وہ جھجکتی ہے۔ کچھ بولتی بھی نہیں ہے۔

اس نے تیلی نہیں جلائی۔ چپ چاپ اندھیرے میں کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد سسکیاں بند ہو گئیں۔ پھر جیسے صدیوں کے بعد خسرو نے مین تارا کی آواز سنی۔ وہ بڑی آہستگی سے کہہ رہی تھی: "میں اندھیرے میں کپڑے کیسے نکالوں؟"

اس نے فوراً ہی تیلی روشن کر دی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی کپڑے نکالنے لگی۔ خسرو نے کہا: "صرف دو چار جوڑے رکھو۔ ساڑیاں ہوں تو بہتر ہے۔"

اس نے چار ساریاں، ریشمی کوٹ اور بلاؤز وغیرہ نکالے۔ کچھ اور نکالنا چاہتی تھی کہ اسی وقت تیلی بجھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک اور تیلی جلاتا، اندھیرے میں اس کی آواز سنائی دی: "تیلی نہ جلاؤ۔ میں ایسے ہی سامان نکال لوں گی۔"

خسرو چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا: "تم اندھیرے میں بولتی ہو اور روشنی میں گونگی بن جاتی ہو۔ تارا! میں تمھارا ہوں۔ کیا مجھ سے شرماتی ہو؟ مجھے اجنبی سمجھتی ہو؟"

ایک سرد آہ سنائی دی۔ پھر اس نے کہا: "تمھارے سوا میرا کون رہ گیا ہے۔ تمھیں اجنبی سمجھوں گی تو کہاں جاؤں گی، کیسے جیوں گی؟"

"جینے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنے آدمی پر اعتبار اور دوسرا حوصلہ۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی۔ پھر بولی: "تم باہر جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ سمجھ گیا کہ لباس بدلنا چاہتی ہے۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر کہا: "یہ دیا سلائی رکھو۔ شاید تمھیں ضرورت پڑ جائے۔"

ادھر سے بھی اندھیرے میں ٹٹول کر ہاتھ بڑھایا گیا۔ پھر دونوں کے ہاتھ ٹکرا گئے۔ خسرو نے پہلے ایک ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا پھر دوسرے ہاتھ سے اس کی ہتھیلی پر دیا سلائی رکھ دی۔ وہ بڑی محبت سے بولا: "یہ ہاتھ میرے لیے ہے۔ میں

روشنی میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور مصائب کے اندھیروں میں ان سے مقابلہ کیا کروں گا۔"

اس نے ہولے سے اس ہاتھ کو تھپک کر چھوڑ دیا۔ اندھیرے میں پلٹ کر خیمے سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی ٹھٹک گیا۔ کیوں کہ خیمے کے آس پاس کچھ لوگ نظر آرہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ روشن بھائی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے پوچھا: "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

خسرو نے جواب دیا: "مین تارا اپنا سامان لینے آئی ہے۔"

ایک نے پوچھا: "تم اس کے ساتھ خیمے میں کیا کر رہے تھے؟"

"میں روشنی دکھا رہا تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم نے دو چار بار روشنی کی جھلک دیکھی پھر اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد اندھیرا ہی رہا۔"

خسرو نے ناگواری سے کہا: "جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے اپنے طور پر آپ نہ سمجھیں۔ لالٹین میں تیل نہیں تھا۔ مجبوراً صرف تیلیاں جلا کر سامان تلاش کرنا پڑا۔ اسی لیے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ جھوٹ سمجھ رہے ہیں تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تمہاری بیوی کیسے ہو گئی؟ نکاح پورا تو پڑھایا نہیں گیا تھا۔"

ایک عورت نے کہا: "ہاں، میں تو خیمے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دلہن نے قبول کر لیا تھا۔ کاغذ پر دستخط بھی کیے لیکن تم نے تو قبول نہیں کیا۔ تم نے دستخط بھی نہیں کیے۔ تمہارا نکاح نہیں پڑھایا گیا پھر شادی کیسے ہو گئی؟"

کسی اور نے کہا: "شادی ہوئی مگر آدھی ہوئی۔"

ایک بزرگ نے کہا: "شادی کبھی آدھی نہیں ہوتی مگر بے حیائی پوری ہو گئی۔"

خسرو نے کہا: "جناب! آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

ایک عورت نے روشن بھائی کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کہا: "میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے خیمے کے پاس آئی پھر جیسے ہی اندر داخل ہوئی، مین تارا کی چیخ سنائی دی۔ وہ عورت فوراً ہی پلٹ کر باہر آگئی۔ ہاتھ اٹھا کر چیختے ہوئے بولی: "بے حیائی کی حد ہو گئی۔ یہاں ہماری بھی جوان بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

کسی نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ میں جیسے ہی اندر گئی تو دیکھا، اس کے بدن پر کچھ نہیں ہے۔ وہ ساری پہن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر چھپنے لگی۔ توبہ توبہ ....

> اس بات پر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہماری موجودہ نسل کا کیا ہوگا۔ موجودہ نسل کے بچے بڑے ہو جائیں گے اور اپنی نئی نسل کے بارے میں گھبرایا کریں گے کہ اس کا کیا ہوگا؟

دوسرے بھی توبہ توبہ کرنے لگے۔ کوئی بھی کچھ کہہ رہا تھا کوئی تھو تھو کر رہا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا: "بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ جب شادی آدھی ہوئی ہے۔ لڑکی نے قبول کر لیا ہے تو لڑکے سے بھی قبول کرا دو۔ کہاں ہے وہ نکاح نامہ؟"

کسی نے کہا: "نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب بے چارے ختم ہو گئے۔ ان کا رجسٹر اور دوسرے کاغذات پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ ان کے نکاح نامے کو کون سنبھالتا؟"

خسرو نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: "خدا کے لیے آپ لوگ خاموش ہو جائیں۔ کچھ تو عقل سے کام لیں۔ اگر وہ نکاح نامہ ہوتا تو کیا اس وقت نکاح پڑھانا مناسب ہوتا؟ مین تارا پر قیامت گزر رہی ہے۔ ایک ہی وقت میں ماں اور باپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ پھر بھی ایسے وقت نکاح پڑھانے کی بات کی جا رہی ہے۔"

ایک عورت نے ہاتھ نچا کر کہا: "کیا تم خیمے کے اندر اس کے ماں باپ کا سوگ منا رہے تھے؟"

"یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس بے چاری کو بدنام نہ کریں۔"

وہ سب طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔ "ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو بدنام کریں۔"

کسی نے کہا: "جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔"

خسرو نے کہا: "ہم سب بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ہماری سماجی زندگی بھی ایک کیمپ تک محدود ہو گئی ہے۔ ہمارا کل کیا ہوگا یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ ہم میں سے کتنے لوگ جئیں گے، کتنے مریں گے۔ کیا کوئی جانتا ہے؟"

کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب یوں خاموش تھے جیسے اس کی زبان سے اپنی اپنی تقدیر کا حال سننے والے ہوں۔ اس نے کہا۔ "ہماری اگلی سانس ہماری نہیں ہے۔ ان حالات میں بھی آپ

دا مردوں کے گھروں میں جھانکتا، کسی کی کمزوری تلاش کرتا اور کسی پر کیچڑ اچھالنے میں حصہ لیتے۔ آدمی مرتے وقت اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے۔ توبہ کرتا ہے۔ کیا ہم یہ سوچ کر توبہ نہیں کر سکتے کہ ہمارا آخری وقت آگیا ہے؟"

[illegible] سمجھانے لگے۔ ایک نوجوان نے للکارتے ہوئے کہا: "[illegible] تمام لوگ خیمے کے سامنے سے ہٹ جائیں۔"

سب نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سہم گئے۔ وہ خیمے کے سامنے سے ہٹنے لگے۔ ذرا دور [illegible] اس نے پچھلی رات رضو کو قتل کیا تھا [illegible] ریوالور [illegible] خیمے کی طرف رخ کرتے ہوئے حکم دیا۔

"[illegible] باہر آجاؤ۔"

وہ اسی وقت اپنے خیمے سے باہر آگئی۔ اس کا سارا [illegible] اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ٹھیک ریوالور کی زد میں تھی۔ دیکھنے والوں کو ریوالور [illegible] محسوس ہو رہا تھا۔ موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ [illegible] کی طرح اپنی طرف دیکھتی ہوئی لگتی ہے۔ اس [illegible] لوگوں کا کوئی ٹھیک نہیں تھا کہ وہ ریوالور کدھر گھما دیتا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھتے ہوئے کہا: "پچھلی رات رضو ہلاک ہوئی تھی۔ ظالموں نے اسے پہلے ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جن لوگوں نے اسے توڑا ان کا حساب کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیا آپ لوگوں نے کسی ظالم کا گریبان پکڑا تھا؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا: "وہ بے چاری ظالموں [illegible] تڑپ تڑپ کر سسکتی رہی۔ ایک ایک خیمے کے سامنے سے گزرتی رہی۔ کسی نے یہ نہیں کہا۔ رضو خیمے میں آجاؤ۔ رضو ہمارے پاس بیٹھو۔ تم ہماری بہن ہو، تم ہماری بیٹی ہو۔ وہ بے چاری تباہ ہو گئی تھی۔ تم لوگوں نے اسے تباہی کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ [illegible] کیوں کہ سب کو اپنا اپنا دکھ بھاری ہے لیکن [illegible] مرتے وقت آپ اپنا دکھ کیسے بھول جاتے ہیں۔ [illegible] کا علاج ہے کہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے چٹخارے لینے کو دوسروں پر غم کے پہاڑ توڑے جائیں؟"

وہ ذرا چپ ہوا۔ غصے میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ پھر بولا: "آج میں تارا کو سہارا دے رہا ہے اور آپ اس پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ اسے بھی توڑ دینا چاہتے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے نین تارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تم خسرو کے ساتھ جاؤ۔ کسی نے تمہارا راستہ روکا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

خسرو نے تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھا۔ اس نے تارا کے ہاتھ سے گٹھڑی لے لی۔ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

پھر لوگوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اس نوجوان کے پاس آکر رک گیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "ہتھیاروں سے وقتی طور پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے جیسا کہ بنگالیوں پر ڈالا گیا تھا۔ تم نے ہمارے لیے راستہ ہموار کیا۔ بہت بہت شکریہ۔ لیکن ہمارے جانے کے بعد ان لوگوں سے معافی مانگ لینا کیوں کہ ہتھیار ہمیشہ نفرت پیدا کرتے ہیں۔ میرے دوست! کسی کو مارو تو محبت سے مارو۔"

وہ نین تارا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اسکول کی طرف جاتے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد نین تارا نے رک کر کہا: "ریوالور دکھا کر لوگوں کی زبان بند کر دینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "کیسی حقیقت؟"

"یہی کہ میں نے نکاح قبول کیا ہے۔ تم نے نہیں کیا۔"

"دل میں صفائی اور ایمان ہونا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے سامنے قبول کرتا ہوں۔"

"یہ بچوں کا کھیل اور جوانوں کا مشغلہ ہوتا تو سبھی چلتے پھرتے نکاح قبول کروا لیتے۔ میرا نکاح شرعی احکامات کے مطابق مکمل نہیں ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے تب شرع کے مطابق مکمل ہوگا لیکن ابھی تو چلو۔"

"میں آگے بڑھنے سے پہلے سوچ رہی ہوں، تمہارے ساتھ چلوں تو کس رشتے سے چلوں؟"

خسرو نے کچھ سوچا پھر کہا: "تم نے مجھے اپنی جان و مال کا اور عزت آبرو کا محافظ سمجھا۔ مجھ پر اعتماد کیا۔ مجھے قبول کیا۔ جیسے قبول کیا ویسے اعتماد کرو۔ میرے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کرو۔ رہ گئی میری قبولیت کی بات تو ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ شام کو تمہارے والدین شہید ہوئے ہیں۔ چالیس دن کے بعد بھی جب تک سوگ مناتی رہو گی۔ شادی نہیں ہوگی۔ شادی کب ہوگی۔ یہ فیصلہ تم پر ہے۔"

نین تارا نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی: "تھوڑی دیر پہلے خیمے کی تاریکی میں تم نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور کہا تھا۔ یہ ہاتھ تمہارے لیے ہے۔ تم روشنی میں اس کے ساتھ چلو گے اور مصائب کے اندھیروں میں اسے تھام لیا کرو گے۔"

پھر وہ سرد آہ بھر کر بولی: "لیکن جب تک نکاح قبول نہیں کرو گے۔ اس وقت تک مصائب کے اندھیروں میں بھی اپنا ہاتھ تمہیں نہیں دوں گی۔ جہاں جہاں حالات مجھے لے جائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن یہ بھول نہ کرنا کہ میں [illegible] گئی

ہوں تمہارے، وہ بھی ہوں مگر تمہارے لیے نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کے آگے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دور جاکر وہ رُک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر پوچھا: "میرے ساتھ کیوں نہیں چل رہے ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "شادی مکمل ہوتی تو میں شوہر کی حیثیت سے آگے چلتا، تم میرے پیچھے ہوتیں۔ ابھی میں تمہارا طلبگار ہوں، پیچھے آرہا ہوں۔"

کیا حسین جواب تھا۔ میں تارا کا دل محبت سے بھر گیا۔ اگر خسرو ہوتا تو وہ حسرت سے مر جاتی۔ وہ پھر اسکول کی طرف جانے لگی۔ اس کے آگے بے شک اندھیرا تھا لیکن پیچھے یقین چلا آرہا تھا۔

اسکول کے برآمدے میں اسی طرح لوگوں کی بھیڑ تھی۔ عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے۔ بچے، بڑے بیٹھے ہوئے تھے یا سو رہے تھے۔ میں تارا کی چٹائی خالی پڑی تھی۔ اس نے سرھانے ابھی رکھ دی۔ وہاں بچی کو تکیہ بنا کر سو سکتی تھی۔ نیند تو نہ آتی، ماں باپ کی یاد ستاتی رہتی لیکن ایک جگہ لیٹ کر کروٹیں بدل سکتی تھی۔

وہ چٹائی پر لیٹ نہ سکی۔ خسرو کی موجودگی سے جھجک رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے دور برآمدے کے زینے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ قریب آکر بولا: "میں کھانے کے لیے کہتا ہوں۔ تم کھاتی نہیں ہو۔ اس کے لیے میں مجبور نہیں کرسکتا۔ تم پر ایسے صدمات گزرے ہیں کہ وہ حلق سے اتر نہیں سکتا لیکن سونا تو چاہیے۔ تم میری موجودگی سے جھجک رہی ہو۔ ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔ آرام سے سونے کی کوشش کرو۔ میں صبح چار بجے آکر جگاؤں گا۔"

وہ جانے لگا۔ میں تارا بیٹھی رہی، اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ خیال تھا کہ وہ چلا جائے گا۔ نظر نہیں آئے گا تو وہ اطمینان سے لیٹ جائے گی۔ برآمدے میں دو چار لالٹینیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی برآمدے سے زیادہ دور نہیں جارہی تھی۔ اس لیے وہ جلد ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جب وہ نظر نہیں آیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں لگا جیسے اندھیرے نے اسے نگل لیا ہو۔ کیا محبوب محبت کی طرح آتا ہے۔ پھر رلانے کے لیے گم ہو جاتا ہے؟

اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ جیسا سمجھتی تھی، وہ ویسا نہیں ہو سکتا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے، دشمن راستہ روک دیتے تھے۔ اس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ اندھیروں میں جھانکنے لگی۔ امید تھی، وہ دکھائی دینے والا سامنے آئے تو جلوہ نظر آنے لگے گا۔

اس سے ذرا فاصلے پر ایک عورت چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تارا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میرے میاں کہہ رہے تھے، بستی والے خسرو کو لے گئے تھے۔ اسے الٹا لٹکا کر خوب مارا ہے۔ شاید جان سے مارنا چاہتے تھے۔"

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے کے زینے تک آئی۔ اس عورت نے پوچھا: "کہاں جارہی ہو؟"

وہ زینے سے اتر کر سوچنے لگی۔ کہاں جائے؟ اسے کہاں ڈھونڈے؟ آگے تاریکی تھی۔ دور خیموں میں کچھ مدھم افسردہ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف اسکول کی عمارت نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ اسے کیوں اسے جاتے وقت نہیں روکا تھا؟ اور ایسے حالات کیسے پیدا کیے کہ وہ جانے پر مجبور ہوگیا؟

وہ آگے بڑھی، پھر رُک گئی۔ اندھیرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اسے بچپن ہی سے ڈرنے کی عادت تھی۔ اندھیرا ہو تو اکیلی آنگن میں بھی نہیں جاتی تھی لیکن جوانی کے آنگن میں کتنا ہی اندھیرا ہو، جذبے بے دھڑک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

ذوالقرنین

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ذوالقرنین سکندرِ اعظم کا لقب تھا لیکن تاریخی لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہے۔ ذوالقرنین دراصل ایران کے اُس بادشاہ کا لقب تھا جو تاریخ میں "CYRUS THE GREAT" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے ایرانی زبان میں کورش کبیر کہتے ہیں۔ سائرس کی قبر شیراز کے نواح میں واقع ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ سائرس پیغمبر بھی تھا۔ ذوالقرنین کے لقب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ جو تاج پہنتا تھا اس پر دو سینگ بنے ہوئے تھے۔ عربی میں قرن سینگ کے معنوں میں آتا ہے اور ذو کے معنی ہیں دو یعنی دو سینگوں والا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تاج آخر اُس کا دو سینگ کیوں ہوا تھا؟ اُس نے "میڈیا" اور "لیڈیا" نام کی دو سلطنتیں فتح کرکے اپنی قلمرو میں شامل کرلی تھیں۔ اس طرح دو سینگ دراصل ان ہی کی علامت تھے کہ وہ دو سلطنتوں کا مالک ہے۔

محمود جمال

وہ جو سامنے کی روشنی سے آنکھیں ملا آئی تھی اس لیے تاریکی میں پہلے اچھی طرح نظر نہیں آیا۔ پھر دروازے پر کوئی نظر آنے لگا۔ رات کی خاموشی میں اس کی دھیمی دھیمی سی آواز دل میں چبھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا: بڑی مشکل ہے۔ جب تمہارے پاس ہوتا ہوں تو تم پاس نہیں آتیں۔ دور جاتا ہوں تو ڈھونڈنے چلی آتی ہو۔ تمہاری ادائیں کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے [illegible] جیسے [illegible] مانتی ہو۔ میرے دل [illegible] آتا ہے [illegible] بچپن سے مجھے [illegible] محبت ہو [illegible] روز فون پہ رہو گی۔

اس نے [illegible] دل جھکائی [illegible] سے گھوم کر [illegible] چلتے ہوئے پھر [illegible] کر چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ برآمدے سے جڑے رستے پر آ بیٹھا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر نظریں اٹھا کر دیکھا تو سونے ہی ایک [illegible] دیکھنے [illegible] تمہارے سے مجھے [illegible] سو جاؤ:

وہ دیوار کی طرف گھوم گئی اور سر پہ چادر ڈال کر لیٹ گئی۔

خسرو وہاں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اطمینان کیا کہ وہ سو رہی ہے یا نہیں، وہ واقعی تھکی ہوئی تھی۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی اسی لیے نیند اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ برآمدے سے اتر کر اسکول کے دالان میں چلا آیا۔ وہاں ایک فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ ایک جوان ہاتھ میں اسٹین گن لیے ٹرک کے پاس ایک اونچے سے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں شاید کچھ اور جوان بھی تھے جو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔ وہ بنگلہ دیش رائفلز سے تعلق رکھتے تھے۔ خسرو نے سوچا تھا، کسی بھارتی فوج کے جوان سے درخواست کرے گا اور اس کے ذریعے صبح چار بجے بھیری گھاٹ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن وہاں کوئی بھارتی سپاہی نظر نہیں آیا اور وہ بنگلہ دیش رائفلز کے بنگالی جوانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ ریڈ کراس کے دفتر کی طرف جانے لگا۔ دفتر میں دور ہی سے روشنی نظر آرہی تھی۔ وہاں کچھ لوگ جاگ رہے تھے۔ سیکنڈ آفیسر جان اینگل ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر شراب سے بھرا ہوا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ بوتل خالی تھی۔ بی ڈی آر کا کپتان ایک کرسی پر بیٹھا نشے کی حالت میں اونگھ رہا تھا۔ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا تھا۔ اس کے سامنے رکھا ہوا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں ایک جوان ملازم کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ خسرو نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے پہچان لیا۔ وہ طاہر علی تھا۔

پاکستان بننے کے بعد طاہر علی کے والدین کلکتہ سے آگئے تھے اس لیے وہ اردو بھی اتنی اچھی طرح بولتا تھا جتنی کہ بنگالی زبان بول سکتا تھا۔ وہ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک معتبر کامریڈ تھا۔ جب چین اور روس کے درمیان گہرے تعلقات تھے تو مشرقی پاکستان میں ایک ہی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جب ان کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک ماسکو گروپ اور دوسرا پیکنگ گروپ کہلانے لگا۔ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک جو خونی کارروائیاں ہوئیں ان میں پاکستان آرمی، بنگلہ دیش رائفلز، انڈین آرمی اور مکتی باہنی کے علاوہ ماسکو گروپ اور پیکنگ گروپ نے بہت اہم رول ادا کیے تھے۔ پاکستان اور چین ہمیشہ سے دوست رہے ہیں اسی لیے وہاں چینی کمیونسٹ پارٹی یا پیکنگ گروپ کے لیڈر متین یا دوسرے تمام کامریڈ پاکستان کے مفاد میں کام کرتے رہے تھے۔ اس کے برعکس ماسکو گروپ کے لیڈر اسول سنگھ عرف مولی داد، مظفر اور اس کے تمام کامریڈز نے عوامی لیگ کا ساتھ دیا تھا اور اب بنگلہ دیش رائفلز، انڈین آرمی اور مکتی باہنی والوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

خسرو اور طاہر علی کبھی کلاس فیلو تھے۔ پھر طاہر علی کلکتہ چھوڑ کر ڈھاکہ چلا گیا۔ وہاں کامریڈ متین کے ساتھ کام کرنے لگا۔ پاکستان کی سلامتی کے لیے تین طرف محاذ سے جنگ ہو رہی تھی۔ ایک محاذ پاکستان آرمی کا تھا۔ دوسرے محاذ سے بہاری دامے درمے سخنے پاک فوج کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ تیسرے محاذ پر پیکنگ گروپ کے کامریڈ تھے جو انڈین آرمی کے خلاف پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے۔ پاکستان آرمی کا انجام سب کے سامنے آچکا تھا۔ بہاری تو مختلف کیمپوں میں قید ہو کر رہ گئی تھی لیکن پیکنگ گروپ کے کامریڈوں کا کیا انجام ہوا تھا، یہ خسرو کو معلوم نہیں تھا۔ اب طاہر علی سے معلوم ہو سکتا تھا۔

وہ دفتر کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ طاہر علی اسے دیکھتے ہی چونک گیا۔ اس نے جان اینگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ سر! یہ نسیم الدین خسرو ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ میرا تعلق کسی پارٹی سے، کسی سیاست سے نہیں ہے:

جان اینگل نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بی ڈی آر کے کپتان کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے مخاطب کیا: ہیلو، کپتان! یہ جوان اپنی بے گناہی کے ثبوت میں مسٹر خسرو کو پیش کر رہا ہے۔ کیا تم بھی اسے جانتے ہو؟

کپتان نشے کی زیادتی سے بڑبڑا کر رہ گیا۔ جان اینگل نے

طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: تو مسٹر لکھڑے تم کیا دیکھ رہے ہو۔ موقع ہے کیمپ میں چلے جاؤ۔ تمہیں یہاں سے کوئی پکڑ کر نہیں لے جائے گا۔ کوئی تم سے سوالات نہیں کرے گا۔"

پھر اس نے خسرو سے پوچھا: "اینڈ یو مسٹر! تم اتنی رات کو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

خسرو نے کہا: "میں سونا چاہتا ہوں۔ جگہ نہیں ہے۔ جگہ ملے گی تو بچھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

جان ایگل نے ایک گہری سانس لے کر کمرے کے گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو، ایک کمبل پڑا ہوا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ میں تو تم لوگوں کی ضرورتیں پوری کر دیتا ہوں، میری ضرورت پوری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اس نے شراب سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر کہا: "بس یہ آخری گلاس ہے۔ اس کے بعد بوتل خالی۔ کیا تم کہیں سے ولایتی شراب کا بندوبست کر سکتے ہو؟ میں تمہیں بہت سے کمبل دوں گا۔ جو طلب کرو گے، وہ دوں گا۔"

ریڈ کراس سوسائٹی میں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور بچھانے کا تمام سامان موجود تھا علاج کے لیے دوائیں بھی تھیں۔ ڈاکٹر بھی تھے اور وہاں آکر کام کرنے والے انگریز عورتیں اور مرد ان کے لیے شراب کا تھوڑا سا کوٹہ بھی مقرر تھا جو باہر سے ان کے لیے آتا تھا لیکن وہ کوٹہ کم پڑتا تھا۔ بی ڈی آر کے [illegible] ولایتی شراب کی بھری ہوئی بوتلیں بھیک کے طور پر [illegible] تھے اور ریڈ کراس والے صاحب لوگ انکار نہیں کر سکتے تھے۔

یوں تو پینے کے لیے وہاں بہت کچھ تھا۔ بنگال کی تاڑی بہت مشہور ہے۔ پینے کے بعد کھوپڑی گھوم کر رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دیسی شراب بھی تھی۔ بھارت سے بھی ہر کوالٹی کی شراب فروخت ہونے کے لیے آتی تھی لیکن بھارت کی بوتلوں میں شراب دیسی ہوتی تھی اور لیبل بدیسی ہوتا تھا۔ ریڈ کراس کے صاحب لوگوں کو ولایتی کا چسکا پڑا ہوا تھا اس لیے وہ دیسی کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

ان دنوں بنگلہ دیش کی نگری میں [illegible] اور راجہ چوپٹ تھا۔ سبھی قانون کی حدوں سے باہر تھے۔ اس لیے درآمدات و برآمدات کے لائسنس جاری کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ مارواڑی تاجروں نے باہر سے ولایتی شراب منگا کر بڑی چاندی کرنی چاہی تھی لیکن ہندو تاجر یہ کب گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے مال کی کھپت کے لیے بنگلہ دیش بننے میں ان کی مدد کی تھی اس لیے وہاں صرف ہندوستانی شراب بک سکتی تھی۔ ولایتی شراب ریڈ کراس کے کھاتے میں آیا کرتی تھی۔

خسرو نے سوچا کہ کاش، میرے پاس ایک ولایتی شراب کی بوتل ہوتی۔ تب اسے جان ایگل کو دے کر اس کے ذریعے بہ آسانی یہاں سے نکل سکتا تھا۔ میں [illegible] کو بحفاظت بھیری گھاٹ تک لے جا سکتا تھا۔

اس نے کہا: "سوری مسٹر ایگل! ہم یہاں کیمپ میں محدود ہیں۔ کہیں جا نہیں سکتے۔ اگر کہیں آپ کے مطلب کی چیز ملتی ہو تو مجھے وہاں تک پہنچا دیں۔"

[illegible] ہنستے ہوئے کہا: "اگر کہیں ملتی تو [illegible] محدود نہیں ہیں۔ میں کسی سے بھی منگوا سکتا ہوں۔ تھینک یو۔ شب بخیر۔"

"مسٹر ایگل! میں آپ کے کام آ سکتا۔ آپ میرے کام آ سکتے ہیں۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے بھیری گھاٹ تک جانا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔"

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ بی ڈی آر کا ایک جوان [illegible] حالت میں [illegible] بیٹھا ہوا تھا۔ [illegible] آنکھوں سے [illegible] دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ میں نشے میں ضرور ہوں لیکن [illegible] نہیں ہوں۔ فرار ہونے کے منصوبے کو خوب سمجھ سکتا ہوں۔

وہ وہاں سے پلٹ کر دفتر کے [illegible] آیا۔ بھارت [illegible] بہاری کی حیثیت جیسے پہچانے یہاں سب لوگ اسے پہچانتے تھے۔ اگر وہ کسی طرح ڈھاکہ پہنچ جاتا تو ایک بنگالی کی حیثیت سے بیوی کے ساتھ رہ کر زندگی گزار سکتا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ طاہر نے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پھر اس نے کش بڑھاتے ہوئے کہا: "کیا تم نے شادی کر لی ہے۔ اگر کر لی ہے تو پہلے کمبل لے جاؤ۔ بیوی کو ضرورت ہوگی۔"

ɔa staunen
: aber, wie
harf die
hneidet –
as . . .?"

اب تو آپ کو ثبوت مل گیا کہ ہماری کمپنی کی قینچی کتنی تیز ہے۔

◆

"وہ آرام سے گزر رہی ہے۔ تم ڈھاکہ سے کب آگئے ہو؟ کیسے آئے ہو؟"

وہ باتیں کرتے ہوئے اسکول کے برآمدے کی طرف جانے لگے۔ طاہر علی نے کہا: "بڑی مصیبتوں سے آیا ہوں۔ میں کامریڈ متین کے ساتھ پاکسی برج سے چالیس میل دور اترائی گھاٹ کے محاذ پر لڑ رہا تھا۔ یار سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا سے کیا ہو گیا۔ بے چارے کامریڈ متین کی حالت بڑی خراب ہے۔ وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اس برآمدے میں آگئے جہاں عورتیں مرد بچے بوڑھے سبھی سو رہے تھے یا کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تارا گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خسرو زینے پر کمبل بچھا کر طاہر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ طاہر وہ تاریکی میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کامریڈ متین کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ شاید تم اسے سننا پسند کرو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ماسکو گروپ والا پیکنگ گروپ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگے تھے۔ انہی دنوں کامریڈ متین کو ایک طالبہ سے محبت ہو گئی۔ اس کا نام ہے رابعہ خاتون۔ وہ بہت ہی ذہین اور معاملہ فہم لڑکی ہے۔ طلباء تنظیموں میں ایسی ہی لڑکیاں تیزی سے آگے بڑھتی ہیں۔ رابعہ خاتون جب سیکڑوں طلباء کے مجمع میں تقریر کرتی تھی تو دشمنوں کو چپ لگ جاتی تھی۔ ماسکو گروپ کے کتنے ہی کامریڈز نے کوششیں کیں کہ رابعہ خاتون ان کی طرف جھک آئے لیکن یہ صرف سیاست کا نہیں دل کا بھی معاملہ تھا اور وہ متین سے متاثر ہو چکی تھی۔

کامریڈ متین نے ایک روز اس سے پوچھا: "ہم اپنی تحریک کے سلسلے میں کب تک جگہ جگہ بھٹکتے رہیں گے۔ ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ کیوں نہ شادی کر لی جائے؟"

رابعہ نے کہا: "دو سال بعد میری تعلیم مکمل ہو جائے گی۔ میرے گھر والوں کا ارادہ ہے کہ میں بیرسٹر بنوں۔ ان کا سپنا پورا ہونے تک ہم اپنا سپنا پورا کریں گے۔"

"دو سال بہت ہوتے ہیں؟"

"انتظار کرو تو بہت ہوتے ہیں۔ اپنے آدرش کے لیے چلتے رہو تو کم ہو جاتے ہیں۔"

"ہم کوئی دن، تاریخ تو مقرر کر لیں؟"

"چلو کر لیتے ہیں۔"

"لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ اس مقررہ دن ہم جہاں بھی ہوں گے۔ جتنے بھی مصروف ہوں گے۔ تمام مصروفیات کو چھوڑ کر آگ اور خون کے دریا سے بھی گزر کر ایک دوسرے سے ملیں گے اور نکاح پڑھوائیں گے۔"

وہ راضی ہو گئی۔ انہوں نے شادی کے لیے دو سال بعد جنوری کی پہلی تاریخ مقرر کی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ دن آنے سے پہلے کیا قیامت گزرنے والی ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء سے پہلے ڈھاکہ کے ریس کورس میں شیخ مجیب الرحمن نے تقریباً دس لاکھ بنگالیوں کے سامنے تقریر کی۔ اس تقریر میں مجیب الرحمن نے ایک نیا سلوگن دیا۔ وہ سلوگن تھا: "اے بارے سنگرام مکتیا سنگرام۔" (اب ہماری تحریک آزادی کی تحریک ہے)

مجیب الرحمن نے اس سلوگن کے ساتھ پہلی بار جے بنگلہ نعرہ لگایا۔ عوامی لیگ کی ایک شاخ چھاترو لیگ (طلبا لیگ) کا جلسہ جہاں بھی ہوتا تھا وہ نعرہ لگاتے تھے: "امار بھاشا، تمار بھاشا۔ بنگلہ بھاشا، بنگلہ بھاشا (ہماری زبان۔ تمہاری زبان۔ بنگلہ زبان بنگلہ زبان)"

پھر ان جلسوں میں بنگالی عوام سے پوچھا جاتا تھا: "ڈھاکہ۔ نا پنڈی؟" (ڈھاکہ چاہتے ہو یا پنڈی؟)

لوگ چیخ چیخ کر جواب دیتے تھے: "ڈھاکہ۔ ڈھاکہ!"

۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمن کے حکم کے مطابق یوم پاکستان کے بجائے یوم مزاحمت منایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش کا جھنڈا بھی لہرایا گیا۔ اس شہر کے کسی بھی فرد میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر پر پاکستانی پرچم لہراتا۔ صرف محمد پور اور میر پور کے بہاریوں نے اپنے حب الوطنی کے ستارہ و ہلال کو گھر گھر لہرایا تھا۔

ایسٹ پاکستان رجمنٹ کے باغی کرنل عثمانی نے بیت المکرم کی شاندار مسجد کے سامنے فوجی پریڈ کا اہتمام کیا۔ اس فوجی پریڈ میں سیکڑوں سابق فوجی بنگالیوں نے شرکت کی اور سب نے بنگلہ دیش سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ بڑی اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ ان حالات میں پاکستان آرمی کو بیرکوں سے باہر آنا پڑا۔ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کرنل عثمانی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز کے بے شمار بنگالی فوجی سرحد پار چلے گئے۔ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ہی بھارت میں مکتی باہنی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ انہیں چھاپہ مار طریقہ جنگ کی تربیت دی گئی۔ دسمبر کی جنگ کے دوران کامریڈ متین اپنے لوگوں کے ساتھ پاکسی کی طرف چلا گیا۔ رابعہ سے جدا ہو گیا۔ وہ ڈھاکہ میں تھی اور اسے متین کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔

۱۶ دسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی کامریڈ متین نے اترائی گھاٹ میں جنگ جاری رکھی۔ اگرچہ وہ ریڈیو کے ذریعے یہ بری خبر سن چکا تھا۔ پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ بھلا خوش فہمی کیسے نہ ہوتی۔ انہیں بھارتی ذرائع سے

معلوم ہو چکا تھا کہ امریکہ کا بحری بیڑہ خلیج بنگال میں مشرقی پاکستان کی سرحد سے کم و بیش ایک ہزار میل دور کھڑا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ چین سے پاکستان کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بار بار یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ چینی حکومت صرف جنگی ہتھیار ہی نہیں، اپنے جنگی سپاہی بھی فراہم کرے گی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ تمام توقعات خاک میں مل گئیں۔ بہرکیف اس سے واسطہ نہیں ہے۔ اس بازی کے پلٹ جانے کے اسباب بتانے والا کوئی نہیں ہے

بہرحال کامریڈ متین اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا بھارتی سپاہی متین کو صورت شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ اگر پہچانتے تو اسی وقت گولی مار دیتے۔ عوامی لیگ کے لیڈر اور ماسکو گروپ کے کامریڈ بھی متین کو مردہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جب متین کو ڈھاکہ سنٹرل جیل پہنچایا گیا تو یہ طے پایا کہ قیدیوں کی شناختی پریڈ ہونی چاہیے۔ خاص خاص آدمیوں کو پہچان کر انہیں عبرتناک سزائیں دینے یا انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ تھا۔ اس سے پہلے ہی کامریڈ متین کی محبوبہ نے پانسہ پلٹ دیا۔

وہ چھاترو فرنٹ کے طلبا و طالبات کا جلوس لے کر سنٹرل جیل کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ [illegible] تعلق [illegible] کے صحافی اور فوٹو گرافرز وغیرہ بھی تھے۔ وہ سب قانونی مشیر اور وکلاء کو بھی ساتھ لائی تھی کیونکہ وہ [illegible] چلی آرہی تھی۔ محبت کا وعدہ ٹل نہیں سکتا تھا۔ [illegible] کے مطابق وہ اس سے نکاح پڑھوانے آئی تھی۔

اس نے مسکرا کر بڑی محبت سے بیٹھے [illegible] سے [illegible] کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ محبت جب ہوتی ہے تو اچھا ہے کہ ہوتی رہے۔ چاہے جانے [illegible] کے [illegible] تک پہنچ جاتی ہے۔

[illegible] نے کہا۔ [illegible] محبت کی [illegible] سے۔ اس نے سوچا۔ اگر ان قیدیوں [illegible] نہیں بھی ہو تو دشمنوں سے [illegible] مقام سے [illegible] سکے گا [illegible] اچھا [illegible] ہے وہ قیدی [illegible] گیا ہے۔ اس طرح دشمنوں کے [illegible] بلکہ [illegible] حکومت طلبا و طالبات کی [illegible] سے رکھتی تھی [illegible] ماسکو گروپ کے کامریڈ متین کو [illegible] جانے [illegible] کے مطابق [illegible] شناختی پریڈ سے پہلے ہی [illegible]

شناخت ہو گئی لیکن دشمن اسے پہچاننے کے بعد بھی ہلاک نہ کر سکے۔"

خسرو نے مسکرا کر کہا: "محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔ سیاسی چالیں چل کر محبوب کی موت کا رخ پھیر دیتی ہے۔ کیا دونوں کی شادی ہو چکی ہے؟"

"قانوناً [illegible] نکاح نہیں پڑھایا جا سکتا لیکن وہ [illegible] کہاں [illegible] تو چھوڑ کر [illegible] ایک [illegible] مطالبے کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی۔ [illegible] محبت کا [illegible] نکاح پڑھا دیا گیا۔ مجھے یقین ہے [illegible] تو ان ہم [illegible] میں [illegible] موت سے بچا سکے گی۔"

[illegible]

ہم عورتوں کے کریکٹر پر سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ ہم افواہوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ سراسر زیادتی ہے کیونکہ ہم میں سے بہت سی عورتیں ایسی بھی ہیں جو افواہوں کو دہراتی نہیں، بلکہ ایجاد کرتی ہیں۔

خسرو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح نین تارا کو لے کر وہاں سے نکلے اور کس طرح ڈھاکہ پہنچ جائے۔ طاہر علی تھکا ہوا تھا، دیئے پر لیٹ گیا۔ وہ بھی سوچتے سوچتے ایک ستون سے ٹیک لگا کر اپنی مرضی کے خلاف سو گیا۔ جب ذہنی پریشانیاں ہوں تو وہ اپنی مرضی سے سو نہیں سکتا اور جسم تھکن سے چور ہو تو اپنی مرضی سے جاگ نہیں سکتا۔ جبلتِ انسانی کا حساب کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طبعی تک انسان اپنی مرضی سے [illegible] اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار سکتا۔

وہ [illegible] عالم میں خواب دیکھ رہا تھا۔ نین تارا کا ہاتھ پکڑے دشمن کی فصیلوں کو [illegible] ہوا ڈھاکہ کا راستہ بناتا جا رہا تھا۔ اچانک تیر سے دو [illegible] سنائی دی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ دیکھا سامنے [illegible] بنگال ٹائیگر کھڑا ہوا تھا۔ دنیا کے تمام شکاری [illegible] سیدرن [illegible] بنگال ٹائیگر کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ عام شیروں [illegible] بڑے بڑے نوکیلے دانتوں کو دیکھ کر [illegible] بڑی بڑی مونچھوں کے بیچ [illegible] شیروں کی طرح دہشت [illegible] منہ سیکھا ہے۔

[illegible] نے غصے سے دانت [illegible] ہوئے پوچھا: "کیا تم میری راہ سے [illegible] کرتے ہو؟"

"[illegible] سے محبت کرتا ہوں [illegible] سے محبت کرتا ہوں۔"

[illegible]

[illegible] سے دیوار بن [illegible]

[illegible]

[illegible] جیسے بہت [illegible] کے سامنے [illegible]

[illegible]

"دیکھو [illegible] کیوں ڈرتے ہو؟"

"جب ہمارے [illegible] بہت ساتھ تھے تو ڈر نہیں لگتا تھا۔ بعد میں مختلف [illegible] کہ یہ دو کیسے امپورٹ کئے گئے تھے [illegible] کیسے [illegible] سے لائے گئے تھے۔ صرف شاہین کا [illegible] اچھا تھا لیکن خالی جو حوصلہ کب تک ساتھ دیتا!"

شیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "جو حالت عین کی دی حالت عین کی دیکھو۔"

اس نے بڑے بڑے نوکیلے دانتوں کو منہ سے نکال کر سامنے رکھتے ہوئے کہا: "یہ بڑی دانت اُدھار لیے گئے تھے اور [illegible] کے بعد ہمیشہ سود کے ساتھ واپسی ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں سود میں اپنے اصلی دانت بھی نہ چلے جائیں۔"

پھر اس نے بڑی بڑی مونچھوں کو چہرے سے الگ کرتے ہوئے کہا: "یہ بھارت سے لائی گئی تھیں۔"

خسرو نے تعجب سے دیکھا۔ اب وہ رائل نہیں رہا تھا صرف بنگال ٹائیگر رہ گیا تھا۔ اب وہ برائے نام پنجے مار سکتا تھا مگر چبا نہیں سکتا تھا۔ مونچھوں پر تاؤ نہیں دے سکتا تھا۔ خسرو نے مسکرا کر یوں ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اُڑا رہا ہو۔ پھر وہ نین تارا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی: "خسرو! اے خسرو! تم یہاں ہو؟"

پھر کسی نے اس کے شانے کو جھنجھوڑا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ شیر تھا نہ دشمن فوجی اور نہ ہی اس نے نین تارا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ مسی رام کہہ رہا تھا: "میں تمہیں خالص پور اور خلنا شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا: "آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"تمہاری نندو دیدی نے تمہیں بلایا ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ ہندوستان نہیں جاؤں گا۔"

"ارے بھئی وہ ہندوستان سے واپس آگئی ہے۔"

اس نے خوش ہو کر پوچھا: "میری دیدی آگئی ہیں۔ پھر تو میں چلوں گا۔ ابھی چلوں گا۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے سر گھما کر نین تارا کو دیکھا پھر کہا: "لیکن دیدی سے ملنے کے بعد واپس آجاؤں گا۔"

"تم تو ایک دم بوکا (بیوقوف) ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہاری دیدی یہیں خالص پور میں ہے۔ نہیں وہ واپس ضرور آئی ہے۔ لیکن سید پور میں ہے۔ تمہیں سید پور جانا ہوگا۔"

"میں نین تارا کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"آخر وہ کون لڑکی ہے۔ اس میں کیا دھرا ہے۔ کیوں اس کے لیے دیوانے ہو رہے ہو۔ جانتے ہو میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا تو وہاں ویرانی تھی۔ پھر سوچا، شاید کھلنا گئے ہو۔ کھلنا کے الیکٹریکل گڈز کے تمام تاجروں سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہارا ان سے کاروباری تعلق ہے لیکن وہ بھی تمہارے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔ میں پھر یہاں تمہارے گھر کی طرف آیا۔ تمہارے پڑوسی سے ملاقات ہوگئی۔ تب معلوم ہوا کہ مختلف ہوکر یہاں پہنچ گئے ہو۔ ارے تم اچھا کماتے کھاتے تھے اب بھی تمہارے دن پھر جائیں گے۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

خسرو نے سوچتی ہوئی نظروں سے تلسی رام کو دیکھا۔ دماغ میں بات آئی کہ نین تارا کو صرف ایک لڑکی کہے گا تو بات نہیں بنے گی۔ لہٰذا اس نے کہا: "چچا جی! اس سے میری شادی ہو چکی ہے وہ میری بیوی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا: "یہاں آگ اور خون کا کھیل ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں ہوتا کہ وہ کب تک جیے گا [illegible] گا اور ایسی حالت میں تم نے شادی بھی کر ڈالی۔"

"میں مجبور تھا۔ اسی آگ اور خون کے کھیل میں اس کے ماں باپ مارے گئے۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ مجھے ہی اس کا سہارا بننا تھا اور یہ میرے دل کی بات تھی اس لیے میں نے اسے اپنی شریک حیات بنا لیا۔"

"بھئی جب تمہاری بیوی ہے تو وہ ہماری بھی عزت ہوئی.... تمہاری [illegible] کو بڑی خوشی ہوگی... اسے بھی ساتھ لے چلو۔"

اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ طاہر علی نے [illegible] موقع سے بھائی [illegible] کر یہاں سے نکل [illegible] سید پور [illegible] بہاریوں کی آبادی ہے۔ وہاں آرام سے رہو گے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر نین تارا کے پاس آیا۔ شاید محبت [illegible] انتظار کرتی ہیں۔ کوئی آنے [illegible] [illegible] [illegible] جیسے وہ مورت [illegible] سنگ مرمر کی مورت تھی۔ اتنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا ان آنکھوں میں [illegible] موتی کا [illegible]۔

خسرو نے [illegible] سے کہا: "دیکھو وہاں [illegible] ایک [illegible] تلسی رام [illegible] سے [illegible] میں نے ان سے جھوٹ کہہ دیا ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

"تم نے جھوٹ کیوں کہا؟"

"وہ مجھے یہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔ بھلا تمہیں کیا یہاں چھوڑ کر [illegible] ساری [illegible] کو ساتھ لے جائیں۔ جب میں نے رشتہ بتایا تو مجبور ہو گئے۔ کہنے لگے میری عزت ان کی عزت ہے۔ لہٰذا اب وہ تمہاری عزت کریں گے۔"

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"تم چلو، میں راستے میں بتا دوں گا۔ وہ دیکھو تلسی رام جی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

نین تارا نے اُدھر دیکھا۔ تلسی رام سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ حیا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ تلسی رام کا عجیب حال تھا۔ ایک ذرا نظریں ملی تھیں۔ ایک ذرا بجلی کوندی تھی۔ ایک لمحے کی ملاقاتی نظر تھی لیکن قاتل ثابت ہوئی تھی۔ تلسی رام دھپ سے زینے پر بیٹھ گیا جیسے قتل ہو گیا ہو۔

بنگالیوں اور مارواڑیوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ بنگالی غربت کی وجہ سے اور مارواڑی پیسے کی بچت کے لیے مچھلیاں کھاتے ہیں کیوں کہ بنگال میں مچھلیاں سب سے زیادہ سستی ہوتی ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں مچھلی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن یہ لوگ صبح کے ناشتے میں بھی مچھلیاں کھاتے ہیں۔ کوئی مہمان آ جائے تو [illegible] کے سامنے بھی مچھلیاں پیش کرتے ہیں۔ بیمار ہو تو دوا کے طور پر مچھلیوں کا تیل استعمال کرتے ہیں۔ بنگال کی آب و ہوا معتدل ہے لیکن مچھلی کی تاثیر گرم ہے۔ یہاں کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کا سبب مچھلیاں ہیں۔ یہ لوگ عورتوں کے معاملے میں [illegible] معتدل [illegible] کی غیرت [illegible] اعصاب پر [illegible] ہو جاتے

اچھی بیویاں

- جب بیوی [illegible] شوہر [illegible] [illegible] اس کے ننھے بچے کی نیند خراب ہوگی!
- ایک [illegible] اسے ہسپتال جانا پڑا [illegible] اس [illegible] بیوی کو [illegible]۔

اچھے شوہر

- ایک [illegible] بیوی کو [illegible] پر [illegible] گزر رہے تھے [illegible] پھٹ گئی [illegible] سائیکل [illegible] میں مصروف ہو گئے۔ [illegible] بیوی کی طرف دیکھا تک نہیں۔

بیوی جو [illegible] سے بولی "تمہیں مجھ سے زیادہ سائیکل پیاری ہے۔"

وہ بولے "گھر میں تمہیں اٹھا کر تو نہیں لے جا سکتے [illegible] رہا ہے۔"

[illegible] مصطفیٰ [illegible] کراچی

ریز سوڈا واٹر کی طرح ابلتے ہیں پھر دوسرے ہی لمحے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسا کہ تلسی رام [illegible] بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر دھوتی کی لانگ سنبھالتے ہوئے کہا: "معافی خسرو [illegible]"

خسرو کا پڑوسی تلسی رام کی مہمان نوازی کرتا ہوا کیمپ تک آیا تھا۔ اس نے خسرو کو کاغذ کا ایک چھوٹا سا بنڈل دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کچھ [illegible] رکھ لو۔ تمہارے ہیں۔"

پھر اس نے تارا کی طرف دو چھوٹی سی ڈبیہ بڑھاتے ہوئے کہا: "بھابی [illegible] اس میں ماتھے کے لیے بندیا رکھی ہوئی ہیں۔ جو بندیا پسند ہو۔ اپنے ماتھے پر لگا لیں اور مانگ میں سیندور بھر لیں۔"

برآمدے میں سونے والے جاگ گئے تھے۔ عورتیں قریب [illegible] تارا اور خسرو سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ کوئی جواب تو نہیں [illegible] دور کھڑے ہوئے تلسی رام کو اور اس کے ساتھ ایک مسلح فوجی کو دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں تارا تیار ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر [illegible] بندیا چمک رہی تھی۔ ماتھے پر سیندور [illegible] تھی۔ خسرو نے اس کی [illegible] پھر وہ [illegible] کے پیچھے چلتے ہوئے [illegible] آ گئی تلسی رام نے [illegible] دیکھا اور [illegible] ہوئے [illegible] ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "جی جی۔ یہ خسرو میرا سالا ہے۔ اس رشتے سے میں تم سے مسخری کر سکتا ہوں۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "جیجا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس بے چاری کے والدین قتل ہو [illegible] مارے گئے ہیں۔"

"وہ [illegible] کرنا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ چلو چلتے ہیں۔"

وہ [illegible] خسرو [illegible] تارا کو ساتھ لے کر چلنے لگا۔ مسلح سپاہی ان کے پیچھے تھا [illegible] عمارت کے [illegible] طرف [illegible] پر ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہی فوجی [illegible] تھے خسرو [illegible] اب وہ [illegible] روک [illegible] سکتے تھے۔ وہ [illegible] وقت تھا [illegible] بھارتی حکومت [illegible] دوست [illegible]

خسرو تارا کے ساتھ جیپ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تلسی رام بھی خسرو کے پاس آ کر بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور وہ پہاڑی گھاٹ کی طرف چلنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پچھلے دنوں موسلادھار بارش ہوتی رہی تھی۔ اس کے بعد بھی رم جھم جاری رہی۔ لیکن اب بادلوں کو دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ زبردست بارش ہونے والی ہے۔

چھ بجنے والے تھے لیکن سیاہ بادلوں کے باعث ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر تلسی رام بار بار تارا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں [illegible] نہیں [illegible] لیکن آدمی جسے دیکھنا چاہتا ہے اسے تاریکی میں بھی دیکھ لیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ حسن تاریکی میں [illegible] پرکشش ہو جاتا ہے۔

سڑکوں کے کنارے لیمپ پوسٹ تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں لیمپ روشن تھے۔ [illegible] تارا جیسے [illegible] کے سامنے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کبھی دور تک تاریکی میں چھپ رہی تھی۔ پھر کسی سٹریٹ لیمپ کی روشنی [illegible] نظر آتی تھی [illegible] یہ غلط ہے کہ عورت ادائیں دکھاتی ہے [illegible] ہے۔ یہ درست تھا کہ [illegible] جیپ [illegible] بیٹھی ہوئی تھی۔ [illegible] حالات [illegible] رہے تھے [illegible] تھے جیسے [illegible] انکشاف [illegible] جاتی ہے۔

جیپ کار ریلوے سٹیشن کے پاس آ کر رک گئی۔ پلیٹ فارم کی [illegible] پر ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ [illegible] ریلوے اسٹیشن [illegible] کا آخری سٹیشن تھا۔ اس کے بعد [illegible] چند قدم کے فاصلے پر ہی پہاڑی گھاٹ تھی۔ وہ سب جیپ سے اتر کر [illegible] ڈبے میں کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں [illegible] مارواڑی عورتیں بھی تھیں۔ تلسی رام نے کہا: "تم [illegible] میری نشست پر بٹھا دو۔"

"میں [illegible] خسرو [illegible] پوچھا [illegible] اکیلی نہیں بیٹھوں گی۔ تم بھی میرے ساتھ رہو۔"

تلسی رام نے [illegible] ان عورتوں کے درمیان محفوظ [illegible] میرے ایک دوست کی [illegible] ہے۔ یہ تمام عورتیں تمہارا خیال رکھیں گی۔"

خسرو نے [illegible] سامنے کسی [illegible] نشست [illegible] بیٹھے تو [illegible] ہے"

"ہاں [illegible] تمہاری جان سے کوئی [illegible] جانے تو سمجھو زندگی کی

مشکلات میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

خسرو نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "ہاں تارا، تم اس ڈبے میں بیٹھو، [illegible] جی ہماری بھلائی کے لیے مشورہ دے رہے ہیں۔ میں [illegible] قریب ہی کسی ڈبے میں بیٹھوں گا اور ہر اسٹیشن پر تمہاری خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔"

اس نے سمجھا بجھا کر اسے زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا۔

تلسی رام نے ہندو عورتوں کو مینا تارا سے متعارف کرایا اور اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ پھر مینا تارا کھڑکی سے سر نکال کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے خسرو سے باتیں کرنے لگی۔ تلسی رام کمپارٹمنٹ سے اتر کر پلیٹ فارم پر اس جگہ آیا جہاں چار سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ ایک سپاہی ٹرین کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ تلسی رام نے خسرو کے قریب آ کر کہا: "ابھی [illegible] ہے، اگلے اسٹیشن پر باتیں کر لینا۔ ٹرین چلنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب کام کی باتیں کر لو۔"

خسرو نے مینا تارا کو پھر ایک بار تسلی دی۔ اگلے اسٹیشن پر آنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد تلسی رام کے ساتھ چلتے ہوئے بولا: "آپ مجھ سے کس کام کی بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں کاروباری آدمی ہوں۔ تمہیں شادی [illegible] کے [illegible]۔ دوسروں [illegible] فائدہ بھی دیکھتا ہوں۔ تم یہاں سے [illegible] ہو گئے۔ اس میں ایک مال گاڑی کا ڈبہ [illegible] گاڑی [illegible] بند ڈبوں میں اناج کی بوریاں ہوتی ہیں۔ اب [illegible] تمہیں وہاں کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر [illegible] ملیں گے۔ یہ کاغذات سنبھال لو۔ اس میں تمہارا نام پتہ وغیرہ لکھا ہوا ہے۔ ان کاغذات کے مطابق تم اس مال گاڑی کے [illegible] ہو گے۔ اس میں جتنا اناج ہو گا، وہ سب تمہارا ہو گا۔ تم اس کے مالک رہو گے۔ سید پور پہنچنے کے بعد [illegible] کا بھائی وہ تمام اناج اپنی تحویل میں لے لے گا۔ [illegible] فروخت کرے گا اور [illegible] ایک ایک پیسے کا حساب ہو گا۔"

خسرو نے پوچھا: "[illegible] لیکن اس ٹرین سے آئے گا؟"

"ہاں، میں تو یہی کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن [illegible] ہندوستان کے [illegible] ہندوستان [illegible] ہندوستان کے [illegible] لے جانے کا مطلب ہے کہ وہ اناج [illegible] سید پور [illegible]"

"ہاں یہی بات ہے۔"

"لیکن ہندوستان میں خود اناج کی کمی ہے۔ کتنے ہی لوگ وہاں فاقے کرتے ہیں، پھر وہ [illegible]؟"

"[illegible]"

"دیکھیے! جو کام مجھ سے لیا جا رہا ہے، مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہونا چاہئیں۔"

"تم کوئی نادان تو نہیں ہو۔ کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان سے اناج اسمگل کر کے سید پور پہنچایا جائے گا۔"

خسرو نے شدید حیرانی سے کہا: "لیکن آپ تو ہندوستان کے وفادار ہیں اور آپ وہاں کا اناج اسمگل کر رہے ہیں؟"

تلسی رام نے ہنستے ہوئے کہا: "تم ایک دم بوکا (بیوقوف) ہو۔ کیا انگریزوں کے ملک میں انگریز، مسلمانوں کے ملک میں مسلمان اور ہندوؤں کے ملک میں ہندو اسمگلر نہیں ہوتے؟ دین دھرم ایک الگ سی بات ہے۔ حب الوطنی کو پڑھے لکھے جذباتی انسانوں کے لیے رہنے دو۔ ہم صرف اپنا منافع دیکھتے ہیں۔ میں یہاں سے کلکتہ کی ملوں کے لیے پٹ سن بھیجتا ہوں۔ بھارتی حکومت [illegible] اسمگل کرتا ہوں لیکن وہاں سے گیہوں، چنا اور سستے قسم کے چاول اسمگل کرتا ہوں۔ [illegible] اسمگلروں کی کوئی [illegible] نہیں ہوتی۔ کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ اس کے [illegible] میں [illegible] بیٹھ سکتا ہے۔ کچھ لوگ [illegible] نہیں چنتے بلکہ ہر ملک کے بادشاہ ہو گئے ہیں اور وہ ہم ہیں۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ کر پھر ٹرین کے اگلے حصے کی طرف جانے لگے۔ سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی۔ [illegible] تلسی رام کے ساتھ چلتا ہوا [illegible] عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے اس کی [illegible] بھی اور [illegible] خسرو [illegible] مطمئن [illegible]

[illegible]

میں نے اپنے تمام [illegible]

اس کا خطرہ ہے، [illegible]

[illegible] کو کس طرح ہینڈل کرنا ہو گا۔"

[illegible]

مجھے کیوں خواہ مخواہ پھنسا رہے ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو میرے ساتھ آپ بھی ڈوب جائیں گے۔

ہمیں کوئی کچا کھیل نہیں [illegible] بھی ہے [illegible] اس [illegible] سے دگر کے ساتھ [illegible] آدمی [illegible] تمھاری [illegible] کر کے [illegible] ساتھ [illegible] لے کر بس جاؤ۔

وہ [illegible]

[illegible] نہیں پہنچا سکتے۔

[illegible] سارا کام سنبھال لیں گے۔

[illegible] کرنے والے تھے۔ انھوں نے اسے اپنے درمیان بٹھا لیا اور [illegible] سے سلطان [illegible] طرف جانے لگا۔ اسی وقت [illegible] تھی۔ ٹرین چلنے ہی والی [illegible] کمپارٹمنٹ کے پاس آیا پھر کھڑکی سے [illegible] تمھارا خسرو ضد کر رہا ہے کہ تمھیں اپنے [illegible] اٹھاؤ اور چلو میں تمھیں اس کے کمپارٹمنٹ [illegible]

[illegible] سے کچھ کہا [illegible] گھبرا [illegible] فوراً ہی اٹیچی اٹھائی۔ [illegible] وہ [illegible] سیٹ [illegible] پیچھے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا: جلدی آؤ۔ گاڑی چلنے والی ہے۔

[illegible] رام کے پیچھے تقریباً دوڑتے [illegible] کلاس کے کمپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر [illegible] کا دروازہ کھولا۔ پہلے خود اندر گیا پھر [illegible] آ جاؤ۔ [illegible] کمپارٹمنٹ کے اندر [illegible] پھر خود [illegible] سے پہلے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟

وہ [illegible] رام نے ادھر ادھر دیکھا پھر مسکرا کر بولا: [illegible] میرے ہے۔ کیوں بھئی خسرو، تم [illegible] ہو؟

اندر سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی —— وہ کمپارٹمنٹ کے باہر تھی۔ کھنکارنے کی آواز اسے بھی سنائی دی لیکن اتنی دور سے [illegible] آواز کے فرق کو نہیں سمجھا۔ زیادہ سوال بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ [illegible] ٹوائلٹ کے اندر سے کوئی بات نہیں کرتا۔ جواب [illegible] کھنکارتا ہی ہے۔ [illegible] کے علاوہ ٹرین اب حرکت میں [illegible] کمپارٹمنٹ کے اندر آ گئی۔ وہ [illegible] خالی تھا۔ مینا [illegible] ٹوائلٹ کے دروازے [illegible] سیٹ پر بیٹھ گئی۔ تلسی رام نے دروازے [illegible] دیتے ہوئے کہا: باہر آ جاؤ۔ ٹرین چل رہی ہے۔

[illegible] آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر ایک [illegible] سپاہی نکلا [illegible] وہ فوراً ہی وہاں سے نکل کر [illegible] کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر گیا۔ پھر چھلانگ لگا [illegible] سے اتر گیا۔

[illegible] پہلے [illegible] سم سی سوچتی رہ گئی کہ ٹوائلٹ سے خسرو کے بجائے یہ کون نکل آیا تھا۔ جب وہ چھلانگ لگا کر نکل گیا تو [illegible] کھڑی ہو گئی۔ پھر گھبرا کر بولی: یہ کون تھا؟ وہ کہاں ہیں؟

تلسی رام نے ہنستے ہوئے کہا: یہ سپاہی تھا جو چلا [illegible] جب میں تمھارے ساتھ موجود ہوں تو اسے وہ کو [illegible]

[illegible] کہتے ہوئے [illegible] کمپارٹمنٹ کے دروازے کو بند کر [illegible]

[illegible] پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی لیکن مینا تارا کے لیے [illegible] کوئی راستہ نہیں رہا تھا البتہ دو راستے تھے۔ یا تو [illegible] کے لیے عزت کی قربانی دے یا پھر غنڈے سے بچنے کے لیے اپنے محبوب کو زور زور سے پکارے لیکن وہ کتنی دور [illegible] سکتی تھی۔ اس کا محافظ ٹرین کے اگلے حصے میں تھا اور یہ پچھلے حصے میں تھی۔

اس لمحے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دوڑ کر ٹوائلٹ میں جائے [illegible] دروازے کو اندر سے بند کر لے۔ یہ سوچتے ہی وہ ادھر دوڑی [illegible] تلسی رام دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا اور ٹوائلٹ کا دروازہ [illegible] قریب ہی تھا۔ وہ اس دروازے کو چھوڑ کر اس دروازے کے آگے دوڑ رہی تھی۔ مینا تارا پلٹ کر دوسرے دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ اسی وقت اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کی چوٹی صیاد کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور وہ ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی ٹرین کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز سے دل کی دھڑکنوں میں بج رہی تھی۔

وہ ترس سے آگے نکل گئی تھی اور اب نسرین رکنے والی نہیں تھی۔ بھلا اپنے اسٹاپ پر پہنچنے سے پہلے کیسے رک سکتی تھی، البتہ ممکن تھا زنجیر کھینچ سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی ستیا دے اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی تھی۔

وہ بے دریغ ہاتھوں سے اسے مارنے لگی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ چیخ چیخ کر کہنے لگی: مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔ اگر خسرو کو معلوم ہوگا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

وہ بڑے پیٹ والا سیٹھ تھا۔ زیادہ چلنے پھرنے سے ہانپ جاتا، دوڑنے، پھرتی دکھانے والا آدمی نہیں تھا۔ دن بھر ایک گدی پر بیٹھا رہتا تھا، یا گاڑی میں گھومتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ ذرا سی جدوجہد کے بعد ہانپنے لگا۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہنے لگا: میں تمہارے خسرو سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم میری بات سنو۔ نہیں تو میرے آدمی ایک اشارے پر خسرو کو گولی مار دیں گے۔

وہ ایک دم سے سہم گئی۔ جدوجہد بھول گئی۔ ستیہ رام نے پھر اسے نہیں چھوڑا۔ سمجھ گیا وہ چڑیا دام میں پھنس گئی ہے۔ وہ زیادہ پھڑپھڑائے گی پھر تھک جائے گی، ہار مانے گی۔ وہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت دے رہا تھا۔

نسرین کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھی جیسے مر رہی ہو۔ جو مجھے دھمکیاں دی جا رہی ہیں تباہی سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا، وہ بے عزتی کی ضد میں کیا ہوتا ہے، سکھ سے کر آدھا سہاگ۔ اور اس آدھے سہاگ کو بھی ظالم چھین لینا چاہتا تھا۔

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے کے قریب دیوار سے لگ گئی۔

اس نے ذرا سر گھما کر کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھا۔ باہر دن نکل آیا تھا لیکن اندھیرا اندھیرا سا لگ رہا تھا۔ کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ بادل تلسی رام کی طرح گرج رہے تھے مگر ابھی برس نہیں رہے تھے۔

وہ چشم زدن میں دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا سکتی تھی لیکن ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ڈرپوک تھی۔ اسے اپنے آپ سے بے انتہا محبت تھی۔ اور جو لوگ اپنی ذات سے محبت کرتے ہیں اور اس دنیا میں آخری سانس تک زندہ رہنا اپنا حق سمجھتے ہیں، وہ خودکشی نہیں کرتے۔

تلسی رام نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تمہیں چھوڑ دوں گا تو تم خسرو کو میرا کچا چٹھا سنا دو گی؟"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ میں دیوتا سمان تمہاری پوجا کروں گی۔ باپ سمان تمہاری عزت کروں گی۔"

وہ چیخ کر بولا "بکواس مت کرو۔ باپ ہوگا تمہارا کوئی اور۔ تم سب باپ لوگوں کو اس وقت کیوں نہیں بتاتیں جب وہ [illegible] کی بہو بیٹیوں کی عزت لوٹ رہے تھے۔ آج بھی ہماری عورتیں ہزاروں کی تعداد میں ایسی ہیں جو شرم سے اپنے [illegible] داستان کسی کو سنا نہیں سکتیں۔ جب تم بھی اس کمپارٹمنٹ سے باہر جاؤ گی تو شرم سے خسرو کو کچھ نہیں بتا سکو گی۔ اس طرح خسرو اور اس کی [illegible] کے سامنے میرا مان رہ جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا لیکن ڈگمگا گیا۔ گرنے سے پہلے اوپری برتھ کو تھام کر سنبھل گیا۔ اس وقت گاڑی دائیں سے بائیں لرز رہی تھی کیونکہ پٹریاں بدل رہی تھیں۔ کھٹ کھٹ کھٹ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ [illegible] نے فوراً ہی دیوار کی طرف پلٹ کر اوپری جانب ہاتھ بڑھایا [illegible] زنجیر کو پوری قوت سے کھینچنے لگی۔

زنجیر ڈھیلی تھی کھنچتی ہوئی اس کے سر تک آ گئی لیکن ٹرین کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف زنجیر ہی کی بات نہیں تھی۔ پچھلے ایک برس سے اس ڈسٹرکٹ میں اتنی توڑ پھوڑ ہوتی رہی تھی کہ ٹرین کے کمپارٹمنٹ صحیح سلامت نہیں رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے [illegible] کی کھڑکیاں تھیں [illegible] تھیں۔ دروازہ پوری طرح کھلتا تھا اور کسی کا کھلتا ہی نہیں تھا۔ جگہ جگہ [illegible] معمولی بات جو مسافروں کے فرار کے لیے نہیں کھلتی تھی مگر وہی سرحد اسمگلروں کے لیے کھل جاتی تھی۔ ان دنوں [illegible] کی حالت ٹھیک اس کمپارٹمنٹ کی طرح تھی۔

مینا تارا نے فوراً ہی دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر زور سے دبایا اور اسے کھولنے کی کوشش کی۔ [illegible] وہ زور زور سے ہینڈل کو جھٹکے دینے لگی۔ ابھی [illegible] کو پیٹنے لگی لیکن وہ فرار کے لیے نہیں کھل رہا تھا۔ یہ حماقت تھی۔ جب وہ خودکشی کرنا نہیں چاہتی تھی تو دروازہ کیوں کھول رہی تھی؟

وہ وہاں سے ہٹ کر دیوار سے لگ گئی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ دروازے کو کسی طرح کھولنا چاہیے۔ شاید کھلے ہوئے دروازے سے کوئی گزرتا ہوا اسٹیشن نظر آ جائے اور وہ مدد کے لیے پکارے تو لوگ اس کی مظلومیت کو سمجھ لیں۔

وہ دیوار سے لگے ہی لگے دوسرے دروازے کی طرف جانا چاہتی تھی۔ کھڑکی کے باہر ایک اسٹیشن تیزی سے گزرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس وقت تلسی رام جھپٹ پڑا...... وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ جھپٹنے والا دیوار سے آ کر ٹکرا گیا۔ اس وقت تک وہ نامعلوم اسٹیشن گزر چکا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسرے دروازے تک آئی۔ اس کے ہینڈل کو پوری قوت سے دبایا تو وہ کھل گیا۔ اس کے کھلتے ہی پھر ٹرین پٹریاں بدلنے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے باتھ روم کے دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازہ پوری طرح کھل گیا تھا۔ ادھر تلسی رام نے دیوار سے پلٹ کر اس پر جھپٹنا چاہا تھا۔ ٹرین اس طرح پٹریاں بدل رہی تھی۔ ڈبے اس طرح دائیں بائیں ہل رہے تھے کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ تیزی سے آگے بڑھنے والا اپنے بڑے سے پیٹ کے باعث خود کو نہ روک سکا۔ اپنا بوجھ اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر گیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن وہ ہینڈل کو پکڑ کر سنبھل چکا تھا لیکن یوں گرا ہوا تھا کہ آدھا کمپارٹمنٹ کے اندر تھا اور آدھا باہر۔

کھٹ کھٹا کھٹ۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز گونجتی جا رہی تھی۔ جو بے گنتی پٹریاں تھیں کہ ٹرین ایک سے دوسری پر جا رہی تھی۔ گرنے والے کو جھٹکے پر جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس لیے تلسی رام کی نگاہوں کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی کتنی قیمتی ہے اور موت کتنی ظالم۔

[illegible] گرنے سے پہلے بے اختیار ہینڈل کو تھام لیا تھا لیکن اس کا سارا بدن لٹک رہا تھا۔ جسم سے جان نکلی جا رہی تھی۔ دہشت ایسی طاری تھی کہ ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ رہا تھا۔ وہ چیخنے لگا "بچاؤ... [illegible] مجھے پکڑو... میں گر پڑوں گا..." [illegible] ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ گیا۔

ایک ساعت کے لیے جیسے وقت رک گیا۔ [illegible] جیسے سناٹا [illegible] ساعت میں پتہ چلا ابھی [illegible] جس دروازے کے باہر وہ لٹک رہا تھا مینا تارا نے اس دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرنا چاہا تھا۔ [illegible] وہ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان پھنس گیا۔ اسے موت سے

آدھا اور زندگی نے آدھا اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ابھی تقدیر نے تو ابھی موت سے رہائی دی تھی نہ زندگی حیات کا مژدہ سنا رہی تھی۔

مین تارا نے اسے اذیت پہنچانے کے لیے اور اس سے انتقام لینے کے لیے دروازے کو پوری قوت سے دبوچ رکھا تھا تاکہ وہ وہاں دب کر مر جائے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں سے ہینڈل چھوٹ گیا ہے اور وہ فضا میں ہاتھ جھٹک رہا ہے۔ ادھر سے ادھر سہارے کے لیے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے یعنی اب وہ دروازہ کھول دیتی تو وہ باہر کی طرف چلا جاتا۔

لیکن وہ دروازہ کھول نہ سکی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی مردوں کو عورتوں کو بچوں کو بوڑھوں کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھا تھا۔ تڑپ تڑپ کر گڑگڑا گڑگڑا کر انھیں رحم کی التجا کرتے سُنا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی دروازے کے باہر تلسی رام آدھا موت کی گود میں تھا اور آدھا مین تارا کے اختیار میں رہ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ نہ خود مرنا چاہتی تھی نہ کسی کو مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ اپنا نفسیاتی تجزیہ کرو کیوں ایک دشمن کے لیے رو رہی ہو تو وہ اپنا تجزیہ آپ نہیں کر سکتی تھی۔ بہت گہری نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ ایک شریف انسان تو دشمن سے ڈرتا ضرور ہے لیکن دشمن کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے کے دوران اس کے تڑپنے کا منظر دیکھتا ہے تو جیسے خود کو تڑپتا ہوا محسوس کرتا ہے اور شاید اس لیے مین تارا بھی خود کو تلسی رام کی جگہ تڑپتے ہوئے اور مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اس لیے اپنی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ تلسی رام کو ذرا سی مہلت ملی تھی۔ اس دوران اس نے دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف کے ہینڈل کو تھام لیا تھا۔ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ کھڑکی کے پاس مین تارا کھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ہینڈل بڑی مضبوطی سے تھامے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر مین تارا نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ بڑی مشکلوں سے کراہتا ہوا تکلیف سے گھسٹتا ہوا اندر آیا لیکن وہاں سے اٹھ نہ سکا۔ وہیں دروازے کے پاس فرش پر سر جھکا کے بیٹھ گیا۔

وہ وہاں سے دور دوسرے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سانپ پھر سانپ ہوتا ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیوں رو رہی ہے۔ اگر تلسی رام کی موت کا تماشا دیکھنا نہیں چاہتی تو وہ اب زندہ سلامت تھا۔ اگر یہ عزت کے لیے رو رہی تھی کہ دشمن بے دست و پا شکست خوردہ انداز میں سر جھکائے فرش پر بیٹھا تھا۔ ہتھیار ڈالنے والا سپاہی کبھی حملہ نہیں کرتا۔ پھر وہ کیوں رو رہی تھی؟

آدمی کب روتا ہے؟ جب پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے۔ کانٹا نکل جائے تو خوش ہونا چاہیے لیکن وہ اور روتا ہے کیونکہ دکھ کانٹا چبھنے کا نہیں ہوتا، دکھ اپنے ننگے پاؤں کا ہوتا ہے۔ پاؤں کب تک ننگے رہیں گے؟ کب تک سفر جاری رہے گا؟ اور حالات ایسے تھے کہ ہر قدم پر جوتے مارنے والے تھے۔ ننگے پاؤں کو جوتا پہنانے والا کوئی نہیں تھا۔

اس نے روتے روتے ذرا نظر اٹھا کر تلسی رام کو دیکھا۔ وہ اسی جگہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ جیسے اس کے سامنے کوئی دیوی کھڑی ہو اور وہ اسے بڑی خاموشی سے پوج رہا ہو۔ اس وقت گاڑی پھر پٹریاں بدل رہی تھی۔ انسان بھی کتنی پٹریاں بدلتا رہتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے کیا تھا، ایک لمحہ بعد کیا ہو جاتا ہے۔

گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ اب وہ کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میرے دھرم میں سانپ کو دودھ پلایا جاتا ہے مگر سانپ پھر سانپ ہی رہتا ہے۔ میں بھی سانپ تھا مگر تمہاری ممتا نے مجھے آدمی بنا دیا۔ جو عورت سانپ کو انسان بنا دے وہ دیوی کا اوتار ہوتی ہے!"

ایسا کہتے ہوئے وہ جھکتا چلا گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے ماتھے کو زمین پر ٹیک دیا۔ مین تارا کے سامنے جھک گیا۔ وہ اس سے بہت دور کھڑی تھی پھر بھی سامنے سے ہٹ گئی۔ انسان کو انسان کے سامنے سجدہ نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ اس کے دھرم، اس کے عقیدے کی بات تھی اور وہ اپنے عقیدے کی آنکھ سے پتھر میں بھگوان کا اور کسی شریف زادی میں دیوی کا روپ دیکھ سکتا تھا کوئی کسی کو کسی کے عقیدے سے نہیں روک سکتا ہاں اس کے عقیدے سے ہٹ سکتا ہے۔ اس لیے وہ ہٹ گئی تھی۔

گاڑی رک گئی۔ تیز رفتاری کا شور تھم گیا۔ وہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ ایک گہرا سناٹا چھا گیا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی آہٹ سن سکتی تھی۔ خسرو نے وعدہ کیا تھا، ہر اسٹیشن پر آ کر اس کی خیریت معلوم کرتا رہے گا۔ وہ چاہتی تو دروازہ کھول کر باہر نکل سکتی تھی لیکن اب تلسی رام سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تو خواہش کی بات تھی کہ اس کا محبوب وہاں سے ڈھونڈتا آتا۔ اب یا نہیں؟

وہ آ رہا تھا۔ دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ

دوسرے کی کھڑکی سے سر نکال کر دیکھنے لگی۔ خسرو ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے دور ہی سے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ پھر اس کمپارٹمنٹ سے آگے بڑھ کر دوسرے کمپارٹمنٹ کے سامنے بھی اسے آواز دینے لگا۔ اس کے بعد وہ تیسرے کمپارٹمنٹ کی جانب بڑھنا چاہتا تھا پھر اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے آنے لگا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ خسرو نے دروازے کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا: میں نے تمہیں ان مارواڑی عورتوں کے درمیان چھوڑا تھا۔ وہ عورتیں تو یہی کہتی تھیں کہ تمہارے بھائی تمہیں وہاں سے لے گئے تھے مگر۔۔۔

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر مسی رام پر پڑ گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر جھکائے اسی طرح فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے حیرانی سے پوچھا: حاجی کیا ہو گیا، آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں، کیوں رو رہے ہیں؟ وہ خیالی سے پوچھ رہا تھا اور بار بار دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہینڈل کو جھٹکے دے رہا تھا۔ اس سے پہلے مین تارا نے بھی زور لگا کر اسے کھولنا چاہا تھا لیکن وہ بند رہا۔ آخر وہ کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔ اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا مسی رام کے پاس آ کر فرش پر دو زانو ہو گیا۔ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: کیا بات ہے؟

وہ شرمندگی سے مرا جا رہا تھا۔ ندامت سے سر جھکا رہا تھا۔ خسرو نے پھر پوچھا تو وہ کچھ کہنے لگا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ گاڑی کی کھٹ کھٹ کھٹ کا شور بلند تھا۔ خسرو کان لگا کر سننے لگا۔ جو باتیں وہ سن رہا تھا وہ باتیں انگاروں کی طرح کانوں میں جل رہی تھیں۔ وہ کبھی کمزوری سے اسے دیکھتا تھا کبھی ہمدردی اور محبت سے مین تارا کو دیکھنے لگتا تھا۔ کبھی یوں پہلو بدلنے اور مٹھیاں بھینچنے لگتا تھا جیسے دوڑ جائے گا اور سامنے والے کو مار ڈالے گا۔ پھر وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ حالات سمجھاتے تھے کہ باتیں ہو گئیں مگر مجھے کسی سے بیر نہیں رکھنا چاہیے۔

وہ بڑی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر مین تارا کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ وہ دوسرے دروازے کے پاس دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ کھڑکی کے باہر تیزی سے مناظر گزرتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا: اس شخص کو حماقتی کہنے کو دل نہیں چاہتا لیکن جو ندامت سے چور ہو اُسے اور زیادہ شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ جو لوگ نصیحتیں سن کر راہِ راست پر آتے ہیں وہ کبھی بہک بھی جاتے ہیں لیکن جو نادم ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں وہ دوبارہ کبھی وہی غلطی نہیں کرتے۔

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ بھلا وہ کیا بول سکتی تھی۔ خسرو نے کہا: تم نے کمال کر دیا۔ دشمن کو نئی زندگی دے کر دوست بنا لیا۔ تم نے حسنِ سلوک کی ایسی بہترین مثال قائم کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔۔۔ یعنی کہ میرا مطلب ہے خوشی سے میرا دل مچل رہا ہے۔

وہ منہ چھپا کر دیوار کی طرف گھوم گئی۔ خسرو نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: مگر میں بہت دور کی سوچتا ہوں۔ جب کہ نزدیک رہ کر تمہارا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکتا۔ تم نے منع کیا ہے۔

مین تارا کے سینے سے دبی دبی سی آہ نکلی۔ اس نے دل میں کہا: ہاں، میں نے منع کیا تھا۔ فیصلہ کیا تھا کہ مصائب کے اندھیروں میں بھی اپنا ہاتھ تمہیں پکڑنے نہیں دوں گی۔ مگر سوچتی ہوں تو مجھے یہ ہاتھ ان کے قبضے میں نظر آتا ہے۔

اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نظر آئے تو یہ محبت کی ابتدا ہوتی ہے اور دوسرا ہاتھ کسی کے قبضے میں نظر آئے تو محبت کی انتہا ہو جاتی ہے۔ وہ شرما گئی۔ توبہ ہے! یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ ابھی مجھ پر قیامت گزر رہی تھی۔ خسرو کے آتے ہی سب بھول گئی۔ یہیں بھی یاد رہ جاتے ہیں:

اس نے کہا: برتھ پر بیٹھ جاؤ۔ کب تک کھڑی رہو گی؟

وہ منہ چھپائے کھڑی رہی۔ خسرو نے کہا۔ نہیں بیٹھو گی تو مجھے ہاتھ پکڑ کر بٹھانا ہوگا۔

وہ جلدی سے سمٹ گئی۔ پھر اس سے کتراتے ہوئے آگے بڑھ کر مسی رام کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے برتھ پر بیٹھ گئی۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے لگی تو مسی رام نے فرش پر سے اٹھ کر کہا: میں دوسرے کمپارٹمنٹ میں جا رہا ہوں۔ جب تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمام راستے تمہارے حوالے کرنے کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ تم دونوں اسی کمپارٹمنٹ میں رہو۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ کوئی تم دونوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

گاڑی رک گئی۔ وہ کمپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ خسرو نے دروازوں کو اندر سے بند کیا۔ کھڑکیاں بھی بند کر دیں۔ باہر کا منظر گم ہو گیا۔ صرف آواز سے پتا چلا کہ ٹرین چلنے لگی ہے۔ وہ بڑی دیر تک اپنی جگہ چپ رہے۔ پھر مین تارا نے کہا: تم رات بھر جاگتے رہے ہو اب سو جاؤ۔

تم بھی سو جاؤ۔ یہ کمپارٹمنٹ اندر سے بند ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اوپری برتھ پر چلی جاؤ۔

مجھے اتنی سی جگہ میں سونا نہیں آتا۔ اوپر سے گر پڑوں گی۔

اچھا تو اس برتھ پر سو جاؤ۔ میں اوپر چلا جاتا ہوں۔

وہ اوپر جا کر لیٹ گیا۔ مین تارا نے اٹیچی سے چادر نکالی۔ اسے تکیے کی طرح سرہانے رکھا پھر اوپر دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا: ایسے تو میں سو نہیں سکوں گی۔

اچھا وعدہ کرتا ہوں، اب نہیں دیکھوں گا۔ دوسری طرف منہ

پھیر کر سو جاؤ بھئی۔"

اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اب اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن نظریں بار بار اوپر جا رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ پھیر کر سو جانے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سودا [illegible] پوری کر دی ہو اور اب اس مسافر سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ خسرو نے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا: "کیا تم سو رہی ہو؟"

"نہیں تو۔"

اپنے قریب اس کی آواز سنتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے قریب دیکھ کر وہ ذرا حیران ہوا اور [illegible] پھر اس نے پوچھا: "تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

"میں رات کو دیر تک سوتی رہی۔ تم بیٹھے [illegible] اپنے بازو کا سہارا بنا رکھا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا: "[illegible] کسی کا ہو [illegible] ہو تو جلدی نیند آ جاتی ہے۔"

وہ جلدی سے منہ پھیر کر [illegible] کے دوسرے [illegible] چند لمحوں بعد اس نے جھک کر اپنی [illegible] اٹھائی۔ پھر سے خسرو کے سرہانے رکھ دیا: "چلو اب لیٹ جاؤ۔"

وہ بھی [illegible] لیٹ گیا۔ "میں تمہارے [illegible] دیکھ رہی ہو، ادھر منہ کر لو۔"

اس نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ خسرو نے [illegible] ایک دم سے پوچھا: "کیا تم بیٹھی ہو؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اپنا نکاح ہونے [illegible] سامنے اس کے وجود کو [illegible] سنجیدگی سے دیکھتی رہی۔ جو اپنے قدموں جیسے ہونے [illegible] کے [illegible] سے [illegible] تھی۔ اس کے بھی پاؤں [illegible] تھے۔ دونوں قدموں کے پاس [illegible] حیرت [illegible] لگائے [illegible] پیچھے [illegible] نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اس کے پاؤں کی طرف آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھانے لگی۔ [illegible] پاؤں کے قریب [illegible] پھر وہ ٹھٹک گئی۔ [illegible] کے کام نہیں [illegible] پیسے کا وہ تھکا ہوا ہے۔ تم کیا [illegible] ہے۔ اس کا [illegible] ہو گا۔

یہ سوچتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ چونک گیا۔ [illegible] دیکھے۔ [illegible] چھوڑ کر وہ سو جانے کی [illegible] نے لیٹے ہی لیٹے کہا: "یہ عجیب سی بات ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میں ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں، تم انکار کرتی ہو لیکن میرے پاؤں پکڑ رہی ہو۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے پاؤں دباتی رہی۔ پھر اس نے جواب دیا: "میں نے آپ کو قبول کیا ہے۔ میں آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "[illegible] جس طرح تمہارے والدین کی وفات ہوئی وہ منظر تم کبھی بھلا نہ سکو گی۔ یہ صدمہ ساری زندگی رہے گا لیکن زندگی گزارنے کے لیے زندگی کی خوشیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چالیس دن کے بعد میں بھی تمہیں قبول کر لوں اور تمہیں اپنا لوں؟"

وہ کہہ رہا تھا اور [illegible] پاؤں دباتے ہوئے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے ہی جسموں کے درمیان [illegible] گولیوں سے چھلنی ہو کر [illegible] پرچم کے سامنے [illegible] گر رہے تھے [illegible] ہیڈکوارٹر کا [illegible] کے ساتھ ہی [illegible] میں اچھل پڑیں۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ نظر نہیں آیا۔ فضا میں دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا۔

[illegible] آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتی [illegible] اگر [illegible] تو نکاح قبول کرتے ہی [illegible] ایک [illegible] دن میں [illegible] ہوئی تھیں لیکن [illegible] کے لیے صرف افسوس [illegible] صدمہ [illegible] گہرائی میں تھا اور اسی گہرائی میں خسرو کا پیار بھی تھا۔ یعنی جہاں ماتم تھا وہیں پیار کی شہنائی بھی بجنا چاہتی تھی۔

ٹرین اپنی رفتار کے ساتھ [illegible] لہرا رہی تھی۔ [illegible] کے درمیان [illegible] آواز گونج رہی تھی۔ [illegible] محسوس [illegible] نہیں ہوتا [illegible] ستاروں [illegible] اس پر سے [illegible] کا ایک [illegible] گزرنا چاہیے۔

◆

پارٹی [illegible] ایک [illegible] بازار حسن میں [illegible] اپنے گھر کے دروازے ہی کھولا ہی تھی کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ اس کے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں پھٹے پرانے جوتے تھے، بدن پر ایک [illegible] سی شرٹ تھی، بال بکھرے ہوئے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے [illegible] جھلک رہی تھی۔

وہ باہر کھڑے ہی کھڑے کھلے دروازے سے اندر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی جیسے کچھ دیکھ [illegible]۔ پھر اس کی آنکھیں بار بار جھکنے لگیں جیسے من کی مراد پانے والا ہو۔

سوما کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی دوسرا دروازہ تھا۔ وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے سے ایک چولہا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ سوما دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہاں گئی۔ پھر ساڑی کے آنچل سے گرم گرم ہانڈی کو چولھے پر سے اتار دیا۔ لکڑی پر پھونکیں مارتے ہوئے آگ [illegible] اور باہر کھڑے ہوئے شخص کو [illegible] کر کے غسل کرنے چلی گئی۔

غسل سے فارغ ہو کر اس نے اس کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ بجھا ہوا چولھا نظر آ رہا تھا۔ ابھی تک وہاں تھوڑا سا دھواں اٹھ رہا تھا لیکن چولھے کے پاس بھی ہانڈی نہیں تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے چولھے کے پاس آئی۔ آس پاس کہیں بھی ہانڈی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا وہ بھوکا ہانڈی اٹھا کر لے گیا ہے؟

وہ دوڑتے ہوئے باہر ڈیوڑھی پر آئی۔ مگر اب وہ وہاں نہیں تھا۔ ہانڈی لے کر بھاگ جانے والا اب کیسے نظر آتا لیکن وہ اسے دیکھنے نہیں آئی تھی۔ اپنی ڈیوڑھی سے لگ کر رونے آئی تھی۔ اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنی ڈیوڑھی سے یوں لپٹ گئی تھی جیسے بدنصیبی کے گلے لگ کر رو رہی ہو۔

وہ ہانڈی لے کر بھاگ رہا تھا۔ چاند کبھی سیاہ بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ کبھی روشنی دکھاتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اسٹیشن یارڈ پر آ گیا۔ وہ ہوا رنگپور کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس سے [illegible] خوشبو [illegible]۔ پھر ادھر جانے لگا۔ جدھر لوکو شیڈ تھا۔ [illegible] اس کے بعد وہ کہیں بھی بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ بھوک مٹا سکتا تھا لیکن [illegible] اس کے پیچھے بھوکے کتے آ رہے تھے۔ دوڑنے کے دوران وہ رکتا تھا پھر کوئی پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکتا تھا۔ کتے وقتی طور پر پسپا ہو جاتے تھے۔ پھر اس کے بھاگنے پر اس کا پیچھا کرنے لگتے تھے۔ وہ ضعیف [illegible] سال [illegible] بھوک اور کمزوری کے باعث کہیں گر جانا چاہتا تھا۔

کوئی دور دور تک پوچھنے والا نہیں تھا کہ کون بھاگ رہا ہے؟ اور کتے کس کا پیچھا کر رہے ہیں؟ وہ چھوٹا سا شہر تقریباً ویران ہو چکا تھا۔ لوکو شیڈ کے قریب دور تک [illegible] ریلوے کے کوارٹرز ویران پڑے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ایک کوارٹر کے اندر گھس جائے گا اور دروازے کو اندر سے بند کر لے گا۔ پھر کتے سینگ آزمائیں گے۔ صرف کتوں کی بات نہیں تھی۔ اس ویرانے میں رات ہوتے ہی گیدڑ بھی منحوس آواز سنانے چلے آتے تھے اور اکا دکا آدمی پر حملہ بھی کرتے تھے۔ خطرہ انسانوں سے بھی تھا، خطرہ جانوروں سے بھی تھا لیکن جانوروں سے کم تھا۔

وہ رک گیا۔ بری طرح ہانپنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب تب میں گر پڑے گا۔ کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ اس کے آگے پیچھے ریلوے لائن کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت [illegible] کے سب سے بڑے ریلوے یارڈ میں کھڑا ہوا تھا... پارٹیشن سے پہلے ریلوے یارڈ تقریباً چھ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک مال گاڑی اس کے سامنے سے شنٹنگ کرتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ ہانڈی تھامے کسی طرح ہانپتے کانپتے، لڑکھڑاتے ہوئے لائن کو پار کرتے ہوئے اس گاڑی کی طرف جانے لگا۔ مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے گاڑی کا آخری ڈبہ آ گیا۔ اس نے اس کے ساتھ دوڑ لگا دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے پہلے ہانڈی رکھی پھر اچک کر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ کوشش کر رہا تھا اور کوشش کبھی ناکام بھی ہوتی ہے۔ وہ ہاتھوں کے بل لٹک کر اوپر چڑھنا چاہتا تھا لیکن طاقت جواب دے رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ابھی تک وہ پلیٹ فارم پر ہی ہوا تھا اور کم بخت کتوں نے [illegible] اپنا راستہ [illegible] سمجھ لیا تھا۔ وہ آخری ڈبے کے ساتھ ساتھ دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب تب میں وہ گر پڑے گا اور [illegible] تو شاید اس ڈبے کے نیچے آ جائے گا۔ اس نے آخری بار اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ پھر اس نے آخری بار ہانڈی کی طرف دیکھا۔ خیال آیا گرنے کے بعد شاید زندہ رہ سکے اور [illegible] کا آدھا پیٹ بھوک مٹے گی۔ [illegible] اس نے گرتے گرتے ہانڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ گرتا، ایک ہاتھ ہانڈی کی طرف پہنچا۔ کسی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

شنٹنگ کرنے والی گاڑی ایک لائن سے دوسری لائن پر جا رہی تھی۔ پٹریاں بدلنے والی لائن میں دو دو پٹریوں کے درمیان سگنل لائٹ جیسے کھڑی ہوتی تھی۔ لائٹ بھی مدھم تھی اور لائن مین بھی بوڑھا تھا۔ اتنی دور سے وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا ——— ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ سہارا ملتے ہی وہ زور لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ ہاتھ کھینچنے والے نے بھی اپنا زور دکھایا۔ پھر وہ ڈبے کے اندر آ کر گر پڑا۔

گاڑی چلی جا رہی تھی۔ اندر تاریکی تھی۔ ڈبے کے دونوں طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کبھی چاندنی اندر آتی تھی، کبھی گم ہو جاتی تھی۔ چاندنی آنکھ مچولی کے دوران اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک قد آور شخص کو دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر

کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہانڈی کو اپنی طرف رکھتے ہوئے پوچھا بھی کہ، (تم کون ہو؟)

اس نے ہانڈی کی طرف لپکتے ہوئے کہا: "اے شا امار (یہ میری ہے) میں بھوکا ہوں۔"

اس نے ہانڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے نے اس کے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا: "میں بھی بھوکا ہوں۔ پہلے میں کھاؤں گا۔ بچے گا تو تم کھاؤ گے۔"

[illegible] کھڑا ہوا تھا۔ ہانڈی [illegible] اچانک ہی اس کے گھسے کے پیچھے ایک [illegible] کا ہاتھ مارا۔ وہ یہ توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے قریب ہی گر پڑا۔ وہ دونوں تو [illegible] بیٹھے تھے کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی دوران [illegible] کو پتہ چل گیا کہ انسان جب یہ ہو، شدید بھوک کی حالت میں سب ہی درندے بن جاتے ہیں اور اپنی نوالہ تک پہنچنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

وہ لڑتے ہوئے اور لڑھکتے ہوئے ڈبے کے ایک کونے کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک نے کہا: "امار نام کلیم ہے بھوجیا (میرا نام کلیم الدین بھوجیاں ہے) جب میں چوری کر سکتا ہوں تو چھین کر کھانا بھی جانتا ہوں۔"

دوسرے نے اس کے سر پر گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا: "میرا نام سکندر حیات ہے۔ میں بھوک کے [illegible] نہیں کرتا [illegible] ہوں۔"

کلیم الدین بھوجیاں نے اسے دونوں ٹانگوں پر پکڑ کر [illegible]

[illegible]

اگلا مصرعہ

[illegible] کی محفل جمی تھی۔ داغ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ایک شاگرد نے ترنگ میں موزوں کر ایک مصرعہ کہا تھا۔

شراب رنگ پہ ڈالی کباب شیشے میں

[illegible]

[illegible]

[illegible] شیشے میں

● [illegible] محمد کراچی

گاڑی پھر چلنے لگی تھی۔ ڈبا پھر اس کے ساتھ رینگ رہا تھا لیکن اب اس ڈبے کا بفر دوسرے ڈبے کے بفر سے بار بار ٹکراتا جا رہا تھا۔ شنٹنگ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ سکندر حیات نے کہا۔

"میں مانتا ہوں۔ تم بھی دلیر ہو۔"

"تم بھی مجھ سے کم نہیں ہو۔"

"اگر ہم لڑتے جھگڑتے رہے اور کوئی تیسرا آگیا تو وہ بھی حصے دار بن جائے گا۔"

"دو بلیوں کے لڑنے سے ہمیشہ بندر کا بھلا ہوتا ہے۔"

"کیوں نہ ہم سمجھوتا کر لیں۔"

کلیم الدین بھوجیاں نے کہا: "میں پہلے ہی سمجھوتا کر سکتا تھا لیکن تم نے حاکم بن کر کہا کہ پہلے تم کھاؤ گے اور جھوٹا مجھے دو گے۔ بس مجھے غصہ آگیا۔"

"غصہ تھوک دو اور ہاتھ ملاؤ۔"

دونوں نے تاریکی میں ٹٹول کر مصافحہ کیا پھر وہاں سے اٹھتے ہوئے ادھر گئے جدھر انھوں نے ہانڈی رکھی تھی۔ ریلوے لائن سے دور [illegible] کہیں ٹوٹے ہوئے تھے کہیں بجھے ہوئے

تھے اور کہیں کہیں روشن ہو جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے کے بعد شہروں میں، قصبوں میں، دیہاتوں میں مرگھٹ سی تاریکی آئی تھی۔ کہیں کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ جاندار اور بے جان دونوں ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ وہ دونوں رینگتے ہوئے ہانڈی کو تلاش کر رہے تھے اور تاریکی میں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک اس ویگن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ دونوں اوندھے منہ گر پڑے۔ اب وہ مال گاڑی کا ڈبہ شنٹنگ کرنے والی گاڑی سے الگ ہو گیا تھا اور سہارے سہارے پٹری پر دوڑتا جا رہا تھا۔ آگے پلیٹ فارم کے ایک بلب سے روشنی دکھائی۔ دونوں طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، ہانڈی غائب تھی۔

کیسے غائب ہو گئی؟ وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ ہانڈی اس ڈبے کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ جھٹکا لگنے سے وہ لڑھک کر باہر چلی گئی ہوگی اور اگر لڑھکتی تو ہانڈی کا کھانا وہیں گرا ہوا نظر آتا لیکن۔ کھانا گرا تھا نہ ہانڈی تھی۔ پھر وہ کہاں چلی گئی؟ سکندر نے پوچھا: کیا لڑتے وقت تم ہانڈی سے ٹکرائے تھے؟

"نہیں، بالکل نہیں۔ کیا تم ٹکرائے تھے؟"

"میں بھی نہیں ٹکرایا تھا۔ جب ہماری ٹکر نہیں لگی۔ ہماری ٹھوکر نہیں لگی۔ وہ ہانڈی کہیں گری نہیں تو پھر کہاں چلی گئی؟"

وہ سوچنے لگے۔ بلب کی روشنی کا انتظار کرنے لگے۔ گاڑی کسی روشنی کے سامنے سے گزرتی تو وہ ایک بار پھر غور سے دیکھ سکتے تھے۔ روشنی میں ویگن کے اندر دور تک دکھائی دیتا تھا پھر بھی ویگن کا کچھ حصہ تاریک رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد روشنی قریب آنے لگی۔ وہ دونوں طرف کے ایک ایک دروازے کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور گھور گھور کر ویگن کے اندر دیکھنے لگے۔ روشنی قریب آتی گئی۔ ویگن کا اندرونی حصہ روشن ہوتا گیا پھر وہ حصہ تو بالکل ہی روشن ہو گیا جہاں انھوں نے ہانڈی رکھی تھی اور جہاں سے ان کی لڑائی کا آغاز ہوا تھا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر ہانڈی گم ہو چکی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

مال گاڑی کا وہ ڈبہ روشنی کے سامنے سے گزر گیا۔ گزرتی ہوئی روشنی میں دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر کلیم الدین بھوپالی نے پوچھا: "کیا تم بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو؟"

سکندر نے جواب دیا: "میں بھوک کے سوا کسی پر یقین نہیں کرتا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہمارے کھانے کی ہانڈی کوئی بھوت اٹھا کر لے گیا ہے۔ بھوک صرف انسانوں کو لگتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کے علاوہ اس ڈبے کے اندر کوئی تیسرا بھی ہے۔"

کسی اور کی موجودگی کا امکان ہے یا نہیں۔ وہ اس مسئلے پر غور کرنے لگے۔ پھر کلیم الدین بھوپالی نے کہا: "جب میں یہاں آیا تو مجھ سے پہلے تم موجود تھے۔ اب تم ہی بتا سکتے ہو کہ تم سے پہلے یہاں کوئی موجود تھا اور اب بھی موجود ہے یا نہیں؟"

سکندر تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ پھر اس نے کہا: "جب میں یہاں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں چپ چاپ اس ڈبے کے اندر بیٹھ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور نڈھال بھی تھا۔ یہاں پہنچتے ہی بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ میری آنکھ کب لگ گئی۔ مجھے پتہ نہ چلا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب یہ ڈبہ شنٹنگ کرنے والی گاڑی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔"

"جب تم اندھیرا ہونے کے بعد یہاں آئے تھے تو تاریکی میں کسی کو کیسے دیکھ سکتے تھے؟"

"میں نے کہا نا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ کسی کی موجودگی کی طرف میرا دھیان نہیں گیا۔"

"اب ہمیں دھیان دینا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے آہستگی سے پکارا: "کوئی ہے۔ اے کھنے کیوآچھے؟ (یہاں کوئی ہے؟)"

سکندر نے کہا: "اگر کوئی ہے تو ہمارا دوست بن جائے۔"

بھوپالی نے کہا: "اگر کھانا بچا ہو تو ہمیں کچھ دے دو۔ ہمارے پاس آ جاؤ یا ہماری بات کا جواب دو۔ ہم تمھیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

وہ دونوں باری باری بولتے رہے۔ پھر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد سکندر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "ہم دیواروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی ہو تو جواب دے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ہانڈی کیسے غائب ہو گئی؟"

"ہماری بدنصیبی اسے لے گئی۔ بھئی اب تو یہی سمجھنا ہوگا کہ ہانڈی لڑھک کر باہر گر گئی ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ ہانڈی ذرا بھی لڑھکتی تو اس میں سے کھانا ضرور گرتا۔"

وہ جھنجھلا کر بولا: "ہانڈی گر گئی ہو یا غائب ہو گئی ہو، دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم بھوکے رہیں گے۔"

وہ چپ رہے۔ اس کے بعد بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ اس ڈبے کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ایک سر پلیٹ فارم کی لائن پر جا رہا تھا۔ آگے ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس مال گاڑی سے جا کر لگ گیا۔ دونوں پھر دم سادھ کر بیٹھ

گئے۔ ایک پورٹر اس ڈبے کو شالی راڈ کے ذریعے مال گاڑی سے منسلک کر رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر ویرانی تھی۔ مسافر شاید بھولے بھٹکے وہاں سے گزرتے تھے۔ کسی گاڑی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، اور مسافر ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے کہ آدھی رات کو پلیٹ فارم پر ٹھہر کر کسی گاڑی کا انتظار کرتے۔ سب کو اپنی جان و مال کا خطرہ تھا۔ ایک گڈز کلرک نے جمائی لیتے ہوئے کہا: "ایک بج رہا ہے میں سونے جا رہا ہوں۔"

ایک قلی نے کہا: "آپ [illegible] (آپ سو جائیے) ہم بھی تھک گئے ہیں۔ ان ڈبوں میں کل صبح مال چڑھائیں گے۔"

وہ دونوں تاریکی میں بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہ آج کی رات وہاں چھپ کر گزار سکتے ہیں مگر چھپ کر کیوں؟ وہ کس سے ڈر رہے تھے؟ کس سے چھپ رہے تھے؟ جب کہ وہ ابھی بچا تھا اور اپنے اپنے لب و لہجے کے مطابق ایک دوسرے کو بنگالی سمجھ رہے تھے۔ بنگلہ دیش میں بنگالی کو بنگالی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور مال والی بوگی کے اندھیرے میں کیوں چھپ کر رہنا چاہتا ہے؟

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ آس پاس گہرا سناٹا چھا گیا۔ دور پلیٹ فارم کے ایک حصے میں چند قلی سو رہے تھے۔ کبھی کبھی دور تک اسٹیشن کی سیٹی سنائی دیتی تھی جو رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی تھی، پھر وہی سکوت طاری ہو جاتا تھا۔

ایسے ہی سکوت کے عالم میں وہ دونوں چونک گئے۔ کان لگا کر سننے لگے۔ اسی ویگن کے اندر کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پہلے تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر ایک نے دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرگوشی میں پوچھا: "کیا تم کچھ سن رہے ہو؟"

"ہاں یہاں کوئی ہے۔ ہمیں پہلے ہی ادھر جا کر دیکھنا چاہیے تھا۔ جدھر سے یہ آواز آ رہی ہے۔"

"واقعی ہم ادھر نہیں گئے۔ رینگتے ہوئے دوسری طرف گئے تھے۔ اب کیا خیال ہے؟"

اس نے کہا: "بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو سکتا ہے۔"

وہ سوچنے لگے۔ پھر سکندر نے کہا: "اگر ہتھیار ہوتا تو وہ ابھی تک خاموش نہ رہتا۔ ہم پر حملہ کرتا۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے اس بات پر غور کیا۔ پھر انکار میں

لطیفہ

بیوی نے شوہر سے کہا: "آخر تم اپنے دوستوں سے یہ کیوں کہا کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے صرف اس لیے شادی کی ہے کہ میں بہترین انڈا پکانا جانتی ہوں حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک انڈا تک نہیں اُبال سکتی۔"

شوہر نے جواب دیا: "کم سے کم تم سے شادی کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو مجھے کرنا ہی چاہیے۔"

سر ہلا کر کہا: "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس ریوالور ہو اور اس میں ایک ہی گولی رہ گئی ہو۔ اس نے سوچا ہو، ایک گولی سے ہم دونوں کو ہلاک نہیں کر سکتا لہٰذا خاموش بیٹھا ہے۔"

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ بیشک اس کے پاس ریوالور ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک گولی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کی سانسیں بتا رہی ہیں کہ وہ گہری نیند میں ہے۔"

"کیا ہم اسے دوست بننے کی پھر دعوت دیں؟"

"پاگل ہوئے ہو۔ اگر ہم نے آواز دی تو ہماری آواز پلیٹ فارم تک جائے گی۔ وہ قلی یہاں سے بہت دور ہیں لیکن کسی وقت بھی واچ اینڈ وارڈ یہاں سے گزر سکتا ہے۔"

وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ ایک نے کہا: "اس طرح بیدار بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ یقیناً اسی سے ہماری ہانڈی پڑی ہے۔ کچھ تو ہانڈی میں بچا ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم رینگتے ہوئے وہاں تک جائیں گے۔ آہستگی سے ہانڈی لیں گے۔ جیسے ہی پتہ چلے گا کہ اس کا سر ادھر ہے تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں گے تاکہ وہ نیند سے بیدار ہوتے ہی چیخنا شروع کر دے۔"

وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرنے لگے۔ دونوں ہاتھ پاؤں سے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ویگن کے اس حصے کی طرف جانے لگے جہاں سے [illegible] سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر رینگ رہے تھے تاکہ [illegible] ہو کے سرگوشی کر سکیں۔ قریب پہنچنے کا [illegible] دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ ہانڈی سے ٹکرائے۔ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ دوسرے ہی لمحے دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ ہانڈی کے اندر گئے لیکن ایک ساتھ باہر نکل گئے کیونکہ دونوں کی مٹھیوں میں بھات بھرا ہوا تھا اور جب مٹھیاں منہ تک گئیں تو دو ہاتھ ایک

ساتھ باہر نہیں نکل سکتے۔ کلیم الدین بھویاں نے سرگوشی میں کہا۔ "پہلے مجھے نکلنے دو۔"

سکندر نے کہا: "ہم نے پھر جگا دیا تو اس کھانے سے بھی جائیں گے۔ پہلے تم ہی کھاؤ!"

اس نے بڑی سختی محسوس کی اور ہاتھ بڑھا کر نکال لیا۔ پھر اس نے ہاتھ ڈالا تو ہانڈی میں صرف اس کا ہاتھ تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے کھانا نکالا اور اسے اپنے منہ میں بھر کر جلدی جلدی چبانے لگا۔ انھیں کھانے سے پہلے اس تیسرے شخص کو دریافت کرنا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ وہ جو کوئی بھی تھا، انھیں کھانے کے دوران نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن وہ جو انسان کی فطرت میں تجسس بھرا ہوتا ہے وہ تجسس زندگی کے ہر لمحے میں رہ سکتا ہے لیکن بھوک کے وقت مر جاتا ہے۔ پردے کے پیچھے کوئی دشمن چھپا ہو یا اندھیرے میں کوئی دشمن جان لینے والا ہو تب بھی اس کی پروا نہیں ہوتی، صرف پیٹ بھرنے کی فکر ہوتی ہے۔

جب انھوں نے ہانڈی میں ہاتھ ڈالا تھا تو وہ آدھی رہ گئی تھی۔ تیسرے چور نے آدھی ہانڈی چھوڑ دی تھی۔ دونوں کی بھوک تو نہیں لیکن تسلی ہو گئی۔ انھوں نے کھانے کے بعد ڈکار لی۔ پھر ہاتھ کو اپنے بدن کے کپڑے سے پونچھا۔ پھر اس آواز کو قریب سے سننے لگے۔ پتہ نہیں اسے کتنی گہری نیند آ گئی تھی کہ قریب بیٹھ کر ڈکار لینے کے باوجود اس کی آنکھ نہ کھلی۔

پھر دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے۔ بھویاں کا ہاتھ سونے والی ہستی پر پہنچا تو وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس نے ایک نرم لیٹی ہوئی عورت کو چھو لیا تھا۔ اُدھر سکندر کا ہاتھ آگے بڑھ کر سر سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اندازے کے مطابق اس کے منہ پر رکھ دیا اور پوری قوت سے دبا دیا۔ عورت وہاں ایک دم سے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دونوں نے اسے دبوچ لیا تھا۔

عورت، تنہائی، رات، تاریکی سب ایک ساتھ ایک جگہ ہوں تو دل کی نیت کو بہکنے میں دیر نہیں لگتی لیکن اس وقت ان دونوں کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ شور نہ مچائے۔ اس کی آواز وہیں کے باہر تک نہ جائے۔ پھر سکندر نے سرگوشی میں کہا: "دیکھو، چیخنا چھوڑ دو۔ ہم پر بھروسہ کرو۔"

بھویاں نے کہا: "ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم کون ہو؟"

اسے کوئی سوال پوچھنا سراسر حماقت تھی کیوں کہ سکندر نے منہ کو دبا رکھا تھا۔ بھلا جواب کیا دیتی۔ البتہ اس کا جھٹپٹانا ختم ہو گیا تھا۔ وہ صرف کسمسا رہی تھی۔ یقیناً کوئی بھی عورت کسی اجنبی ہاتھ کو اپنے بدن پر برداشت نہیں کر سکتی۔ سکندر نے سرگوشی میں کہا: "اگر تم چپ چاپ بیٹھی رہو تو میں تمہارے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دوں گا۔ ہم تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

وہ بالکل شانت ہو گئی۔ انھوں نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ اسے آزاد چھوڑ دیا۔ پھر بھویاں نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

جواب میں خاموشی تھی۔ سکندر نے بھی یہی سوال کیا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے بڑی نرمی سے سرگوشی میں سمجھایا: "ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ اگر کسی سے خوف زدہ ہو تو ہم اس سے نجات دلا سکتے ہیں۔ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ تمہارے کام آ سکتے ہیں۔ ہمیں آزما کر دیکھو۔"

بھویاں نے کہا: "اور تمہیں ہم پر بھروسہ کرنا ہی ہوگا۔ یہ ایسا وقت ہے [illegible] کہ آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ تم تو عورت ہو۔ تمہیں ہمارے [illegible] کی ضرورت ہے۔ بولو تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تاریکی خاموش تھی۔

سکندر نے [illegible] کہا: "ہم نے تمہیں خاموش رہنے کی تاکید کی تھی کہ شور نہ مچاؤ لیکن [illegible] رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سے بھی نہ بولو۔"

اس نے جیسے بولنے کی قسم کھا لی تھی۔ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ بھویاں نے پوچھا: "اے بھائی سکندر! کیا یہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی عورت تھی؟ کیا یہ سچ ہے کہ ہم نے کسی کو یہاں پر ہاتھ لگایا تھا؟"

سکندر نے کہا: "بےشک ہمارے قریب ایک عورت موجود تھی۔ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی ہے اور ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے سے باتیں کیے جا رہے ہیں۔"

"نہیں بھائی! وہ موجود ہے۔ آؤ پھر چھو کر دیکھتے ہیں۔"

ان کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی ایک عورت کی گونگی سی آواز سنائی دی۔ وہ جیسے بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔ سکندر نے پوچھا: "کیا تم گونگی ہو؟" پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا: "لعنت ہے، اگر تم گونگی ہو تو میری بات کا جواب کیسے دو گی؟"

کلیم الدین بھویاں نے کہا: "یہ سچ ہے۔ میں بعض عورتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری بھاشا نہیں جانتیں اس لیے گونگی بن جاتی ہیں تاکہ ہم انھیں بنگالی سمجھ کر چھوڑ دیا کریں۔"

سکندر نے پوچھا: "اسے نہیں چھوڑو گے تو کیا کرو گے؟"

"ہاں یہاں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شور مچائے گی تو پکڑے جائیں گے۔"

"بہت خوب، تم بنگالی ہو۔ پھر تمہیں کون پکڑ سکتا ہے؟ کون تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟ آخر تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ چھپتے پھر رہے ہو؟ پہلے اپنے آپ کو دیکھو۔ پھر کسی کا نقصان پہنچنے

کے متعلق سوچا:

"سکندر! تم ایک بہاری عورت کی طرفداری کر رہے ہو؟"

"میں تمھارے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے تم بتاؤ، کیوں چھپتے پھر رہے ہو۔ جب کہ تم ایک بنگالی ہو اور بنگالیوں کو یہاں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

"تو پھر اس عورت کا بھی اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس کے معاملے میں نہ پڑو۔ ڈبے کے اُدھر چلے جاؤ۔"

"بہت خوب۔ میں اُدھر جاؤں اور تم اِدھر اس کے ساتھ رہو۔"

"مگر اس کے سامنے تم اپنے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ نہیں بتاؤ گے تو میں تم سے جھگڑا کروں گا پھر آواز باہر تک جائے گی۔ تب تم کو ڈھونڈیں گے۔ شاید بی۔ ڈی۔ آر والے اور پولیس والے بھی اِدھر چلے آئیں۔"

وہ چپ رہا جیسے تاریکی میں خود کو چھپا رہا ہو۔ ویسے اس تاریکی میں وہ سب اپنی اپنی جگہ سائے کی طرح تھے۔ سکندر نے پوچھا "کیا خیال ہے؟ جواب دو دادا!"

"تم بھی ڈبے میں [illegible] چھپے ہوئے تھے۔ تمھیں بھی کسی سے خطرہ ہے جب کہ تم خود بنگالی ہو۔ کیا باہر سے جو لوگ آئیں گے وہ تمھیں گرفتار نہیں کریں گے؟"

سکندر نے کہا "مجھے کوئی گرفتار نہیں کرے گا۔ میں نے وہ کردار ادا کیا ہے جو بنگالیوں کو پسند ہے۔ ویسے میں پیدائشی طور پر بہاری ہوں۔ چونکہ میرا بچپن کلکتہ میں گزرا ہے اس لیے بنگالی روانی سے بولتا ہوں۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ میں کون ہوں۔ جب یہاں پاکستانی حکومت تھی اور بہاریوں کا بول بالا تھا تو میں شان سے رہتا تھا۔ مجھے ایک بہاری لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ بہت سیدھی سادی سی نیک سیرت لڑکی تھی۔ کسی نے مجھے سمجھایا کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں۔ سیدھی طرح اس کے والدین سے اس کا ہاتھ مانگ لوں۔ میں اس سے بہت متاثر تھا لیکن جب اس کے والدین کے پاس گیا تو انھوں نے ذات برادری کا مسئلہ اٹھایا۔ وہ لوگ سید تھے۔ میں اپنے ماں باپ کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا۔ بچپن سے جہاں تک پتا ہے یتیم خانے میں میری پرورش ہوئی۔ کیسے میں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی اور اپنا چھوٹا سا کاروبار کرنے لگا۔ انھوں نے جب میرے خاندان کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے والدین کا تعلق دربھنگا سے تھا اور میرے دادا کلکتہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں مسلمان ہوں؟"

سکندر ذرا دیر کے لیے چپ ہوا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا: لڑکی کے والدین نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ میری کوئی بات نہیں مانتے تو اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کریں۔ اگر میری حمایت میں فیصلہ ہوگا تو مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔"

لیکن انھوں نے لڑکی کی مرضی معلوم کرنے کے باوجود مجھے میرا حق نہیں دیا۔ دراصل نفرت اور دشمنی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ حق دار کو حق نہ دیا جائے اور اسے دھتکار دیا جائے۔ جو ہماری ایک بہاری اکثریت سے اپنا حق سمجھ کر کیا تھا۔ وہ [illegible] کی بات نہ کی گئی تو نفرت کا جو لاوا پک رہا تھا پھوٹ پڑا۔ میں بھی انتقام کی آگ میں پکنے لگا۔ بنگال تو کلکتہ ہی تھا۔ مکتی باہنی والوں سے مل گیا۔

مکتی باہنی والے جوان میں، تمہیں پوچھتے تھے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ کن بہاریوں نے بنگالیوں کو اور ہندوؤں کو قتل کیا تھا اور انھیں لوٹا تھا۔ دوسری بات یہ کہ کون بہاری سب سے زیادہ مالدار ہے؟ تیسری بات یہ کہ کس کے ہاں خوب صورت اور جوان لڑکیاں ہیں۔ ان دنوں مجھے پتا چلا کہ زیبی مر چکی ہے۔

انھوں نے پوچھا: کون زیبی؟

"وہی لڑکی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ بیمار تھی اور اسی بیماری میں مر گئی۔ اب اس گھر میں زیبی کی چھوٹی بہن اور اس کے والدین رہ گئے تھے۔ میں نے مکتی باہنی کے ایک گروپ لیڈر سے کہا، میں تمھیں ایسے مکان میں لے جاؤں گا جہاں نقد دولت اور سونے چاندی کے زیورات ملیں گے۔"

گروپ لیڈر نے کہا: "تم تو [illegible] کے وہ [illegible] گے۔ چلو...!"

میں نے انھیں زیبی کے مکان میں پہنچا دیا۔ اس کے والدین دروازے کھڑکیوں کو اندر سے بند کیے سہمے بیٹھے تھے۔ مکتی باہنی نے دروازے کو توڑ دیا۔ ہم سب اس مکان میں داخل ہوئے تو وہ بوڑھا زیبی کی بہن اور ایک شخص کے ساتھ پلنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ وہیں سے گڑگڑا کر کہنے لگا: "ہمیں چھوڑ دو۔ ہم سے جو تم چاہو لے لو مگر ہمیں جان سے نہ مارو۔"

میں نے نفرت سے کہا "بڈھے! پلنگ کے نیچے سے نکل اور دیکھ میں وہی ہوں جس نے بڑی شرافت سے تیری بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔ میں ایک شریفانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن تو نے مجھے اپنا دشمن بنا لیا۔"

وہ پلنگ کے نیچے سے پھر گڑگڑانے لگا: "میں نے بڑی غلطی کی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں گا۔"

"بڑے میاں! یہ کہو گے کہ تم تو سید ہو اور میرے خاندان کا کوئی پتا نہیں ہے۔ کیا تمھاری ذات برادری والے آ کر تمھیں بچا سکتے ہیں اور کیا میں تمھاری چھوٹی بیٹی سے شادی کروں گا۔ ہرگز نہیں

میں جسے چاہتا تھا وہ تمہاری ہو کر سسک سسک کر مر گئی۔ مجھے تمہارے گھر کے سارے حالات معلوم ہیں۔

[illegible] سارا [illegible] تھی۔ [illegible] سے۔

[illegible] ہو [illegible] کے بعد [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] اور بوڑھی کی ٹانگوں سے پکڑ کر پلنگ سے [illegible] کھینچ لیا تھا۔ بڑھیا ایک طرف [illegible] مطلب [illegible] یہ ساری دولت سمیٹ کر لے جاؤ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو۔

مکتی باہنی کے ایک جوان نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا [illegible] دیکھو۔ [illegible] کی تصویر۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگ [illegible] اسی وجہ سے ہم لوگوں پر [illegible] ہیں۔ ہم انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ [illegible] تمہاری ہے [illegible]

[illegible] چیخ کر کہا: سکندر! مجھے چاہتے ہو تو میرے ابو کو [illegible]

[illegible] چھوڑ دو۔

[illegible] بنگالی [illegible] بنگالی کسانوں کی محنت کا چاول کھا رہے ہیں۔ بنگال کا پانی پی رہے ہیں۔ چوبیس سال سے بنگال کی ہوا میں سانس لے رہے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بنگالیوں کو دوست سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔ ان کی نشوونما [illegible] میں ہوئی مگر [illegible] کا دل پاکستانی رہا۔

یہ کہتے ہی اس نے چیخ کر حکم دیا: فائر! دوسرے ہی لمحے تڑ تڑ [illegible] . . . بوڑھے اور بوڑھی کی لاشیں [illegible] کے فرش پر تڑپ رہی تھیں۔ زیبی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ اگر اس کے پیچھے سامنے کے سینے دیوار نہ ہوتی تو شاید گر پڑتی۔ مکتی باہنی کے جوانوں نے تمام نقد رقم اور زیورات کو سمیٹا۔ گٹھڑی باندھی۔ پھر کریم [illegible] نے میرے شانے کو تھپ تھپا کر کہا: ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ مال ہم لے جا رہے ہیں۔ لڑکی تمہارے لیے چھوڑ دی ہے۔

وہ چلے گئے۔ میرے لیے میری پسند کی دلہن چھوڑ گئے۔ ایسی دلہن جس کی طرف میں دیکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ شرم سے گردن جھکی جا رہی تھی۔ اس کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی میں [illegible] جا رہا تھا۔ ہم یہ کیا کر گئے ہیں۔ نفرت اور دشمنی [illegible] جاتے ہیں، انتقام کے جوش میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتے۔ اگر میں ذرا صبر سے کام لیتا تو بہتر ہوتا۔ زیبی [illegible] ہو جاتا تھا میں حیرت میں تھا۔ بے شک اس [illegible] میرے اختیار میں نہیں دیا تھا لیکن وہ [illegible] پر کسی دوسرے کو بھی مسلط نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر میری تھی۔ میری ہی [illegible] تھی۔

لیکن اب [illegible] وہ [illegible] کی طرح اجڑ گیا تھا۔ اب وہ کسی دشمن [illegible] جیسے [illegible] درست [illegible] دے سکتی تھی۔ مجھے گالیاں دے سکتی تھی۔ مجھے نفرت سے دور [illegible] کے لیے کوستی تھی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ اچانک وہ چیخ مار کر روتے ہوئے، دوڑتے ہوئے فرش پر گر کر کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔

میں ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں اس سے کیا کہوں، دلجوئی کروں مگر کس زبان سے، دشمن جو جان لیتے ہیں وہ [illegible] کیسے بن سکتے ہیں۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ روتی رہی۔ فریاد کرتی رہی۔ میں خاموش رہا۔ بہت دیر بعد جب اس کی آواز تھکنے لگی۔ وہ نڈھال سی ہونے لگی تو میں نے بڑی ندامت سے کہا: زیبی مجھے معاف کر دو!

میری یہ بات جیسے تازیانہ تھی۔ وہ ایک دم سے چونک کر پلٹ گئی۔ مجھے یوں دیکھا جیسے اب تک میری موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ احساس ہوا تو وہ شدید نفرت سے دیکھنے لگی۔ میں اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ نظریں جھکا کر بولا: تم مجھے جتنی سزا دینا چاہو دو۔ میں اف نہیں کروں گا۔ بس خدا کے لیے ایک بار معاف کر دو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آگئی۔ بالکل سامنے آ گئی۔ مجھے ذرا سی امید نظر آئی۔ شاید وہ مجھے معاف کر دے گی اور اسے معاف کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ میں ہی اس کا سہارا بن سکتا تھا۔ میں نے بڑے یقین سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے ہی سر اٹھایا اس نے آخ تھو کر کے مجھ پر تھوک دیا۔ میں نے تڑپ کر اپنے چہرے کو ادھر ادھر سے چھو کر دیکھا۔ تھوک کہاں ہے؟ وہاں نہیں تھا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں شانوں کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا

کہاں ہے تھوک، تھوک کہاں ہے؟

تھوک ضروری نہیں ہے۔ صرف 'تھو' کہہ دینا کافی ہے۔ اب جیسا کہ آدمی کو دیر سے گرانا ضروری نہیں ہے۔ نظروں سے گرا دینا کافی ہے۔ میں خود کھڑا ہوا بوکھلاہٹ میں اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر نہیں میرے ضمیر کے منہ پر تھوکا تھا۔

وہ یکبارگی پلٹ کر دوڑتے ہوئے باورچی خانے میں گئی۔ پھر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ آگے [illegible] کیا اسے پھر تھوکنے کے لیے بلاتا؟ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے دلخراش قہقہے سنائی دیے پھر باورچی خانے کی کھڑکی سے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئے۔ میں دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ تب پتا چلا، اس نے اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کے آگ لگا لی تھی۔ وہ جل رہی تھی اور دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ میں دروازے کو پیٹنے لگا، دھکے دینے لگا۔ بار بار چیخ کر اسے سمجھانے لگا کہ وہ پانی سے [illegible] آگ بجھ جائے گی۔ اسے خودکشی نہیں کرنا چاہیے۔

دروازہ مضبوط تھا لیکن میرے جوش اور جذبے نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ جب میں ٹوٹے ہوئے دروازے سے گزر کر اندر پہنچا تو تمام [illegible] تھا۔ وہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ مکمل سیاہ پڑ گئی تھی۔ [illegible] تاہم زندگی کی [illegible] سانس [illegible] رہی تھی۔ [illegible] رک رہی تھی۔ کبھی ایک [illegible] ہو جاتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دم نکل [illegible] رہا تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ فرش پر گھٹنے ٹیک کر اسے مخاطب کیا: "زینی [illegible] یہ تم نے کیا کیا؟"

اس کی آنکھوں کے پپوٹے [illegible] لرزنے لگے۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پہلے تو یوں دیکھا جیسے پہچان نہیں پائی ہو۔ پھر پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت ظاہر ہونے لگی۔ گویا [illegible] جانکنی [illegible] پورے وجود کو [illegible] اس نے اپنی آخری تمام قوتیں صرف کر کے اپنے چہرے کو [illegible] کی طرف دیکھا پھر اپنے ہونٹ سکیڑے۔ [illegible] سر تکیے سے لگ گیا پھر ایک دم ڈھلک گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

وہ [illegible] مر گئی [illegible] کسی سے محبت کا اظہار کر [illegible] نفرت کا [illegible] کسی کرب کا لیکن اس کے دونوں ہونٹ ابھی تک اسی طرح یوں سکڑے ہوئے تھے جیسے موت کے کرب سے [illegible] یا محبت سے [illegible] کر اپنے [illegible] یا پھر نفرت سے تھوک رہی ہے

بولو: تھو!

■

مال گاڑی کے ڈبے کے اندر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سکندر کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس تاریکی میں کلیم الدین بھوپالی بھی خاموش بیٹھا انتظار کر رہا تھا شاید سکندر کچھ اور بولے گا۔۔۔۔ ان دونوں کے علاوہ وہ تیسری ہستی بھی وہاں موجود تھی مگر تاریکی میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

کلیم الدین بھوپالی نے کہا: "تمہاری روداد سننے کے بعد میرا دل کہتا ہے اب تم کسی سے نفرت نہیں کرو گے۔ کسی کو دشمن سمجھ کر انتقام نہیں لو گے۔"

"ذلت کی ایک ٹھوکر کے بعد انسان کو سنبھل جانا چاہیے جو نہیں سنبھلتے وہ آخری سانس تک ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں، تم جو کہو گے وہ میرے سینے میں راز رہے گا مگر تم اپنے متعلق کچھ نہ چھپاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

اس نے کہا: "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے لڑنے کے دوران میں نے جوش میں آ کر اپنا نام بتا دیا کہ میں کلیم الدین بھوپالی ہوں۔ حالانکہ اب سے پہلے میں نے کسی کو یہ صحیح نام نہیں بتایا۔ میری داستان بس اتنی سی ہے کہ میں بنگالی ہوں اور بنگالیوں سے [illegible] جیسا کہ تم جانتے ہو، بہت سے بنگالی پاکستان کے وفادار تھے۔ میرے ماں باپ [illegible] سے [illegible] تھے ——— پاکستان کے وفادار تھے اور یہی وفاداری وہاں کے [illegible] کو کھٹکتی تھی۔ [illegible] سے [illegible] ہوں [illegible] بنگالی ہیں۔ ہمیں بنگالیوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ [illegible] ایک سیاسی دوست [illegible] بنگالی [illegible] تبدیل [illegible] ایسی گورنمنٹ [illegible] کے ساتھ [illegible] تنظیم [illegible] اس کا نام [illegible] تھی۔ جب [illegible] حالات کا دور [illegible] کے وفادار [illegible] ہنگامے کے دوران جب بھی بنگالی [illegible] کو موقع ملتا تھا وہ ان کے دفتر پر [illegible] کرتے تھے اور [illegible] کہتے تھے ——— پاکستان کے ذمے داروں سے [illegible] ہمارے لیے حفاظتی اقدامات [illegible] ذہنی طور پر [illegible] اقدامات کرنے [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے [illegible] کے وفاداروں پر کیا گزرے گی۔ سوچو تو یوں سمجھ میں آتا ہے جیسے یہ سب کچھ [illegible] منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔ ہم وفاداروں کے دل [illegible] ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یقیناً یہ [illegible] تھی۔ اسی لیے انھوں نے چند [illegible] وفاداروں کو پہلے ہی بلا کر انھیں تحفظ دے دیا۔ باقی ہم سب لوگوں کو اپنی زمین اور اپنی قوم سے غداری کی عبرت ناک سزا پانے کے لیے چھوڑ دیا؟"

کلیم الدین بھویاں چند لمحوں تک خاموش رہا پھر اس نے ونگی کی تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا: "ہم کیا ہیں؟ ہم دھوبی کے کتے ہیں، نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ میری قوم کے ہی لوگوں نے میرے گھر کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت اور ایک ایک بچے کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ میں اس وقت دیناج پور میں نہیں تھا اس لیے زندہ سلامت نظر آ رہا ہوں لیکن چھپتا پھر رہا ہوں۔ ایک بہت بڑے جج کا بیٹا ہوں اس لیے دیناج پور کے بے شمار بنگالی مجھے جانتے ہیں۔ پھر میری تصویریں مکتی باہنی کے جوانوں کو دی گئی ہیں۔ میرا حلیہ بھی بتایا گیا ہے۔ وہ مجھے جہاں دیکھیں گے وہیں گولی مار دیں گے۔"

وہ دھیرے سے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا: "میں ایک بہت بڑے جج کا بیٹا ہوں اور آج میں نے ایک [illegible] کے گھر سے کھانے کی [illegible] چرائی ہے۔ آج میری کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے۔ آج میں چوری نہ کرتا تو دشمنوں کے ہاتھوں مرنے سے پہلے بھوکا مر جاتا۔ ان حالات میں زندگی کتنی پیاری لگتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس پیاری سی، عزیز سی چیز کو کیسے بچا کر رکھیں۔ بنگالی دوست، بہاری دوست، سارے دوست۔ مجھے سبھی سے نفرت ہے۔ اب میں ان کا نام سننا نہیں چاہتا۔ ہمارے سارے دوست کسی نام پر قربان ہو گئے مگر ہمیں کیا ملا۔ بے شک قربانیاں [illegible] مگر کس کے لیے ہم نے قربانیاں دیں؟ وہ ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے اور پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔ ہمارے آگے صرف موت ہی موت نظر آ رہی ہے اور امید کی ایک ہلکی سی کرن [illegible] کہ ہمیں چھوڑ کر جانے والے پھر آ کر اس بٹے کو پاکستان بنائیں گے یا ادھر والے پاکستان میں ہمیں پناہ دینے کے لیے بلائیں گے تو پھر ہم کس مقصد کے لیے جان دیں؟ جب کوئی مقصد نہ ہو، کوئی منزل نہ ہو اور جان جاتی رہے تو ایسی موت حرام موت کہلاتی ہے۔ اسے قربانی کا خوبصورت نام دے کر بہلایا نہیں جا سکتا۔"

سکندر نے کہا: "تم نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کی ماں بہنوں کو بے عزت ہوتے اور مرتے دیکھا۔ اب یقیناً تمہاری نظروں میں دوسروں کی بہو بیٹیوں کا احترام ہونا چاہیے پھر تم اس عورت کو بیچاری سمجھ کر دشمنی پر کیوں اتر آئے تھے؟"

کلیم الدین بھویاں نے تاریکی میں ادھر دیکھا۔ جدھر اس عورت کی موجودگی کی توقع تھی۔ وہ دونوں کو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن یقین تھا کہ موجود ہے۔ وہ بولا: "بے شک میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کی عورتوں کو بے عزت ہوتے دیکھا لیکن اس سے کوئی سبق حاصل نہیں ہوا بلکہ انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔ دل اور دماغ میں لاوا پکتا رہتا ہے کہ ان مغربی پاکستان والوں اور بہاریوں سے وفاداری بہت بڑا جرم کیا۔ پنجابی پاکستان چلے گئے۔ بہاری سید پور، ڈھاکہ اور دوسرے بڑے شہروں میں اپنے کیمپ بنا کر اپنی سلامتی کی کوششیں کر رہے ہیں یا سرحد پار بھاگ رہے ہیں لیکن ہم بنگالی کہاں جائیں؟ اگر یہاں رہتے ہیں تو بنگلہ دیش کے غدار کہلاتے ہیں۔ پاکستان پہنچیں گے تو گیہوں کے ساتھ جیسے گھن پس جاتا ہے، ویسے ہی دوسرے بنگالیوں کی طرح ہمیں بھی پاکستان کا غدار سمجھا جائے گا۔ ادھر بھی غدار، ادھر بھی غدار کہلائے۔ ہمارا کوئی وطن نہیں ہے۔ کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر تم کسی بہاری یا بنگالی عورت سے ہمدردی کیوں کرو؟ جس گھر میں مجھے چوری کرنے کا موقع ملتا ہے، میں چوری کر کے بھاگ جاتا ہوں۔ جس گھر کی کوئی عورت ہاتھ آتی ہے میں اسے نہیں چھوڑتا۔ مجھے ایسے وقت یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری دنیا سے انتقام لے رہا ہوں۔ بنگالی، بہاری اور سہروردی [illegible] اور یہ سب میرے دشمن ہیں۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہے پھر بھویاں نے کہا: "میں دن بھر کا بھوکا پیاسا ہوں۔ ابھی کسی عورت سے ہمدردی کے دو بول سنا [illegible] ہے۔"

"[illegible] نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اس لیے چربی چڑھی ہے۔ وہ عورت تم سے [illegible] چلے جاؤ ورنہ میں تمہاری پٹائی کر دوں گا۔"

بھویاں سے پوچھا: "یار تھوڑی دیر پہلے کا معاملہ بھول گئے ہو۔ تم کسی طرح [illegible] ہو۔"

"کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان جھگڑا ہو گا تو ہم لڑنے مرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ ابھی کسی بنگالی نے تمہیں ایک جج کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان لیا تو؟"

بھویاں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "کسی نے پہچانا [illegible] دشمنی تمہاری مخالفت کروں گا تو نقصان اٹھاؤں گا اور پھر سمجھوتا کرنا نہیں [illegible] لیکن یہ ہے کہاں، یہ تو کچھ بولتی نہیں ہے۔ اپنی موجودگی کا بھی احساس نہیں دلاتی ہے۔"

سکندر نے کہا: "ہاں اسے کچھ بولتے رہنا چاہیے اور بولنے کے لیے زور زور سے سانس لینا چاہیے یا پھر ہلنا چاہیے۔ تاریکی میں جب تک کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو اس کے وجود کا یقین نہیں ہوتا۔ اے! تم خاموش کب تک رہو گی؟ کچھ تو بولو۔ یا پھر اپنا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

وہ دونوں کان لگا کر سننے لگے۔ انتظار کرنے لگے جیسے وہ قید کو ان کے حوالے کرنے والی ہو۔ دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ وقت گزرتے ہوئے دیکھنے کے لیے گھڑی نہ تھی۔ سننے کے لیے وقت کی ٹک ٹک نہ تھی، دلوں کی دھک دھک تھی

ہے کہ ساتھی بہت سمجھ دار ہیں۔ انتظار ختم ہو گیا۔ [illegible] اس کی مٹھیوں کا سہارا بن چلے لگا۔ ایک طرف یہ ساحر مسکراتا رہا، پیچھے اس نے ہاتھ سے ساحر [illegible] کر دیا تک ساحر گھنٹی رہی ہو تاکہ وہ دیر تک اس کی آواز سن لیں۔

سکندر نے کہا۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم بول نہیں سکتی ہو لیکن سن سکتی ہو۔ سمجھ سکتی ہو اور تم نے ہم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ یقیناً تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم بھی دشمنوں کے مارے ہیں۔ تمہیں نہیں ماریں گے۔ آؤ ہم سے دوستی کرو۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد کوئی ملائم سی چیز سکندر کے گھٹنے سے ٹکرائی۔ تاریکی کا ہاتھ [illegible] وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے اس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ وہ ہتھیلی نرم تھی۔ گرم تھی اور محبت مند تھی۔ اس کے ہاتھوں میں آنے کے بعد خود کو نہیں چھڑا رہی تھی۔ یعنی اعتماد قائم ہو گیا تھا۔

سکندر نے اس ہتھیلی کی پشت کو محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کلیم الدین بھوپالی کو مخاطب کیا: "یہ ہم سے دوستی کر رہی ہے۔ بھلا اب میرے ہاتھ کیوں چھوڑنے لگی ہے؟"

ادھر سے کلیم الدین بھوپالی کی [illegible] "یہ مجھ سے بھی دوستی کر رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ ہم دونوں کا سہارا چاہتی ہے۔"

"عورت کو کسی ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تم ایک رشتے کے متعلق کیوں سوچتے ہو۔ ہم [illegible] دنیا میں اور بھی تو عزیز رشتے ہوتے ہیں۔"

کلیم الدین بھوپالی نے کہا۔ "یہ رشتے کی بات ہے [illegible] اگر ہم اس [illegible] سے نکلیں گے۔ دن کا وقت ہوگا اور کسی نے ہم کو اس عورت کے ساتھ دیکھا تو پوچھا جائے گا کہ یہ [illegible] کون ہے؟"

"بے شک سبھی یہ سوال کریں گے۔"

بھوپالی نے کہا: "پہلے ہی سے رشتہ طے ہونا چاہیے۔ رستے میں کوئی پوچھے گا تو میں کہوں گا، یہ میری گھر والی ہے اور تم اس کے بھائی ہو۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں ابھی ہمشیرہ [illegible] میں نے [illegible] کے ساتھ ظلم کیا۔ نا انصافی کی۔ اس کی تکلیف کے لیے بے چین رہتا ہوں۔ اگر میں اس عورت کا سہارا بن جاؤں گا اسے اس کی منزل تک پہنچا دوں گا یا ہمیشہ اس کے کام آتا رہوں گا تو تلافی ہو جائے گی لہٰذا میں اسے اپنی گھر والی بناؤں گا۔ تم اس کے بھائی بن جاؤ۔"

کلیم الدین بھوپالی نے غصے سے مٹھی بھینچ کر کہا: "تم مجھے کھل کر گالی نہیں دے رہے ہو لیکن رشتہ بنا کر سالا کہہ رہے ہو۔ یہ گالی پہلے تم نے دی ہے۔"

"ہم لوگ کچھ عجیب سے ہیں۔ اپنے معبود کو مخاطب کرتے ہیں تو ادب و لحاظ کی انتہا کرتے ہوئے ربِ کریم مخاطب کرتے ہیں لیکن کوئی شخص ہمیں [illegible] کہہ دے تو اسے توہین سمجھتے ہیں۔ بہن کا رشتہ مقدس ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی سالی ہوتی ہو تو اس رشتے کے تقدس سے خود کو کسی کا سالا تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن کوئی عورت مالِ غنیمت کے طور پر ملے تو اس کے رشتے سے وہی لفظ سالا [illegible] بن جاتا ہے۔" کلیم الدین بھوپالی نے کہا۔ "اس طرح ہم پھر جھگڑنے لگیں گے۔ کوئی صلح کا راستہ نکالنا چاہیے۔"

"تم ہی جھگڑا شروع کرتے ہو۔ تم ہی صلح کا راستہ نکالو۔"

"ایک تدبیر ہے۔ اگر یہ [illegible] ہوں تو تمہاری بیوی [illegible] ہوتی تو میری۔"

"اس ڈبے سے نکلنے سے پہلے معلوم ہو جائے گا یہ [illegible] ہے یا ہماری۔ کیونکہ باہر نکلتے ہی جواب غلط ہو سکتی ہے۔"

[illegible]

"ہم [illegible] معلوم کر [illegible] ہے۔"

ان دونوں کے ہاتھوں میں اس کا ایک ایک ہاتھ تھا۔ کسی بھی شخصیت کا پہلا تعارف ہوتا ہے جیسے آپ نے ہاتھ ملایا [illegible] ہاتھ محبت کا پیغام ہوتا ہے۔ [illegible] شروع ہوتی ہو [illegible] والا پہلے ہاتھ پکڑتا ہے...... ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں [illegible] دوسرے کے ہاتھ میں [illegible] دونوں کو [illegible] نہیں پتہ [illegible] تعلق رکھتی ہے اور انہیں کہاں لے جائے گی۔

سکندر نے اس کے ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے کہا: "تم [illegible] ہو۔ [illegible] ہماری مشکل [illegible] اگر تعلیم یافتہ ہو تو اپنی انگلی سے ہماری ہتھیلی پر لکھو۔ تم کون ہو؟"

کلیم الدین بھوپالی نے کہا۔ "[illegible] ہو تو [illegible] بھاشا میں [illegible] ہماری ہو تو اردو میں لکھو۔"

ادھر بھوپالی نے اس کے ہاتھ کو اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھا۔ ادھر سکندر نے بھی اس کی انگلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا: "لکھو۔"

دو مختلف سمت، مختلف ہتھیلیوں پر اس کی دو انگلیاں

[illegible] ہوئی تھی [illegible] کے

[illegible] دونوں تفصیلیں [illegible]

اس سے آ میری ہتھیلی پر انگریزی کا [illegible] ہے۔ بھلا اس سے کیا ہو سکتا ہے؟

[illegible] نے کہا: "اور [illegible] بتایا [illegible]

[illegible]

[illegible] اور وہ سب کا [illegible]

[illegible]

[illegible] نے خوش ہو کر کہا: "[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ان اصلیت معلوم کرنا ضروری ہے"

"[illegible]"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد [illegible] نے کہا: "اسے [illegible] کے پاس لے جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ [illegible] سے اس کے سراپے سے کسی حد تک شناخت ہو سکتی ہے۔"

یہی مناسب تھا جلد از جلد اس کے متعلق معلوم کرنا ضروری [illegible] کے متعلق پوچھتے تو وہ [illegible] [illegible] کے پاس [illegible] [illegible] کی طرف دیکھا۔ وہاں پہلے جیسی ویرانی تھی [illegible] طرف [illegible] میں [illegible] تھیں۔ وہاں سے دیکھے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ دونوں [illegible] کے اس حصے کی طرف پلٹ گئے جہاں وہ

ہوئی ہوئی تھی۔ پھر ایک سرگوشی میں کہا: "انتظار [illegible]"

[illegible] شاید آنے والی تھی [illegible] جھلک دکھانے والی تھی۔ کتنی دیر سے وہ بغیر دیکھے ہوئے اس کے دیوانے ہو رہے تھے۔ حسن جب تک پردے کے پیچھے یا تاریکی میں [illegible] رہتا ہے اور جب تک پُراسرار رہتا ہے [illegible] شاہکار رہتا ہے۔

[illegible] تھی۔ بہت رات کے گہرے سناٹے [illegible] اور دھم سے [illegible] رہ گئی۔

[illegible] سے جھک گئے [illegible] کا [illegible] سناٹا [illegible] رہا تھا۔ [illegible] بھاری [illegible] [illegible] چلانے کی کیا ضرورت تھی؟

[illegible] کہا: "[illegible] [illegible] کر دیا۔"

[illegible] جائے [illegible] [illegible] ہوگی؟"

[illegible] طرف [illegible] تھی [illegible] [illegible] رہا تھا۔

[illegible] [illegible] [illegible] رہ گئے ہیں؟"

[illegible] [illegible] [illegible] ہو جائے گی۔۔۔۔

[illegible] دو [illegible] ہیں؟"

[illegible] بعد ہی [illegible] تیز ہو گئی۔ سب [illegible] تھا کہ [illegible] کی طرف [illegible] تھے [illegible] [illegible] گئے تھے۔ [illegible] کی [illegible] فرش پر [illegible] گر رہی تھیں۔ وہ [illegible] تھے اور اندر آ [illegible] ادھر [illegible] تھے جدھر وہ دونوں ان [illegible] کے سامنے [illegible] بن گئے تھے۔ [illegible] گوشے میں [illegible] کھڑی تھی۔ اس کے آگے وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

تاکہ بوریاں آئیں تو انھیں روک لیں۔

اور وہ ان بوریوں کو روک رہے تھے۔ قلی یہ سمجھ رہے تھے کہ ویگن کا آخری حصہ وہی ہے جہاں بوریاں رکھی ہیں۔ اندھیرے میں اس لیے بھی نظر نہیں آیا کہ وہ روشنی سے کام کر رہے تھے۔

بیس پچیس بوریوں کے بعد ہی انھیں اطمینان ہو گیا۔ اب خطرہ نہیں تھا۔ وہ آسانی سے چھپ گئے تھے۔ باقی بوریاں ان بوریوں کے آگے رکھی جا رہی تھیں۔ ان کی طرف نہیں آ رہی تھیں اور وہ بھی ادھر نہیں رہے تھے۔ اس بات کا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ بوریاں ایک کے اوپر ایک، ٹھونس کر رکھی جائیں گی تو وہ چھت تک پہنچ جائیں گی۔ اس طرح حبس ہو گا۔ سانس رکنے لگے گی۔ وہ پہلے ہی گن چکے تھے کہ صرف دو سو بوریاں ہیں اور اتنے بڑے ڈبے میں [illegible] ہو سکے۔ یا وہ پچیس پچاس بوریاں اوپر نیچے ہو جاتیں۔ چھپنے والوں کے لیے یوں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ آزادی سے سانس لے سکتے تھے۔ وہ ان بوریوں پر چڑھ کر ادھر سے اُدھر جا سکتے تھے۔ بس لوڈنگ کے بعد اس ڈبے کے دونوں دروازے باہر سے بند ہونے والے تھے اور یہ دروازے اسی جگہ کھلتے جہاں یہ مال اتارا جانے والا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اس مال کے ساتھ کہاں اتارے جائیں گے۔ وہ مال گاڑی اس وقت ہارڈنگ برج [illegible] پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا [illegible] سے [illegible] باہر نکلنا تھا۔ اگر وہ مال بنگلہ دیش کے اندر کسی شہر میں اتارا جاتا تو وہ سرکاری ہوتا اور اگر [illegible] بارڈر کی طرف لے جایا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسمگل ہو رہا ہے۔ بہر حال چاول [illegible] ہی [illegible]۔ آخر کار جہاں تک پہنچتا ہے وہاں [illegible] تقدیر [illegible] کسی [illegible] کے بھوکے [illegible] تھی۔

○

خسرو کو یوں لگا جیسے وہ کسی بہت گہرے کھڈ میں گرتا جا رہا ہے۔ اس نے ایک دم سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ جسم اس کا پسینے میں [illegible] ہو گیا۔ دراصل دماغ کی گہرائی میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ [illegible] آدمی کو قتل کرنا ہے۔ [illegible] رہا ہے۔ [illegible] پھینکا جا رہا ہے یا بلندی سے کھڈ میں لڑھکا رہا ہے۔ شکست خوردہ قوم کے لوگ اکثر ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں ——— پھر چونک چونک کر بیدار ہوتے ہیں۔ بیدار ہوتے ہیں اور سہم سہم کر سوتے رہ جاتے ہیں۔

خسرو سہم جانے والوں میں سے نہیں تھا پھر بھی آنکھ کھلی تو ایک ذرا پریشان ہو کر [illegible] نے پوچھا۔ میں کہاں ہوں۔ دوسرے لمحے اطمینان ہوا۔ وہ کسی گھپ اندھیرے میں نہیں بلکہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے [illegible] برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ باہر زوردار بارش اور گرجتے برستے بادلوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس کے دل میں بھی زرین تارا کے نام سے شور اٹھنے لگا۔

اس نے کروٹ بدل کر نیچے کی طرف دیکھا۔ وہ نیچے والی برتھ پر سو رہی تھی۔ شاید اس نے سونے سے پہلے اپنے منہ کو چادر سے ڈھانپ لیا ہو گا تاکہ نیند کے دوران پردہ رہے لیکن اب وہ چادر منہ پر سے ہٹ گئی تھی۔ کیسے ہٹ گئی تھی؟ کوئی ہٹانے والا نہیں تھا اور کوئی حیا والی نیند کی حالت میں بھی اپنے رخ سے نقاب نہیں ہٹاتی۔ خود ہٹ جائے تو اپنے دل کو سمجھاتی ہے ؎

اچھا ہوا کہ بات ہواؤں کے سر گئی
وہ رُخ تو خود کھلا تھا جو زیرِ نقاب تھا

اچھا ہوا کہ وہ نیند کی ماتی نیند میں تھی۔ جی بھر کر دیکھنے کا موقع تھا۔ بعد میں حسرت نہ رہتی۔ وہ دیکھتا رہا۔ سفر کی دشواریاں بھولتا رہا۔ ایک حسین، دلنواز ہمسفر ہو تو محبت بڑھتی جاتی ہے اور راستے کٹتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے بازو کا سرہانا بنائے سر جھکائے اسے دیکھ رہا تھا پھر ایسی آواز آنے لگی جیسے گاڑی پل پر سے گزر رہی ہو۔ اس نے سوچا، کوئی چھوٹا سا پل ہو گا لیکن وہ دیر تک اس پل پر سے گزرتی رہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہے اور وہ پدما کا دریا ہے۔

بیس منٹ کے بعد گاڑی ایشر ڈی کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ایشر ڈی جنکشن میں کبھی مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دن رات چہل پہل رہتی تھی۔ کبھی کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ کبھی کوئی گاڑی جا رہی ہے۔ تمام پلیٹ فارم پر اکروں، خوانچہ فروشوں، چائے اور بوتل والوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ اب وہی ایشر ڈی جنکشن تھا کہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رونق ختم ہو گئی تھی۔ پھر بھی جیسے لوگ وہاں بیٹھے ہیں تھے۔ کبھی کبھی قدموں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

ذرا دیر بعد اچانک کسی نے باہر سے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ تب تارا ایک دم سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ خسرو نے کہا۔ "میں اوپر موجود ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

وہ [illegible] سے کود کر نیچے آ گیا۔ وہ ابھی ساری دہشت کر رہی تھی۔ خسرو دروازے سے چپک کر باہر کی آوازیں سننے لگا۔ بنگلہ دیش میں ابھی بنگلہ بولے جاتے تھے۔ کوئی اردو بولنا نہیں رہا تھا۔ باہر کوئی کہہ رہا تھا "اس کمپارٹمنٹ میں بہار والے ہیں۔ دروازہ نہیں کھلے گا تو توڑ دو۔"

کسی کی آواز سنائی دی۔ "ضرور، یہ دروازہ نہ کھلے گا تو ہی توڑ دیا جائے گا۔ اس میں [illegible] مام جی کے رشتے دار ہیں۔"

"ہم کسی تلسی رام کو نہیں جانتے۔"

"نہیں جانتے ہو تو اب جان لو۔" کسی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فوجی بوٹوں کے بجنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے سب اٹینشن ہو رہے ہوں۔ پھر وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی: "تم لوگوں کو بار بار سمجھایا جا چکا ہے۔ آپس میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ جب تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس کمپارٹمنٹ کی حفاظت بی۔ ڈی۔ آر کے جوان کر رہے ہیں تو یہاں دروازہ توڑنے کیوں آئے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔"

مس تارا ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ خسرو نے پاس آ کر کہا: "ڈرو۔ فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری حفاظت کے لیے بنگلہ فوجی موجود ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر تلسی رام کی آواز آئی: "خسرو! دروازہ کھولو۔ میں آیا ہوں۔ کچھ کھانے کے لیے لایا ہوں۔"

خسرو نے دروازے کے پاس آ کر اسے کھول دیا۔ تلسی رام پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ریلوے کینٹین کا ایک ملازم ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا، پانی کا جگ اور گلاس وغیرہ لے کر آیا تھا۔ خسرو نے اس سے ٹرے لے لی۔ اسے لا کر برتھ پر رکھا۔ پھر دروازہ بند کرنے کے لیے پلٹ کر اُدھر گیا تو دور تک نظریں دوڑائیں۔ ذرا دور مکتی باہنی کے چار جوان کھڑے ہوئے اسی کمپارٹمنٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خسرو سے آنکھیں ملیں تو وہ غصے سے گھورنے لگے۔

تلسی رام نے خسرو کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مکتی باہنی کے جوانوں کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر کہا: "تم فکر نہ کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ والے اگلے ڈبے میں دو سپاہیوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور اس پیچھے والے ڈبے میں بھی وہ مسلح سپاہی ہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

خسرو دروازہ بند کرنے لگا تو تلسی رام نے کہا: "اور ہاں جب گاڑی چل پڑے تو کھڑکیاں کھول لینا۔ تازہ ہوا ملتی رہے گی۔ جاؤ اب پیٹ بھر کر کھاؤ اور آرام کرو۔"

"چچا جی! کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے ہیں۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "ہم صبح سے سفر کر رہے ہیں اور ابھی تک ایشوردی پہنچے ہیں۔ کیا گاڑی کہیں دیر تک رُک گئی تھی؟"

"کبھی کسی اسٹیشن پر رُک جاتی ہے تو سگنل نہیں ملتا اور کبھی سگنل ملتا ہے تو راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ رینگتے رینگتے ہی سہی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم ہلی پہنچ جائیں گے۔"

خسرو نے دروازے کو بند کر دیا۔ دور کھڑے ہوئے مکتی باہنی کے جوان اسے دیکھ رہے تھے۔ دروازہ بند ہونے کے بعد ایک نے کہا: "یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کمپارٹمنٹ میں تلسی رام کے رشتے دار ہیں۔ اگر رشتے دار ہیں تو اس رشتے دار کا نام خسرو کیسے ہے۔ خسرو تو مسلمان کا نام ہوتا ہے اور یہ بڑی توند والا مارواڑی ہے۔"

ایک نے کہا: "منٹو دادا! کیا آپ نے دیکھا تھا کمپارٹمنٹ میں ایک عورت چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ ضرور بہاری عورت ہے اور خسرو بھی بہاری ہے۔ مالدار ہے۔ یقیناً اپنے ساتھ ہماری رقم لے کر جا رہا ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا: "ہاں، منٹو دادا! میں نے دیکھا ہے۔ اس پیچھے والی برتھ پر ایک چھوٹی سی پیٹی رکھی ہوئی تھی۔ اسی میں مال ہو گا۔"

منٹو دادا نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "اگر یہ دونوں بہاری ہیں اور اپنے ساتھ مال لے کر جا رہے ہیں تو یقیناً سید پور جا رہے ہیں۔ اُتر بنگال میں سید پور کے علاوہ ان بہاریوں کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

منٹو دادا نے اپنی اسٹین گن سنبھالی۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں آیا جس میں بنگلہ دیش رائفلز کے مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں ان کا آفیسر بھی تھا۔ وہ اپنے جوانوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ منٹو دادا کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کمپارٹمنٹ کے اندر آتے ہوئے بولا: "سر! ہم آپ کو اپنا بڑا مان کر آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنے ایک سوال کا جواب چاہیے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہم نے یہ دیش جس سے آزاد کرایا کیا ہم پاکستانیوں کو استحصال کرنے والا نہیں کہتے تھے۔ ہم ان کے خلاف آواز یہ اٹھاتے تھے کہ وہ بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

آفیسر نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "بے شک، یہ درست تھا اور انہیں استحصال کی سزا مل چکی ہے۔"

"آپ نے انہیں سزا دی لیکن ان کی جگہ ہندو مارواڑیوں اور [illegible] کو ہم پر مسلط کر دیا۔ یہ جب چاہتے ہیں یہاں کا مال اِدھر سے اُدھر پہنچا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ جن بہاریوں نے ہماری ماں بہنوں کی عزتیں لوٹیں، ہمارے بنگالی بھائیوں کو ہلاک کیا، یہ ہندو مارواڑی انہیں کبھی سرحد پار لے جا کر حفاظت سے چھوڑ دیتے ہیں، کبھی انہیں سید پور یا ڈھاکہ کے محمد پور اور میرپور میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ تو جیسے

پہلے تھے ویسے ہی اب ہیں۔ پہلے بھی استحصال ہوتا تھا اب بھی ہو رہا ہے۔ کیا فرق پڑ گیا آزادی سے؟"

آفیسر نے کہا: "تم مکتی باہنی کے جوانوں کو صرف تشدد اور ہتھیار کا استعمال کرنا سکھایا گیا ہے۔ تم لوگ سیاست کو نہیں سمجھتے۔ جب پاکستان بنا تو ہمارے پورے بنگال کی حیثیت کلکتہ کی بندرگاہ کے بغیر ایسی ہی تھی جیسے روح کے بغیر جسم ہوتا ہے۔ تقسیم بنگال کے بعد جب حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت سے کلکتہ کی بندرگاہ کو چند ماہ کے لیے عارضی طور پر استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تو سردار پٹیل نے جواب دیا۔ چند ماہ تو کیا چند دنوں کے لیے بھی کلکتہ کی بندرگاہ نہیں دی جائے گی اور آج دیکھ لو ہم نے بنگلہ دیش بناتے ہی کلکتہ کی بندرگاہ اپنے تجارتی مقاصد کے لیے حاصل کرلی ہے۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

منٹو دادا نے طنزیہ انداز میں کہا: "جی ہاں، یہاں سے کلکتہ تک راستہ صاف ہے مگر ہمارے لیے نہیں بلکہ ہندو تاجروں اور اسمگلروں کے لیے۔"

وہ آفیسر نے ڈانٹ کر کہا: "بکواس مت کرو۔"

"سر! آپ اپنے عہدے کے بل پر ہمیں خاموش رہنے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن ہم وہی بنگالی ہیں، جنھوں نے پاکستانی آرمی کے سامنے بھی اپنی زبان بند نہیں کی۔ آپ تو پھر بھی ہمارے دیش کے ہیں۔ آپ صاف صاف سن لیجیے۔ ہم مکتی باہنی کے جوانوں کو آپ لوگوں نے شہروں میں پھیلا دیا تاکہ ہم گنے چنے بیوپاریوں کو لوٹیں اور انھیں مارتے رہیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہیں اور ادھر آپ لوگ سرحدی علاقوں میں ہندو اسمگلروں کے ذریعے دولت کماتے رہیں۔ کیا یہ ہندو تسلسل سے تمام جن بیوپاریوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ان کے پاس اچھی خاصی رقم نہیں ہے۔ کیا یہ ہندو ہمارا کوئی سامان یہاں سے وہاں اسمگل نہیں کر رہے ہیں اور اس کے پیچھے آپ خود کتنی دولت سمیٹ رہے ہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ ہم نادان نہیں ہیں۔"

آفیسر کا رنگ اپنے جلال سے بدل گیا جیسے ریوالور نکال کر ابھی منٹو دادا کو شوٹ کر دے گا۔ وہ غصے سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم نرم پڑ گیا۔ اس نے آہستگی سے کہا "بیٹھو، اطمینان سے بات کرو۔"

وہ بیٹھ گیا۔ آفیسر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "حکومت کرنے والوں کی الگ الگ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح کاروبار کرنے والوں کی بھی الگ خاص مجبوریاں ہوتی ہیں اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں سے بھی تعلقات الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ مکتی باہنی کے جوان دلیر ہیں۔ اور بنگلہ دیش بنانے میں انھوں نے بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے باوجود فوجی اعتبار سے مکتی باہنی طفلِ مکتب ہیں۔ ابھی نوآموز ہیں۔ اسی لیے ہم نے تم لوگوں کو بنگلہ دیش کا اندرونی علاقہ دیا ہے تاکہ شہروں میں رہو اور خاص خاص بندرگاہوں اور دریائی راستوں پر ڈیوٹی دیتے رہو۔ تمھاری ڈیوٹی کے دوران ہم نے کبھی حساب طلب نہیں کیا کہ تم کس سے کتنا لوٹتے ہو۔ کتنی دولت سمیٹ رہے ہو لیکن آج تم لوگ میدان میں اتر کر ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے آئے ہو۔ ہم سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ سرحدوں پر ان کا لحاظ، انڈین آرمی بھی ہے۔ ہندو بنیے بھی ہیں اور بہت سے جرائم پیشہ لوگ بھی ہیں۔ ہم ان سے نمٹ رہے ہیں۔ بیشک ان لوگوں سے ہمارا کچھ لین دین ہے لیکن ہم اپنے دیش کو ان کے ہاتھوں نہیں بیچ رہے ہیں۔"

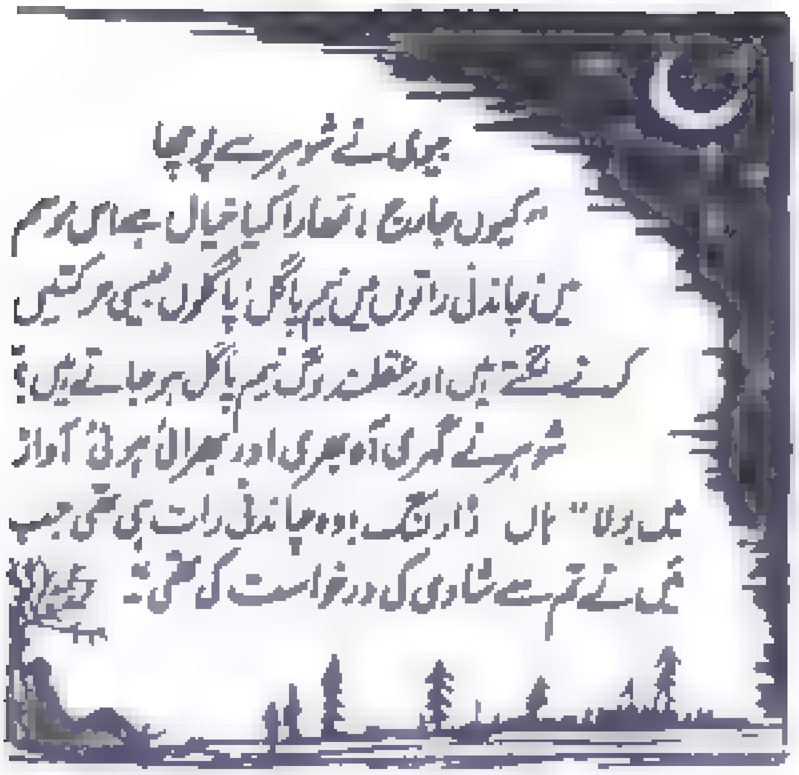

بیوی نے شوہر سے پوچھا

"کیوں جارج! تمھارا کیا خیال ہے جبکہ ہم چاندنی راتوں میں نیم پاگل، پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور عقلمند لوگ نیم پاگل ہو جاتے ہیں؟"

شوہر نے گہری آہ بھری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہاں ڈارلنگ! وہ چاندنی رات ہی تھی جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔"

منٹو دادا نے کہا: "آپ میں اور ہم میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ہم بنگلہ دیش کے دشمن بیوپاریوں سے کچھ چھین کر حاصل کرتے ہیں لیکن آپ سرحدوں پر انڈین آرمی، ہندو تاجروں اور اسمگلروں کے لیے راستے ہموار کر رہے ہیں۔ ان راستوں سے بنگلہ دیش میں ہندو سامراجی قوتیں پھل پھول سکتی ہیں۔"

آفیسر نے کہا: "یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ ہم انڈین گورنمنٹ کو بھی اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن یہ اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ذرا وقت لگے گا۔ ابھی انھوں نے ہم پر احسان کیا ہے۔ ہم ان کا احسان مانتے ہیں۔ بہرحال بات سیاست کی ہو رہی ہے۔ یہاں تم ملک کے تحت تقریر کرنے بیٹھے ہو۔ کوئی سیاسی لیڈر تقریر کے دوران یہ نہیں کہتا کہ اسے اقتدار کا لالچ ہے۔ وہ صرف ملک اور قوم کی باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح تم نے کسی اور مقصد سے یہاں گفتگو کر رہے ہو جیسے بنگلہ دیش کا سارا درد تمھارے ہی جگر میں ہے

کام کی بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بہاری کے ایک بچے کو بھی زندہ چھوڑنا نہیں چاہتے اور فرسٹ کلاس کے اس کمپارٹمنٹ میں تلسی رام کے رشتے دار نہیں بلکہ بہاری ہیں۔"

"وہ بہاری نہیں بنگالی ہیں۔ اس کا نام خسرو ہے۔ یہ خالص بنگالی ہے۔ [illegible] اس کی الیکٹریکل گڈز کی دکان تھی۔ تلسی رام کے گھر والوں سے خسرو کے گہرے مراسم ہیں۔ وہ تلسی رام کی [illegible] سے ملنے سید پور جا رہا ہے۔"

منشو دادا نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا: "آپ مجھے نادان بچہ سمجھ رہے ہیں۔ اگر خسرو بنگالی ہے تو اس کے لیے اتنا سخت پہرہ کیوں ہے۔ اس کے کمپارٹمنٹ کے آگے والے کمپارٹمنٹ میں بی ڈی آر کے دو مسلح جوان ہیں اور پیچھے والے کمپارٹمنٹ میں بھی دو مسلح جوان اس کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔ کیوں؟ تاکہ آگے پیچھے کہیں سے ان پر کوئی حملہ کر سکے۔ آخر ان کے لیے کون سا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے؟"

افسر غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تحکمانہ انداز میں بولا: "اسٹینڈ اپ اینڈ اٹینشن۔"

اس کا حکم سنتے ہی منشو دادا اور اس کے ساتھی ایک دم سے اٹینشن ہو گئے۔ افسر نے پوچھا: "تم لوگ بنگلہ دیش اور بنگلہ دیش کی آرمی کے تابع فرمان ہو؟"

اس نے بدستور اٹینشن رہ کر کہا: "یس سر! وی آر لوئل ٹو بنگلہ دیش اینڈ وی ڈیوٹ ٹو بنگلہ دیش آرمی۔ جی ہاں جناب! ہم بنگلہ دیش کے وفادار ہیں اور بنگلہ دیشی آرمی کے تابع فرمان ہیں۔"

افسر نے کہا: "تمہارے پاس بھارت کے ہتھیار ہیں لیکن یہ ہتھیار ہمارا اعتماد بحال رکھنے کے لیے تمہیں دیے گئے ہیں۔"

"یس سر! ہم نے اب تک آپ کا اعتماد بحال رکھا ہے اور آئندہ بھی رکھیں گے۔"

"تم سب شناختی کارڈ کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتے جب تک ہم وہ کارڈ جاری نہ کریں نہ کوئی تمہیں مکتی باہنی کا سپاہی کہے گا اور نہ ہی تمہیں ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔"

"یس سر! یہ سب باتیں ہم جانتے ہیں۔"

"جانتے ہو پھر بھی اپنے دیش کے فوجی افسر سے بحث کرنے آئے ہو۔ ابھی میں چاہوں تو تمہارے شناختی کارڈ واپس لے سکتا ہوں۔ یہ ہتھیار اتروا سکتا ہوں۔ پھر تم لوگوں کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ محض بنگلہ دیش کے عام باشندے کہلاؤ گے۔ تمہارا کہیں رعب دبدبہ نہیں رہے گا۔ یہ جو اتنی شان سے سینہ تان کر چلتے ہو تو میرے ایک معمولی حکم کے بعد تمہاری گردنیں جھک جائیں گی۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

منشو دادا اور اس کے ساتھیوں نے سر جھکا لیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بی ڈی آر کا وہ افسر کسی ہندو بنیے یا اسمگلروں کا ساتھ دے رہا تھا تو اس کے خلاف سیاسی میدان میں آواز اٹھائی جا سکتی تھی اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی بولنے سے پہلے انہیں ہتھیار رکھ دینا پڑتا۔ اپنا شناختی کارڈ واپس کرنا پڑتا۔ ہتھیاروں سمیت بغاوت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیچھے انڈین آرمی تھی۔ جو ان سے ہتھیار چھین سکتی تھی یا اپنے ہتھیاروں سے انہیں خاک میں ملا سکتی تھی۔

افسر نے ان کی بے بسی پر مسکرا کر کہا: "اس بار میں معاف کرتا ہوں۔ آئندہ یاد رکھنا۔ جوش میں آنے سے آدمی ہوش کی باتیں بھول جاتا ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "جے بانگلہ۔"

منشو دادا اور اس کے ساتھیوں نے فوجی انداز میں ایڑیاں بجا کر کہا: "جے بانگلہ۔" پھر وہ اباؤٹ ٹرن ہو کر یکے بعد دیگرے اس کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گئے۔ منشو دادا اسٹین گن کاندھے سے لگائے سینہ تان کر پلیٹ فارم پر چلتا ہوا اس کمپارٹمنٹ سے دور ہونے لگا۔ اس کے ساتھی پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ سب انجن کے قریب جا کر رک گئے۔ منشو دادا سوچنے کے انداز میں دور خلا میں تک رہا تھا۔ ایک ساتھی نے پوچھا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہمیں اپنی توہین کا احساس ہو رہا ہے۔"

منشو دادا نے ناگواری سے کہا: "احساس ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بعض حالات میں صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ خسرو کو سید پور پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک عورت ہے اور ایک بچی ہے اور سید پور یہاں سے بہت دور ہے۔ گاڑیاں کسی کسی اسٹیشن پر گھنٹوں رک جاتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ گاڑی شاید آدھی رات کو سید پور پہنچے گی۔"

وہ ٹہلنے اور سوچنے کے انداز میں اس بورڈ کی طرف گیا جس پر اردو، بنگلہ اور انگریزی زبان میں ایشرڈی لکھا ہوا تھا جس جگہ اردو زبان میں لکھا گیا تھا اس جگہ گوبر کے اُپلے تھاپ دیے گئے تھے۔ منشو دادا نے وہاں سے ہٹ کر کہا: "ہم بنگلہ دیش کے وفادار ہیں اور اپنی فوج کے تابع فرمان ہیں۔ ہمارے افسر نے جو کچھ کہا ہے، ہم اس پر عمل کریں گے اور اس کی مرضی کے خلاف ان بہاریوں کو نہیں چھیڑیں گے لیکن..."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس نے کہا: "لیکن یہاں سب لالچ کے بندے ہیں۔ یہ افسر یقیناً وہیں تک جائے گا جہاں تک اس کی اندھی کمائی ہو گی اور ایسے افسروں کی اندھی کمائی بل باندھ

تک رکتی ہے۔ اس کے بعد گاڑی آگے نکلے گی تو...."

وہ کہتے کہتے پھر رک گیا۔ پھر اس نے کہا: "تم پہلے اپنے باقی ساتھیوں کو کمپارٹمنٹ میں جمع کرو۔ ہم وہاں بیٹھ کر پلاننگ کریں گے۔

وہ عورت اور وہ ابھی ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔"

انجن کے پیچھے والی بوگی میں ماضوا نے پہلے سے ایک کمپارٹمنٹ مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ سب [illegible] تھے۔ پسنجر ٹرین جھٹکے لے رہی تھی۔ انجن سیٹی بجا رہا تھا۔ گاڑی [illegible] والی تھی۔ آگے بہت لمبا سفر تھا لیکن سفر کے اختتام سے پہلے وہ گاڑی راستے کے کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی یا روکی جانے والی تھی۔

ثمن تارا نے پچھلے دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ والدین کی موت کے بعد بھوک اڑ گئی تھی۔ خسرو نے اسے سمجھا کر کھلا دیا۔ زندہ رہنا ہو تو معدے میں پہنچنے سے اور جاگتے کی ضرورتوں کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ کھانے کے بعد ریلوے کینٹین کا بیرا آیا تھا۔ معدے کے برتن لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد ہی گاڑی چل پڑی۔ جب اس کی رفتار تیز ہونے لگی تو خسرو نے کہا: "میں کھڑکیاں کھول دیتا ہوں۔"

وہ سہم کر بولی: "نہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اب کس بات کا ڈر ہے۔ گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ کوئی اندر نہیں آسکتا ہے۔ آگے پیچھے کے ڈبوں میں ہمارے محافظ موجود ہیں۔"

"یہ محافظ آخر کہاں تک ساتھ دیں گے؟"

"سید پور تک۔"

"اس کے بعد؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا: "تم اس کے بعد کا پوچھ رہی ہو۔ یہاں تو ایک پل کے بعد کیا ہو گا اس کی خبر نہیں ہے۔"

"یہی میں کہنا چاہتی ہوں۔ سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ محافظ کب تک ساتھ دیں گے۔ کہیں باہر سے کوئی گولی سنسناتی ہوئی آئے گی اور میں اس کے آگے سوچتی ہوں تو کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو جائے تو میرا کیا ہو گا۔ تم میرے سائبان ہو۔ میری چار دیواری ہو۔ میری شرم و حیا کا لباس ہو۔ سپاہی ہتھیار ڈال دیں تو شکست ہو جاتی ہے۔ مرد ہتھیار ڈال دے تو عورت پرائی ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے چھپا لے جاؤ گے (قسمت میں نہیں جانے دو گے) آخری سانسوں تک میری حفاظت کرتے رہو گے۔ مجھے صرف تم پر صدمہ ہے۔ میں تمہاری سلامتی چاہتی ہوں۔ اس لیے کھڑکی مت کھولو۔"

خسرو برتھ کے ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ دوسرے سرے پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں کافی فاصلہ تھا۔ کافی جگہ تھی۔ اس سے زیادہ دل میں جگہ تھی لیکن دل میں خسرو کے نام کا ریزرویشن تھا۔

ابھی تو وہ منہ لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چور نظروں سے درمیانی خلا کو حسرت سے دیکھتا تھا۔ ادھر وہ بھی کن انکھیوں سے خالی خلا کو دیکھتی تھی لیکن پیار بھرے اندیشوں سے دیکھتی تھی کہ وہ کہیں ادھر نہ چلا آئے۔ وہ آئے گا تو ناراض ہو جائے گی، نہیں آئے گا تو بے چینی بڑھ جائے گی۔ عجیب مشکل تھی۔

وہ دونوں اسی طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ایک اسٹیشن گزر گیا۔ پھر دوسرا اسٹیشن بھی گزرنے لگا۔ خسرو نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا: "ہم بھی عجیب ہیں۔ چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ بولنا چاہیے۔"

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ دوسرے اسٹیشن پر گاڑی رک گئی تھی۔ خسرو نے بات بدلتے ہوئے کہا: "یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا، تم بنگلہ کس حد تک جانتی ہو۔ کیا بول سکتی ہو؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

"کیا پڑھ سکتی ہو؟ لکھ سکتی ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ خسرو نے بنگالی زبان میں کہا: "گاڑی اس اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے۔ ہمیں ایسے وقت بنگلہ ہی بولنا چاہیے.... تاکہ کوئی دشمن کمپارٹمنٹ کے قریب سے گزرتا ہو اور کان لگا کر سننا چاہتا ہو تو اسے بنگلہ سنائی دے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر بولا: "ابھی سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تمہاری زبان سے بنگلہ بھاشا سننا چاہتا ہوں۔ کچھ تو بولو۔"

وہ آہستگی سے بولی: "آمی ایکی بھاشا بوجھتے پاری۔ ٹھیک کورے بولتے پاری نا۔" (میں یہ زبان سمجھ لیتی ہوں لیکن اچھی طرح بول نہیں سکتی۔)

خسرو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا: "تم تو درست کلاس بول رہی ہو۔ ذرا سی کسر ہے۔ میرے ساتھ رہتی رہو گی تو جلد ہی ثابت کر دو گی کہ عورت ہر زبان میں بے تحاشا بول سکتی ہے۔"

ثمن تارا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی۔ اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کا غم بھاری تھا۔ یہ غم اچانک آنے والی چند مسکراہٹوں پر بھی جنازہ ڈال دیتا تھا۔ اس نے کہا: "میں [illegible] غم کا ہو یا خوشی کا بے اختیار ہوتا ہے۔ جب تم بے اختیار رو سکتی ہو تو بے اختیار مسکرانا بھی چاہیے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے دن رات روتے رہنے میں عمر گزار دی ہو۔ ماتم کرنے والے بھی انسانی فطرت کو کھوتے ہیں۔ آخر وہ سید

پیٹ کو انھیں کے لیے بیچتے ہیں، تو دو مسلوں کی نظر [illegible] گئی:

کسی کسی سپاہی کا شاہد ہوتا ہے۔ وہ صدر دروازے سے [illegible] کر رہے تھے [illegible] باپ ہی کی طرح لوٹ رہے تھے مگر [illegible] ایک ساعت کے لیے اس کا معمولی سا [illegible] اس کا دروازہ تک پہنچ گیا تھا۔ پھر اس کو [illegible] کہ نہایت [illegible] صورت [illegible] نظر آ جاتی ہے۔

وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ کمپارٹمنٹ کی طرف [illegible] اسی طرح [illegible] تلسی رام نے آکر دوسرے [illegible] دروازہ کھول تک تھوڑی دیر میں ہوں:

اس نے مطالبہ شعار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹیشن پر بھیڑ کی وجہ ہوگی۔ اس بلکہ دو سرحدی اسٹیشن تھا۔ اور آبادی تو ہونے [illegible] تھی۔ اس کے راستے میں دراز پاکستانی یا ہندوستانی فوج کے سپاہی کبھی کبھی نظر آتے تھے۔ وہاں سے دور دور آبادی علاقہ [illegible] کبھی کبھی ملتی تھیں [illegible] اسٹیشن کے آس پاس کبھی [illegible] کا بازار [illegible] اس کے باوجود سرحدی اسٹیشن [illegible] کسی [illegible] وہاں بھی پالیسی کے میدان میں اچانک [illegible] ناپسندیدہ [illegible] وہ اسٹیشن تقریباً ویران رہا کرتا تھا۔

لیکن خسرو نے دروازہ کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں اچھی چہل پہل تھی جیسے میلہ لگا ہو۔ بے شمار عورتوں اور بچوں کے چہرے [illegible] خوف اور ہول [illegible] کے سامنے [illegible] دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ عورتیں اور بچے گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن وہاں عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں اور بچے بھی تھے۔ زیادہ تر ہندو عورتیں تھیں، کہیں کہیں بنگالی عورتیں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ مرد [illegible] مسلمان بنگالی کم تھے۔ [illegible] دھوتی کے پہناوے سے یا لنگی سے پہچانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کی تعداد بھی بہت مناسب تھی۔ کیونکہ [illegible] سے [illegible] کوئی گاڑی جلپائی گوڑی اور [illegible] تک جانے کا راستہ [illegible] اور مختصر تھا۔ ہندو تاجر دوسرے کاروباریوں سے ملنے اور اس بات کا جائزہ لینے کے لیے وہاں آتے تھے [illegible] بنگلہ دیش میں ان کے [illegible] کی اہمیت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگر ابھی کاروبار کے لیے [illegible] رہے تھے لیکن مستقبل میں بڑے ہی روشن امکانات تھے۔

تلسی رام نے کہا [illegible] پلیٹ فارم [illegible] سے [illegible] یوں سمجھو کہ اب [illegible] ہندوستان میں ہو۔ یہاں ہمارا راج ہے:

[illegible] پلیٹ فارم [illegible] بولی [illegible] نہیں:

میں [illegible] جاؤں گی، مجھے ڈر لگتا ہے [illegible] تم نہیں ہو نہیں جانے دوں گی:

کیسی باتیں کرتی ہو، جہاں جی اپنے کام سے مجھے یہاں لائے ہیں، ان کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ میں تمھیں یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا ہوں:

تلسی نے سر جھکا کر چند لمحوں تک سوچا۔ پھر انیتا کی طرف دیکھا۔ سوچنے لگا: اسے یہیں رہنے دو۔ دروازہ بند رہے گا۔ کوئی مسافر اس کمپارٹمنٹ میں نہیں آئے گا:

وہ بولی: اس ڈبے میں میری بات [illegible] اور کچھ تصویر [illegible] ان کی کچھ دیر بعد میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گی:

خسرو نے [illegible] تارا اس کے پیچھے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر آ گئی۔ پلیٹ فارم کے پیچھے [illegible] بازار لگا ہوا تھا۔ غریب بنگالی مسلمان بنگلہ دیش کے مشہور پھل اناس اور کیلے وغیرہ فروخت کرنے لاتے تھے۔ اگرچہ مغربی بنگال میں مچھلیاں کثرت سے [illegible] جاتی تھیں۔ اس کے باوجود مسلمان ماہی گیر بڑا مچھلی اور جھینگے سستے داموں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔ ہندوستانی خریداروں کو کاٹن کی لنگیاں اور [illegible] کی ساڑیاں بھی سستے داموں مل جاتی تھیں۔ گویا کہ وہاں ایک سرحدی بلیک مارکیٹ بن گئی تھی۔

صرف اتنا ہی نہیں، اسٹیٹ ایجنسی کے طور پر کئی دفتر قائم ہو گئے تھے۔ بنگلہ دیش کے متعلق ہندوستانی تاجروں اور دوسرے معروف شہروں کی معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ دیناج پور، رنگ پور، لال منیر ہاٹ، سنتاہار، ایشوردی اور بنگلہ دیش کے دوسرے شہروں سے بہاری بھاگ کر سید پور یا ڈھاکہ کی طرف گئے تھے یا سرحد پار چلے گئے تھے۔ ان تمام شہروں میں بہاریوں کے بے شمار مکانات خالی پڑے ہوئے تھے۔ وہاں اسٹیٹ ایجنسی میں ہندوستانی معروف شہروں کو ہر مکان کا محل وقوع اور دوسری تفصیلات بتائی جاتی تھیں اور یقین دلایا جاتا تھا کہ معمولی سی رقم کے عوض وہ مکان ان کے حوالے کیے جا سکتے ہیں اور ایسے بہت سے بنگالی [illegible] تھے جو بنگلہ دیش میں اپنا کاروبار جمانے، وہاں کی زمینیں خریدنے یا آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کرنے کے لیے [illegible] اختیار کرنا چاہتے تھے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق نہایت سستے مکانات مل رہے تھے۔

تلسی تارا اور خسرو تلسی رام کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ منشا داد [illegible] اور اس کے ساتھی دور کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے لیکن دوسروں نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ بی ڈی آر کے [illegible] دوسرے مسلح سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ بی ڈی آر کا ایک ممبر ایک اور بی ڈی آر کے افسر سے [illegible] ہوئے مسلسل بحث کر رہا تھا۔

ایک ساتھی نے آہستگی سے پوچھا: منٹو دادا! آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟

کون سی لڑکی؟

وہی جو خسرو کے ساتھ چادر میں لپٹی جا رہی تھی۔

دوسرے نے کہا: میں نے دیکھا ہے۔ غضب کا حسن ہے۔ ٹی ایم تیور، اور دوسرے بہلی اسٹیشن ہوئے تھے۔ میں یقین سے کہتا ہوں۔ اس پر حسن ختم ہو گیا ہے۔

منٹو دادا نے گمبھیر لہجے میں کہا: اپنی کو دیکھو۔ لڑکی کو نہ دیکھو۔ دولت پاس ہو تو عورت قدم قدم پر مل جاتی ہے۔

ایک نے کہا: ہمیں دوسرے پہلو سے اس لڑکی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اس نے ماتھے پر ٹیکہ اور مانگ میں سیندور لگایا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟

منٹو دادا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھ کر پوچھا: کیا ہو سکتا ہے؟

یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔ تلسی رام اسٹیشن ڈی کے اسٹیشن پر کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے رشتے دار ہیں لیکن بعد میں خسرو مسلمان ثابت ہوا۔ اب جو لڑکی اس کے ساتھ ہے وہ ہندو نظر آتی ہے۔

کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہماری بنگالی عورتیں بھی ماتھے پر ٹیکہ اور مانگ میں سیندور لگاتی ہیں۔

اگر ہماری بنگالی عورتیں ایسا کرتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خسرو کے ساتھ ایک بنگالی عورت ہے کیوں ہے؟ کس رشتے سے ہے؟ اور وہ ہماری کسی عورت کو اپنے ساتھ کیوں لے جا رہا ہے؟

منٹو دادا نے غصے سے تیوری چڑھا کر کہا: اگر اس کے ساتھ بنگالی لڑکی ہوئی تو میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔

پہلے ہمیں جا کر پوچھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہیں گے کہ وہ بنگالی نہیں ہے ہندو لڑکی ہے۔ پھر بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہندو لڑکی ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ کس رشتے سے سفر کر رہی ہے؟

ہم سیدھے طور پر ایسے سوالات کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس سیدھے اور صاف جوابات ہوں۔ ادھر پی ڈی آر کے آفیسر نے پہلے ہمارے ساتھیوں کے ساتھ اس کا رشتہ [illegible] کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ یہاں سے آگے نہیں جائیں گے۔ خسرو آگے سفر کرے گا یا نہیں، یہ معلوم کرنا ہے۔ اگر وہ اس لڑکی کے ساتھ ہی سے آگے جانے والا تو ہمارے لیے شرم کی بات ہے۔ لہٰذا خسرو کے متعلق معلوم کرو۔

[illegible] نے ساتھی چلے گئے۔ ان کو [illegible] ہی [illegible] تھا [illegible]

میں تار اور خسرو تلسی رام کے ساتھ گئے تھے۔ وہ تینوں اسٹیشن سے ذرا دور مال گودام میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس اور بہت سے لوگ تھے۔ وہ سب تلسی رام کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک وہی پی ڈی آر کا آفیسر تھا۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا۔ انڈین آرمی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہو رہا تھا۔ گودام کے آس پاس تلسی رام کے آدمی موجود تھے۔ اگر کوئی ہندوستانی آفیسر ادھر آتا تو تلسی رام کو فوراً اطلاع دی جاتی۔

مال بابو نے اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ میں نے سارا کام کر دیا ہے۔ آپ لوگ چنتا نہ کریں۔

ایک آفیسر نے کہا: ہمیں ہر طرف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہم یہی دیکھنا چاہتے تھے کہ یہاں سے ویگن کا مال جدھر جائے گا۔ وہاں ڈلیوری کس طرح لی جائے گی۔

بوڑھے مال بابو نے ایک بڑا سا رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے تلسی رام جی کے نام سے یہاں دو ویگن جا رہے ہیں۔ ایک ویگن سید پور کے لیے بک ہوا ہے اور دوسرا جلپائی گوڑی کے لیے۔ ریلوے کھاتے کے مطابق جلپائی گوڑی جانے والے ویگن میں ڈیڑھ سو بوری آٹا، ڈیڑھ سو بوری چاول اور پچاس بوری ستو ہے۔ سید پور جانے والے ویگن میں تلسی رام جی کے گھر کے لیے فرنیچر ہے۔"

ایک آفیسر نے پوچھا: فرنیچر زیادہ سے زیادہ کتنا ہوگا؟ کیا کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ اس کے لیے ایک ویگن بک کیا گیا ہے؟

تلسی رام نے مسکراتے ہوئے کہا: آپ اطمینان رکھیں۔ سات کمروں کا فرنیچر ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجئے کہ کتنا ہو سکتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس ویگن میں سمایا ہے۔

آفیسر نے مطمئن ہو کر مال بابو سے پوچھا: لیکن راشن والا ویگن سید پور کیسے پہنچے گا؟

اس نے جواب دیا: مال کی بلٹی دو طرح کی بنائی گئی ہے۔ ایک بلٹی کے مطابق راشن جلپائی گوڑی جا رہا ہے۔ یہ دونوں ویگنوں کی بلٹیاں [illegible] کے کارڈ [illegible] دی گئی ہیں۔ اب ہندوستانی جاسوس یا [illegible] کوئی بھی [illegible] کے پاس جا کر کاغذات کی چیکنگ کرے گا تو [illegible] یہی سمجھیں گے کہ ہندوستان کا [illegible] جلپائی گوڑی [illegible] جا رہا ہے۔

مال بابو نے ایک فائل سے چار عدد کاغذات نکال کر آفیسر کو دکھاتے ہوئے کہا: اصل بلٹی یہ ہے۔ اس کے مطابق راشن سید پور [illegible] اور فرنیچر والا ویگن جلپائی گوڑی بھیجا جائے گا۔ ہر جگہ [illegible] ایک [illegible] رہتی ہے۔ اس سے [illegible] کے مطابق وہ ویگن [illegible] بھیجا جائے [illegible] آگے جانے کے بعد جلپائی گوڑی کا ٹکٹ

سلپ نکال کر سید پور والی ویگن میں لگا دی جائے گی، اور سید پور والی ٹیپ سلپ نکال کر جلپائی گوڑی والی ویگن میں لگا دی جائے گی۔ [illegible] آدمی ہے۔ آگے جانے کے بعد جن کے پاس [illegible] وہ [illegible] کر دے گا۔ ہمارے آدمی اسے یہ بلٹیاں دے دیں گے۔"

"[illegible] کے بعد کانی [illegible] پوچھے گا کہ اناج والا ویگن وہاں کیوں نہیں پہنچا؟"

"[illegible] کے مطابق تو مال [illegible] سے وہی وصول کیا جائے گا۔"

[illegible]

تو وہ متعلقہ جاسوسوں کی ڈیوٹی لگائی گئی، وہ اپنے [illegible]

"یہ مکمل اور صرف مکمل ہے جو تمہاری موجودہ خراب حالت کی [illegible] ہے۔" ڈاکٹر نے [illegible]

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!" میں نے جواب دیا۔ "آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے میری خراب حالت کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں کی ہے۔"

دیا [illegible] بات [illegible]

خسرو نے جواب دیا: "اسمگلنگ ہم [illegible] یہ کام سید پور پہنچنے کے بعد شروع ہوگا۔ وہ تمام مال [illegible] اور اس کا حساب رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

"[illegible] کیسے [illegible] ہوگا؟"

"[illegible] کی بات درست ہے [illegible]

[illegible]

یہی حال مشرقی پاکستان کا ہوا۔ اگرچہ یہاں [illegible]

[illegible]

[illegible] بازار سے ہوتے چلیں [illegible] پھر کر باہر [illegible] میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ عام [illegible] مختلف تقریبات کی [illegible] دونوں محلوں کے درمیان کی واضح [illegible] سے اچھا [illegible] کے لئے پڑوس ان کے [illegible]

[illegible] محلوں سے دور ہے [illegible]

[illegible] کی وارننگ کا فرسٹ

حیثیت نہیں رکھتی [illegible] بچے ہیں [illegible]
[illegible] کی طرف [illegible]

[illegible]

[illegible] رکھے [illegible]

[illegible] ہوں گے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] پانی [illegible] نظر [illegible]
[illegible]

متروکہ [illegible] نے کہا [illegible] فساد دیکھے [illegible]

کیا دھندہ چل رہا ہے۔ بنگلہ دیش کی زمین ہماری ہے یہاں کے مکانات بھر رہے ہیں لیکن تم لوگ یہاں بیٹھ کر اطمینان سے چلا رہے ہو۔ [illegible] رقمیں بے کار [illegible] درست کر رہے ہو [illegible] انہیں ہماری [illegible] کر کھا رہے ہیں۔

ایک ہندو نے کہا: [illegible] جب بھی دو ملکوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے [illegible] ملکوں کے [illegible] ادھر ادھر جاتے ہیں تو ان کی چھوڑی ہوئی [illegible] ہوتا ہے۔

[illegible]

کراچی ہم بنگالی تاریخ [illegible]

[illegible]

رہ گئی ہے بہت کم [illegible]
[illegible] تم تو فرق [illegible]

سے نجات دلاؤ۔ تم لوگوں نے ہماری مدد سے یہ کام کر دکھایا۔ اب تمہارا کام ہماری نسلوں کا محاسبہ کرنا ہے۔ ہم تو دوست ہیں۔ ہمارے سرمایہ لگانے یا زمینیں خریدنے پر تمہاری حکومت کو اعتراض ہوگا تو ہم دوستانہ انداز میں واپس چلے جائیں گے۔“

اس کی باتیں پوری ہونے سے پہلے پلیٹ فارم پر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ منٹو دادا وہاں سے پلٹ کر پلیٹ فارم پر آیا۔ سفر کرنے والے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں رخصت کرنے والے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ خسرو پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا تلسی رام سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی تارا نظر آ رہی تھی۔ منٹو دادا اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اگرچہ وہ دور تھی۔ اس کے حسن کو تفصیل سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن ستارے بھی تو بہت دور ہوتے ہیں اور انھیں دیکھ کر کہنا پڑتا ہے۔ ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار، ہاؤ آئی ونڈر وہاٹ یو آر۔

منٹو دادا کے خشک سیاسی اور انقلابی دماغ میں یہ بات آئی، یہ ستارہ تو اتنی دور سے اتنا روشن ہے۔ میں حیران ہوں، قریب سے اس کے حسن کا عالم کیا ہوگا؟

ادھر تلسی رام خسرو سے کہہ رہا تھا: ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آگے کے اور پیچھے کے کمپارٹمنٹ میں اسی طرح دو دو مسلح سپاہی تم لوگوں کی حفاظت کے لیے موجود رہیں گے۔“

خسرو نے کہا: ”لیکن جیجا جی، وہ بی ڈی آر کا لیڈر اپنے سپاہیوں کے ساتھ یہاں اتر گیا ہے۔ مکتی باہنی والے ہمیں آگے جا کر پریشان نہ کریں۔“

”ان کی کیا مجال ہے کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکیں۔ گاڑی آگے جائے گی تو چوکائی اسٹیشن پر بھوانی پور اور پاربتی پور کے اسٹیشن پر بی ڈی آر کے سپاہی موجود ہوں گے۔“

انجن نے سیٹی بجائی۔ منٹو دادا دوڑتا ہوا اسی بوگی کے آخری ڈبے کی طرف جانے لگا جس میں خسرو اور نینی تارا سفر کر رہے تھے۔ خسرو نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا: ”وہ دیکھیے، مکتی باہنی کا لیڈر اسی بوگی کے آخری ڈبے میں سوار ہو رہا ہے۔“

تلسی رام نے پیچھے کمپارٹمنٹ کے سپاہی سے پوچھا: ”کیا تم نے مکتی باہنی کے اس جوان کو دیکھا ہے؟“

”سیٹھ جی! سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ان میں سے کوئی غنڈہ اس کمپارٹمنٹ کی طرف نہیں آ سکے گا... یہ صحیح سلامت سید پور پہنچیں گے۔“

گاڑی چل پڑی۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہلی اسٹیشن سے نکلتے ہی بجلی کی روشنیاں گم ہو گئیں۔ جنگل کی تاریکی نے اس گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریکی بڑی بندہ پرور ہوتی ہے۔ عزت اور افلاس کو چھپا لیتی ہے۔ تاریکی مہربان بھی ہوتی ہے۔ محبت کرنے والوں کو چھپ کر ملنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ وہ تاریکی بڑی سازشی بھی ہوتی ہے۔ جرائم کو پھلنے پھولنے میں مدد دیتی ہے۔ اس بوگی کے آخری ڈبے میں منٹو دادا کے سات ساتھی بیٹھے ہوئے منصوبہ بندی کر چکے تھے اور اب عمل کرنے کی دیر تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ منٹو دادا نے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے کہا: ”آگے پنچ بی بی کا اسٹیشن ہے۔ پنچ بی بی کے علاقے میں بجلی نہیں ہے۔ وہاں اسٹیشن پر لالٹینوں کی روشنی ہوگی۔ اندھیرے میں کوئی یہ دیکھنے نہیں آئے گا کہ بوگیوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے۔ اسد اللہ اور مجنوں دادا! تم دونوں اس بوگی کے اگلے حصے میں جاؤ گے اور شانٹ راڈ کے پیچ کو ذرا ڈھیلا کر دو گے۔ اس کے دو طرفہ ویکیوم کو اس حد تک لوز کر دو گے کہ گاڑی چلنے کے دوران انھیں کھولنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔“

دو جوان مجنوں دادا کے بیٹھنے پر ایک بڑے سے بیگ کو کھول رہے تھے۔ اس بیگ میں مختلف سائز کے پانے، پیچ کس، آری اور ہتھوڑے وغیرہ موجود تھے۔ منٹو دادا نے کہا: ”دو بوگیوں کے درمیان دو پہیے ہیں۔ اسد اللہ تم اگلی بوگی کے پہیے پر رہو گے۔ مجنوں دادا ہماری بوگی کے پہیے سے لگے رہیں گے۔ جب شانٹ راڈ کھل جائے

دولہا میاں دوستوں کے نرغے میں سہرا باندھے بیٹھے تھے۔ نکاح پڑھایا جا چکا تھا۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں اور خیال تھا کہ کچھ ہی دیر میں دولہا میاں کو آرسی مصحف کے لیے گھر میں بلا لیا جائے گا۔

اسی اثنا میں ایک نوجوان لڑکا دولہا میاں کے پاس پہنچا اور ان کے کان میں سرگوشی کرتا ہوا بولا: ”کیا آپ کے پاس اپنی بیوی کے عشقیہ خطوط موجود ہیں؟“

دولہا میاں نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے اس نوجوان کی طرف سر ہلاتے ہوئے دیکھا: ”نہیں۔“

نوجوان ان کے کان پر تھوڑا سا اور جھک گیا اور بولا: ”تو خریدنا پسند کریں گے؟ میرے پاس آپ کی بیوی کے [illegible] خطوط ہیں۔“

گا تو پوری گاڑی کے ساتھ اسداللہ چلا جائے گا اور ہم گاڑی کے کٹے ہوئے اس ڈبے کے ساتھ جنگل میں رہ جائیں گے۔"

◆

نین تارا واش روم سے باہر آکر دروازے کو بند کرنے لگی۔ خسرو نے کہا "میں سمجھ رہا تھا، شاید تم لباس تبدیل کر رہی ہو۔ باتھ روم میں پانی آرہا ہو تو غسل کر لو۔"

"پانی تو آرہا ہے لیکن کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ آتے آتے رُک سکتا ہے۔"

اس نے مسکرا کر کہا "اگر ایسا ہوتا ہے۔ بدن میں صابن لگا کر شاور کھولو تو پانی غائب۔"

وہ برتھ کے آخری سرے پر آکر بیٹھ گئی۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ خسرو نے کہا "زرو دیدی تمھیں دیکھیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔ گلے سے لگائیں گی اور تمھیں آشیرواد دیں گی۔"

"کہاں ہیں تمھاری زرو دیدی؟"

"حیرت ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہم سید پور انھی کے پاس جا رہے ہیں۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ ہم ان کے پاس سید پور جا رہے ہیں۔ کیا واقعی ہم سید پور پہنچ جائیں گے؟"

خسرو نے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر پوچھا "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں تو [illegible] کیا کہہ رہی ہوں مگر یہ دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہماری محبت کا پہلا اور زندگی کا آخری سفر ہو۔"

گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ وہ رکنے والی تھی۔ [illegible] تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ [illegible]۔ مجھے ڈر [illegible]۔"

[illegible] گاڑیاں چل رہی تھی۔ یقیناً کسی اسٹیشن پر رکنے والی ہے۔"

[illegible] خسرو نے آہستگی سے [illegible] گاڑی [illegible] رکے تو تم اسی دوران [illegible]۔"

[illegible] کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ [illegible] دو ملازم اور ایک [illegible] نہیں تھی۔ اسی

لیے یہاں سے وہاں تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسداللہ اور مجنوں دادا ٹہلنے کے انداز میں پلیٹ فارم پر سے گزرتے ہوئے بوگی کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ نین تارا اور خسرو کی حفاظت کرنے والے سپاہی گاڑی رُکنے سے پہلے ہی اپنے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آگئے تھے تاکہ کوئی فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھسنے نہ پائے۔

اسداللہ اور مجنوں دادا آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے بہت آگے نکل گئے۔ پھر ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو کر اس کے دوسرے دروازے سے دوسری طرف اُتر گئے۔ وہاں اور گہری تاریکی تھی۔ وہ چھپتے ہوئے تقریباً دوڑتے ہوئے دو بوگیوں کے درمیان آگئے۔ اِدھر انھیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

نین تارا نے آہستگی سے پوچھا "کوئی اسٹیشن ہے؟"

خسرو نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "ہاں۔ ابھی ہمارے کمپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ میں آواز سے اندازہ کر سکتا ہوں۔ ان کے پاؤں تلے بجری بچھی ہوئی تھی۔ یقیناً کسی اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے۔"

وہ مطمئن ہو کر برتھ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا "تم اداس کیوں ہو۔ ہم یقیناً سید پور پہنچیں گے۔"

وہ بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "دماغ میں عجیب عجیب سے خیالات آتے ہیں۔ یوں تو سبھی کو ایک دن مرنا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ جو رہ رہ کر دہشت پیدا ہوتی ہے۔ موت آتے آتے رُک جاتی ہے اور زندگی دلاسے نہیں دیتی تو ایک عجیب طرح کا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ بس یہی دعا کرتی ہوں کہ اس پار یا اس پار ہو جائے یا تو زندگی کی ضمانت مل جائے یا موت آئے۔ ہو تو ایک دفعہ ہی ہو جائے۔"

گاڑی کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے برتھ کی پشت سے ٹکرائی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ اسداللہ اور مجنوں دادا الگ الگ زینے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اسداللہ اگلی بوگی کے زینے پر تھا اور مجنوں دادا پچھلی بوگی کے زینے پر۔ گاڑی اسٹیشن چھوڑ کر پٹریاں بدلتے ہوئے مین لائن پر جانے والی تھی۔ پٹریاں بدلنے کے دوران وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے چپ چاپ کھڑے ہوئے تھے۔ پھر جیسے ہی ٹرین مین لائن پر پہنچی اور آؤٹر سگنل کراس کرنے لگی تو وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اچانک فرسٹ کلاس کی بوگی کو ایک زبردست جھٹکا پہنچا۔ اس کے ساتھ

ہی کمپارٹمنٹ میں تاریکی چھا گئی۔ مین تارا کے حلق سے ایک چیخ سی [illegible] پوچھا: یہ کیا ہو گیا؟

[illegible]

پہلے ہی مجنوں دادا اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اسد اللہ انجمن بوگی کے زینے سے لگا، اب تک مجنوں دادا [illegible]

دوڑنے والی ٹرین اسے اپنے باقی ساتھیوں سے دور لے جا [illegible]

[illegible]

تھے جس میں سے دو [illegible] رام کے تھے۔ باقی پارٹی دوسرے [illegible]

دونوں کمپارٹمنٹ کے سپاہی دونوں طرف کے دروازوں [illegible]

[illegible] تمام تاریکی [illegible]۔ پھر منو دادا کی آواز سنائی دی۔

[illegible] کے تحت مشورہ دیا تھا۔ ورنہ ہم چاہتے تو [illegible] کر دیتے۔ ہم کھیتی باڑی کے لوگ ہیں اور تم بی ڈی آر کے سپاہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اگر جھگڑے کا کوئی سبب ہو تو اسے ختم کر دینا چاہیے۔ ہم بی ڈی آر کے حوالوں

[illegible]

کمپارٹمنٹ میں چلے جائیں؟

[illegible]

فوج کی مخالفت ہے؟

منو دادا نے جواباً چیخ کر کہا: یہ فوج سے مخالفت نہیں [illegible]

تک پہنچا کر دم لیں گے؟

[illegible] میں کہا: فرش پر بیٹھ جاؤ۔

[illegible]

مین تارا نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ [illegible]

[illegible] تک کسی [illegible] قریب [illegible]

وہ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر [illegible]

[illegible] ہیں ہے، ایک جا تو ٹک سی ہے، ہم کپ کر سر گئے؟

[illegible] ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے [illegible] گے۔ میں اپنے حوصلوں کو [illegible]

[illegible] نے نگلیں خسرو نے [illegible] کو رٹ پر سیٹ کیا ٹھیک [illegible] دی۔ لڑکی کے المونیم [illegible] کے قریب ہی جیسے [illegible] دیکھ سکتے تھے [illegible] تھے [illegible] کھڑکی سے ٹکرا کر [illegible] کے دوران اسی گولی کی قوت پرواز نے دم توڑ دیا تھا۔

وہ [illegible] کے مارے [illegible]

[illegible]

[illegible] تمہیں نہیں جانے دوں گی۔

[illegible] میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔

[illegible] دوست نکلا۔ [illegible] وہ بنگال میں گفتگو [illegible] کے غم کے باوجود شدت کے بے اختیاری [illegible]

ہیں اپنی مادری زبان کے الفاظ ہی منہ سے نکلتے ہیں۔ اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ [illegible] جذبے کا اظہار کیا تھا، جبکہ غلطیاں محبت کے مارے سرزد ہو جاتی ہیں۔

ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ دو گولیاں [illegible] کی کھڑکیوں سے آ ٹکرائیں۔ اس کے بعد تڑتڑ کی مسلسل [illegible]۔ انہیں [illegible] کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھیں۔ صورت [illegible] تھی۔ [illegible]

⁂

وہ [illegible] عورت [illegible] کے درمیان [illegible] ان [illegible] رہی ہیں۔

[illegible] تو رنگ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ وہ دونوں [illegible]

[illegible] اس کے چہرے، بدن اور بال [illegible] تھی [illegible] جیسے بارش میں بھیگی ہو [illegible] سے گزرتی ہوں والی کمر تک پہنچی ہو [illegible] باوجود کنول کی طرح اجلا تھا۔ وہ دونوں اسے [illegible] نظروں سے دیکھنے لگے۔

[illegible]

تم گونگی ہو؟

اس دوشیزہ نے پہلے سکندر کو دیکھا، پھر کلیم الدین بھوئیاں کی جانب نظر کی۔ بھوئیاں نے بھی اشارے سے سکندر کے اسی سوال کو دہرایا: کیا تم گونگی ہو؟

تب اس دوشیزہ کی آنکھیں، اچانک ہی بھیگ گئیں۔ اس [illegible] سے کئی آنسوؤں کے قطرے، اس کے چہرے پر [illegible] ڈھلکنے لگے۔ اس کے بعد اس نے بڑی آہستگی سے [illegible] گلابی ہونٹوں کو کھول دیا... آہستہ آہستہ منہ پوری [illegible] دونوں نے ذرا جھک کر اس کے کھلے ہوئے [illegible] زبان کٹی ہوئی تھی۔

[illegible] کاٹ دی گئی تھی۔ انسان طرح طرح کی بولیاں بولتا ہے [illegible] وہ میناؤں کی بولی بولتی تھی جسے سُننا گوارا نہ کیا گیا۔ ایسا ہوتا ہے [illegible] دماغوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ لکھنے والے کا قلم پکڑا جاتا ہے۔ بولنے والے کا منہ بند کیا جاتا ہے لیکن یہ عجیب [illegible] سنسرشپ تھی کہ ایک عورت کی زبان کاٹ کر پھینک دی گئی تھی۔

سکندر حیات اور کلیم الدین بھوئیاں اس کے کھلے ہوئے منہ کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں کے دماغ میں ایک ہی بات آئی۔ خدایا! اس کی تو زبان ہی نہیں ہے تو یہ ہماری بولی نہ بنگالی۔ سارا جھگڑا تو زبان ہی کا ہے۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کس طرح ہمدردی کریں۔ ہمدردی کے لیے دو بول ہی بولنے پڑتے ہیں۔ اور وہ اس سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ سکندر نے بڑی ملائمت سے اپنا ہاتھ اس دوشیزہ کے سر پر رکھ دیا۔ کلیم الدین بھوئیاں نے اس کے ایک ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہمدردی سے دبایا۔ بس اتنی ہی ہمدردی کی جا سکتی تھی۔

دن کے گیارہ بج گئے۔ وہ مال گاڑی اسی طرح پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ ان دنوں ٹیلیفونوں کے تار جگہ جگہ کٹے ہوئے تھے۔ ان کی مرمت کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ رابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ بہت کم بنگالی ایسے تھے جو ٹیلیگراف کی تکنیک کو سمجھتے تھے۔ خاص خاص ریلوے اسٹیشنوں پر ہندوستانی ٹیلیگراف آفس کے کارکن آ کر کام کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ٹرینوں کو اگلے اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے گھنٹوں لگ جاتے تھے۔

دن کے ایک بجے وہ مال گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی۔ ڈبّے کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دو مسلح سپاہی وہاں موجود تھے۔ جس مہاجن کا مال اس ڈبے میں جا رہا تھا وہ مہاجن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ دو مزدور تھے۔ مہاجن کہہ رہا تھا: ان پچیس بوریوں میں دھان اور دھان کے چھلکے اور بھوسا ہے۔ ایسا کرو۔ پہلے ایک بوری کھولو۔ اس میں سے دھان اور بھوسی کے چار حصے کرو اور ایک ایک حصہ چاول کی ایک ایک بوری میں ملاتے جاؤ۔ کیا سمجھے؟

چاول کی ایک بوری پر مہاجن کا منیم بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا: سمجھ گیا۔ یہ پچیس بوریاں ہیں۔ ان کے دھان اور چھلکے باسمتی چاول کی دو سو بوریوں میں ملائے جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ باسمتی چاول کی پچیس بوریاں اور نکل آئیں گی۔ یعنی یہاں مال چڑھاتے وقت دو سو بوریاں تھیں لیکن جہاں مال اتارا جائے گا وہاں دو سو پچیس بوریاں بن جائیں گی۔ پچیس بوریوں کا منافع الگ۔ بالکل کھرا!

سیٹھ نے کہا: ہاں، یہی سمجھنے کی بات ہے۔ جنتا ہمیں گالیاں دیتی ہے کہ ہم کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اب کون انھیں سمجھائے کہ ہم جو چپراسیوں کو، افسروں کو، مال بابو کو، گاڑی والوں کو رشوت دیتے ہیں۔ مال اِدھر سے اُدھر پہنچانے میں ہمارے ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں تو یہ نقصان ہم کہاں سے پورا کریں گے۔ آخر بھوسی چھلکے ملا کر ہی تو پورا کر سکتے ہیں نا۔ کیا سمجھے؟

دو مزدور ملاوٹ کا کام شروع کر چکے تھے۔ منیم جی نے کہا: جی ہاں، میں تو سب سمجھ گیا لیکن یہاں پہنچنے تک دو سو بوریوں میں ملاوٹ کا کام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے بڑا وقت لگے گا۔

چنتا مت کرو۔ میں اگلے اسٹیشن پر گاڑی کو کم از کم دو گھنٹے کے لیے رکوا دوں گا۔ یہ تو اپنے ہاتھ میں ہے۔

اگلا اسٹیشن گیارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی رک رک کر چلتی رہی۔ تقریباً ڈھائی بجے وہ بھولی پور پہنچے۔ وہ تینوں اسی طرح چاول کی بوریوں کے پیچھے بیٹھے تھے۔ کبھی کھڑے ہو جاتے تھے لیکن وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتے یا بیٹھ سکتے۔ ان میں سے کسی ایک کے پاؤں پھیلانے کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ سو اس گونگی کے لیے گنجائش نکال دی گئی۔

وہ بیٹھ گئی تھی لیکن بہت پریشان تھی۔ اپنے ساتھیوں کو اپنی پریشانی بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بولنا آتا تو بھی نہ بول سکتی۔ ویسے سکندر حیات اور کلیم الدین بھوئیاں بھی کم پریشان نہیں تھے۔ آخر وہ سب انسان ہی تھے۔ جانور تو نہیں تھے کہ جہاں کھاتے اسی جگہ غلاظت بھی برداشت کرتے۔ وہ [illegible] تھے۔ کسی طرح وہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

برداشت کی انتہا ہو رہی تھی۔ اگر گاڑی چلتی ہوتی تو وہ

مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے لیکن وہ اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ کام جاری تھا۔ ایک مزدور نے کہا: "سیٹھ صاحب! بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانا ہو جائے۔"

مینم جی نے کہا: "ارے مرتے کیوں ہو۔ جب دیکھو کھانا، کھانا۔ آدمی کا پیٹ لے کر پیدا ہو گئے ہو۔ اپنے پیٹ کو چاول کی بوری تو نہ بناؤ۔ جب گاڑی چل پڑے گی تو تمھارے لیے کھانا آ جائے گا۔"

"بس گاڑی کو پانچ بجے لائن کلیئر ملی۔" مہاجن نے کہا۔ "مینم جی! میں گارڈ کے ڈبے میں جا رہا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر آؤں گا۔ کام ذرا جلدی کراؤ۔ ملی پہنچنے تک دو سو پچیس بوریاں ہو جانا چاہییں۔"

وہ گارڈ کے ڈبے کی طرف جانے لگا۔ ان دنوں گارڈ کا ڈبہ مال گاڑی کے آخر میں نہیں لگتا تھا۔ چوری، ڈکیتی اور آئے دن قتل کی وارداتوں سے سب سہمے ہوئے تھے۔ اس لیے گارڈ کا ڈبہ انجن کے ساتھ لگایا جاتا تھا۔

گاڑی چلنے سے پہلے ہی اس آخری ویگن میں کھانا پہنچا دیا گیا۔ کھانے کی اشتہا انگیز بو اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور اب وہ کچھ کر گزرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ بوریوں میں ملاوٹ ہو رہی تھی اور وہ بوریاں آہستہ آہستہ ان کے سامنے سے سرکتی جا رہی تھیں۔ تقریباً ساٹھ ستر بوریاں رہ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں انھیں بھی ہٹایا جاتا تو وہ ظاہر ہو جاتے۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ انھوں نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا پھر آہستگی سے بوریوں پر چڑھنے لگے۔ گاڑی کا شور اتنا تھا کہ ان کی آہٹ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ یوں بھی آخری ڈبہ سب سے زیادہ جھٹکے کھاتا ہے اور بہت زیادہ شور مچاتا ہے۔ [illegible] بوری پر چڑھتے ہی دیکھا۔ دو مسلح سپاہی چاولوں کی ایک بوری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پشت نظر آ رہی تھی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے دو مزدوروں کا رخ ان کی طرف تھا پھر [illegible] سے پہلے کہ وہ مزدور [illegible] تھا کہ ان کی طرف دیکھتے۔ انھوں نے [illegible] سے بیک وقت چھلانگ لگائی۔ ایک ساتھ دونوں [illegible] پر ٹوٹ پڑے۔ کلیم الدین بھویاں نے ایک سپاہی کی [illegible] تھی لیکن سکندر حیات ایسا نہ کر سکا۔ وہ [illegible] دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ [illegible] تھا۔ وہ [illegible] اسٹین گن استعمال کر [illegible] کے دوران اس کی اسٹین گن کو مضبوطی سے [illegible] دونوں ویگن کے فرش پر لڑھکتے ہوئے [illegible] اسی وقت سکندر نے سپاہی کو دونوں ٹانگوں پر رکھ کر پوری قوت سے اچھال دیا۔ سپاہی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ڈبے کے باہر اپنی موت سے ملنے جا چکا تھا۔

وہ بوریوں کے پیچھے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ زندگی اور موت کے درمیان کتنی ہی وحشیانہ جنگیں دیکھ چکی تھی۔ اس بار اس کی ہمدردیاں اپنے اجنبی ساتھیوں کے لیے تھیں۔ وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی لیکن دل ہی دل میں ان کی ہی سلامتی کے لیے اور سامنے رکھے ہوئے کھانے تک پہنچنے کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

دوسری طرف وہ دونوں مزدور سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ اگرچہ وہ بنگالی تھے لیکن سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بنگال میں کیا ہو رہا تھا، اس سے ان کی دلچسپی اتنی ہی تھی کہ مزدوری کے مواقع کم، اجرت کم اور اشیائے ضرورت کے نرخ بڑھ رہے تھے۔ وہ بے چارے دن رات محنت کرنا، اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا جانتے تھے۔ کسی کے لڑائی جھگڑے سے نہ تو انھیں کوئی سروکار تھا اور نہ ہی لڑنا جانتے تھے۔ اس لیے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ مینم بھی ایک جگہ سہما ہوا سا کانپ رہا تھا۔ سکندر حیات نے اسٹین گن لے کر ڈبے کے باہر دیکھا۔ جو سپاہی باہر جا کر گرا تھا وہ ایک چھوٹے سے پل کی ریلنگ سے ٹکرایا تھا اور ٹکرانے کا انجام موت ہی تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر اسٹین گن دوسرے سپاہی کی طرف کرتے ہوئے کہا: "ہتھیار پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

اس نے ہتھیار پھینک دیا۔ کلیم الدین بھویاں نے اسے چھوڑ کر اس کی اسٹین گن اٹھا لی۔ پھر انھیں حکم دیا: "تم سب ادھر کونے میں چلے جاؤ۔ جلدی کرو۔"

وہ سب اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ دو مزدور، ایک سپاہی اور مینم جی چاولوں [illegible] کونے میں جا کر دبک گئے۔ سکندر نے بوریوں پر چڑھ کر لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا: "[illegible]"

لڑکی نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا پھر وہ بوریوں پر سے [illegible] دوسری طرف اتر کر کھانے کے پاس [illegible] کا [illegible] کیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ وہ دونوں بھی اس سے پیچھے نہیں رہے۔ مینم، سپاہی اور دونوں مزدور انھیں یوں حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے بھوکے جانوروں کو دیکھ رہے ہوں۔ [illegible] جا رہا تھا۔ [illegible] مگر وہ کھانے جا رہے تھے [illegible] چبائے بغیر نگلے جا رہے تھے۔

کھانے کے دوران کلیم الدین بھویاں کے [illegible] محسوس [illegible] کیا۔ وہ [illegible] کرنے لگا۔ [illegible]

[illegible] فاطمۃ کے [illegible]

[illegible]

ن ذر کرتے ہوئے تھوک دیا۔

[illegible] جلدی سے [illegible]

[illegible] گئیں [illegible]

[illegible]

واں کیا ملے ہوتے ہو؟

[illegible]

میرے دماغ کو زبردست [illegible] پہنچا ہے۔

[illegible] نکل جاتی ہے:

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر قہقہے لگانے کے بعد بھویاں نے کہا۔

[illegible]

[illegible] شاید بھوک سے [illegible] اگلے اسٹیشن پر آپ کے

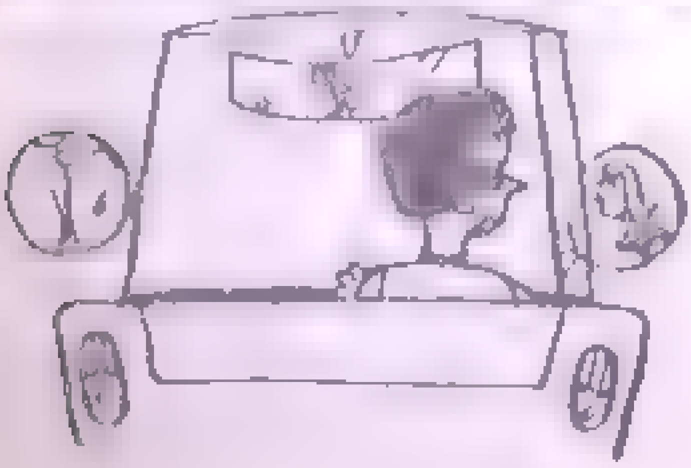

پہلے [illegible] دیں گے۔"

اس رات [illegible] سنتے ہی دونوں چونک گئے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] یا چھپنے کی کوشش کی تو ہم گولی مار دیں گے۔"

[illegible] سہارا دیتے رہے اور خالی خالی نظروں سے [illegible]

[illegible]

وہ شخص پھر ریلوے لائن کے پاس آ گئے۔ [illegible] نے کہا۔ [illegible] ہیں گے تو ہم کھیتوں میں چھپ جائیں گے۔"

[illegible] نے کہا: "ٹھیک ہے ہمیں ان کی [illegible] کے [illegible]

خطرہ نہ ہو، اس لائن کے ساتھ ہی چلتے رہنا چاہیے۔"

"اگر کسی ٹرین یا گاڑی کی آواز سنائی دے گی یا روشنی دکھائی دے گی تو ہم لائن چھوڑ کر کھیتوں میں چلے جائیں گے۔"

وہ [illegible] کرتے ہوئے گونگی کے برابر آ گئے۔ اس کے دونوں [illegible] جیسے [illegible] تم [illegible] سکتیں لیکن کچھ معلوم تو ہونا چاہیے [illegible] تم کہاں سے آئی ہو اور تمہیں کہاں پہنچایا جائے۔"

[illegible] تم [illegible] میرے رشتے دار ہیں۔ میں اسے وہاں لے جاؤں گا۔"

"تم کیوں لے جاؤ گے، یہ بنگالی نہیں ہے۔"

"ہماری بھی نہیں ہے۔"

[illegible] ہماری [illegible] کچھ [illegible] سی ہی تھی۔" [illegible]

"یہ بول نہیں سکتی ہے مگر رضامندی ظاہر کر سکتی ہے۔ ابھی پوچھ لیتے ہیں۔"

[illegible] اندھیرا چھا چکا تھا لیکن اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ [illegible] ہوں۔

وہ چند لمحوں تک خاموش [illegible] اپنے سامنے سے جھٹک دیا [illegible] جانے لگی جیسے ان میں سے کسی کی ضرورت [illegible] ان سے انہیں سمجھا رہی تھی کہ [illegible] میں مسافر [illegible] جھٹک [illegible] لیکن خودغرض لوگوں کا سہارا نہیں [illegible]

دوسرے نے کہا: "ہم تمہیں اس ویرانے میں تنہا نہیں [illegible]

وہ چپ چاپ چلتی رہی۔ تھوڑی دور جا کر ایک نے کہا۔ [illegible] جانے [illegible] ہماری ہے تو [illegible] کے درمیان محفوظ ہے۔"

وہ سنتی رہی اور چلتی رہی۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے

کے بعد انھیں انجن کی روشنی نظر آئی مگر وہ روشنی دوسری طرف تھی یعنی وہی مال گاڑی ایک اسٹیشن پر پہنچ کر رکی ہوئی تھی۔ انھوں نے لائن چھوڑ دی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اسٹیشن سے آگے جانے لگے تھے۔

ان کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ کہیں کہیں گھٹنوں تک پانی تھا اور کوئی جگہ ایسی تھی جہاں کیچڑ تھی۔ وہ کہیں پھسلتے ہوئے، کہیں سنبھلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ گونگی نے دونوں کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ ادھر اسٹیشن میں یقیناً اس بات کا پتا چل گیا ہوگا کہ آخری ویگن میں کیا کچھ ہو چکا ہے مگر وہاں کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس طرح کی جوابی کارروائی کرنا چاہتے تھے اس بات سے وہ تینوں بے خبر تھے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

آؤٹر سگنل کے پاس پہنچ کر وہ پھر ریلوے لائن پر آ گئے۔ انجن کی روشنی وہاں تک نہیں آ رہی تھی۔ راستہ سیدھا اور صاف تھا۔ وہ کیچڑ پانی سے محفوظ ہو گئے تھے۔ اس لیے اب تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ مال گاڑی اسی اسٹیشن پر رکی رہ گئی تھی۔ اس کے مہاجن کو اچھا وقت مل گیا تھا جتنی دیر وہ رکا سکتا تھا اتنی دیر میں اس کی باقی بوریوں میں تلاش ہو سکتی تھی۔

تقریباً پانچ میل تک چلتے رہنے کے بعد انھیں سامنے سے ایک ٹرین آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ فوراً ہی ریلوے لائن چھوڑ کر دور چلے گئے۔ ایک جھاڑی کے پیچھے جا کر چھپ گئے۔ وہ پسنجر ٹرین تھی۔ اس میں بیٹھے ہوئے مسافر نظر آ رہے تھے۔ گاڑی جلد ہی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ بہت ہی چھوٹی سی ٹرین تھی اور یہ وہی ٹرین تھی جس کا آخری حصہ اس سے الگ کر دیا گیا تھا۔

اس کے گزرنے کے بعد وہ پھر جھاڑیوں سے نکل آئے۔ ریلوے لائن پر چلنے لگے۔ سکندر نے کہا: "یہ درست ہے کہ تم ہم دونوں کے ساتھ چپ چاپ چلتی ہو کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتیں۔ لیکن کچھ بتاؤ تو سہی کہ کون ہو؟"

کلیم الدین بھوپالی نے کہا: "چلو اپنا نام بتا سکتی ہو تو بتا دو۔"

وہ تھوڑی دور تک چپ چاپ چلتی رہی پھر اس کے منہ سے کچھ عجیب سی آوازیں نکلیں۔ وہ توجہ سے سننے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی: "ڈا، ڈاپ، اوڈما ہے۔"

اس کی کٹی ہوئی زبان سے ڈ کا حرف زیادہ ادا ہوتا تھا۔ اور جہاں ہونٹوں کے ملنے سے حرف ادا ہوتے تھے وہ سمجھ میں آ جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سکندر نے چلتے چلتے پوچھا: "پھر بولو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"

اس نے پھر اسی انداز میں اپنی بات دہرائی۔ کلیم الدین بھوپالی نے کہا: "یہ اپنا نام بتا رہی ہے۔"

"مگر کیا نام بتا رہی ہو۔ ابھی تم اتنی لمبی بات نہ بولو۔ صرف نام بتاؤ۔"

اس نے کہا: "اوڈما۔"

"بھلا یہ کوئی نام ہے۔ اوڈما کیا ہوتا ہے؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ کوئی ایسا نام جس کے آخر میں ما آتا ہو۔"

پھر سکندر نے پوچھا: "تمھارا نام نجمہ ہے؟"

گونگی نے انکار میں سر ہلایا۔ کلیم الدین بھوپالی نے کچھ سوچ کر پوچھا: "تمھارا نام سلمہ ہے؟"

گونگی نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ وہ دونوں قدم قدم اس کے ساتھ بڑھتے رہے اور سوچ سوچ کر ایک ایک نام ادا کرتے رہے۔ فاطمہ، ناظمہ، صائمہ۔ پھر کلیم الدین بھوپالی نے جھنجھلا کر کہا: "بھئی اور ایسا کون سا نام ہے جس کے آخر میں ما آتا ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم تمھیں ماں کہنے لگیں۔"

سکندر نے کچھ سوچ کر کہا: "یہ اپنے آپ کو اوڈما کہہ رہی ہے لہٰذا اوڈما کے وزن پر کوئی نام تلاش کرنا چاہیے۔ اس کا نام او سے شروع ہوتا ہے اور ما پر ختم ہوتا ہے۔"

وہ تینوں چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ اس نام پر غور کرنا بھول گئے کیوں کہ سامنے ہی دور دور تک ٹارچ کی کچھ روشنیاں بھٹکتی ہوئی دکھائی دیں۔ ادھر سے ادھر گزرنے والی روشنیوں میں پسنجر ٹرین کی دو بوگیاں اور مال گاڑی کے کچھ ڈبے نظر آئے۔ پھر اچانک ہی فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ گونگی کو لائن سے اتار کر ایک طرف لے گئے۔ ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے جا کر دبک گئے۔ آوازیں سننے لگے۔ کسی کے کچھ بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن وہ بات فائرنگ کی آواز کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

تاریکی گہری تاریکی کمپارٹمنٹ کے اندر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تارا خسرو کے قدموں سے لپٹ کر رو رہی تھی: "نہیں میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ ہم جئیں گے ایک ساتھ، مریں گے ایک ساتھ۔"

باہر سے قہقہے سنائی دیے: "اچھا تو یہ بہادری بھاشا بول رہی ہے۔"

مسٹر دادا نے چیخ کر کہا: "خسرو! اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس لڑکی اور انجم کے ساتھ باہر آ جاؤ۔ ہم دونوں کو جان سے نہیں ماریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ جلدی کرو ورنہ اگلے پچھلے اسٹیشن سے لوگ آ جائیں گے۔"

خسرو وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اسی انتظار میں تھا کہیں

سے کوئی مدد آ پہنچے۔ اسی لیے وہ نین تارا کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ اسی وقت فضا میں سے پھر ایک گولی چلی اور کھڑکی سے اس کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ خسرو نے تاریکی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نین تارا! یاد ہے تم نے کہا تھا، تم میرے ساتھ ساتھ جیتی رہو گی لیکن بعد شب کے اندھیروں میں بھی پناہ ہاتھ مجھے نہیں پکڑے دو گی۔ اب شاید یہ ہماری زندگی کا آخری مرحلہ ہے۔"

وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور اندھیرے میں اس پر ڈھال بن کر رہی۔ "کوئی گولی آئے گی تو پہلے مجھے لگے گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی جیسے کمپارٹمنٹ میں زلزلہ آ گیا۔ دونوں طرف سے کھڑکیوں کو توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان سے دروازے نہیں کھل رہے تھے۔ اس لیے وہ کھڑکیوں پر حملہ آور ہو رہے تھے...... خسرو نے نین تارا کو سمجھایا۔ "یہاں زمین پر چپ چاپ لیٹی رہو۔ اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "نہیں خسرو، مت جاؤ، یہیں پاس آؤ۔" وہ اس کے ہاتھ کو جھٹک کر اپنے ہاتھ کو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں مرد ہوں۔ بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کے لیے لڑتے رہنا ہمارا تمہارا فرض ہے۔"

وہ فرش پر رینگتے ہوئے دروازے کے قریب آ گیا۔ اسی وقت کھڑکی میں شگاف پڑ گیا۔ رائفل کی ایک نال گھستی ہوئی اندر آئی۔ خسرو نے فوراً ہی ایک ہاتھ سے اس نال کو اوپر کی طرف اٹھا دیا۔ فضا میں زنّاٹے سے گولی چلی اور چھت کی طرف گئی۔ لیکن نین تارا کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکل گئی۔ "بچاؤ۔ خدا کے لیے ہمیں بچاؤ۔ اس بڑی دنیا میں کسی کو تو خدا کا خوف ہوگا۔ کوئی تو آ کر ہماری مدد کرے۔ بچاؤ خدا کے لیے بچاؤ۔"

وہ کمپارٹمنٹ کے فرش پر اوندھی پڑی مسلسل چیخ رہی تھی۔ اب پھر گولی چلی۔ ایک بار پھر وہ بڑی دلدوز چیخ پڑی۔ "بچاؤ... او... او..."

اس کی چیخ مردوں کی روحوں کی طرح سنسناتی ہوئی سکندر تک پہنچی۔ "بچاؤ... بچاؤ... بچاؤ..." اس کے دماغ کو یہ کھٹکا سا لگا۔ چشم زدن میں ریل گاڑی اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

دور تک شعلے بھڑک رہے تھے۔ ریل گاڑی جل رہی تھی۔ دور دور تک چیخیں پکار رہی تھیں۔ "ہا ہا! مجھے بچاؤ۔ موت کے منہ سے بچاؤ۔"

سکندر ایک دم سے تڑپ کر اٹھا۔ کوئی زخمی شخص اسی آواز میں پکار رہی تھی: "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے بچاؤ... بچاؤ... بچاؤ..."

وہ دوڑتے ہوئے چیخنے لگا۔ "نین تارا! میں آ رہا ہوں۔ اس بار تم نہیں جلو گی۔ تم نہیں مرو گی۔"

وہ جنون کی حالت میں دوڑتا ہوا اسٹین گن سے فائرنگ کرتا ہوا کمپارٹمنٹ کے قریب پہنچنے لگا۔ تڑتڑاتڑ کی آواز کے ساتھ کتنی ہی چیخیں سنائی دیں۔ اس کے بعد چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ جیسے وہاں کوئی زندہ نہ ہو۔ سب اپنے انجام کو پہنچ گئے ہوں۔ اس کی اچانک فائرنگ نے بہتوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

لیکن ابھی زندگی کے آثار تھے۔ اندھیرے میں ریلوے لائن کے پاس آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کر ادھر فائرنگ کی لیکن وہ دھوکہ تھا۔ کسی نے ریلوے لائن کے پاس ایک پتھر پھینک کر اس کی توجہ ہٹائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے گولی چلائی۔ سکندر کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ گولی کا زخم ناقابل برداشت تھا۔ پھر بھی اس نے اسٹین گن کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کی۔ شاید وہ فائر بھی کرتا لیکن دوسری گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔

ہاتھ سے اسٹین گن چھوٹ گئی۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ڈگمگانے لگا جیسے پاؤں رکھنے کے لیے کہیں بھی زمین نہ ملی ہو۔ پھر وہ پیچھے کی طرف بل کھا کر گر پڑا۔ فائرنگ کے بعد جو سناٹا چھا جاتا ہے وہ موت سے زیادہ ہیبت ناک لگتا ہے۔ وہی سناٹا کسی کی دہشت کی طرح چھا رہا۔

پھر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بھاری بھرکم فوجی جوتوں کی آواز تھی۔ کوئی اس کی طرف آ رہا تھا۔ مگر سنبھل سنبھل کر آ رہا تھا جیسے خوف زدہ ہو۔ پھر اس نے دور ہی سے ٹارچ روشن کی۔ اس کی روشنی میں سکندر نظر آیا۔

وہ سنگ میل سے ٹیک لگا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی اور قریب آئی اور وضاحت سے معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کا سینہ لہو سے تر ہو رہا تھا۔

طویل خاموشی کے بعد خود کلامی کی آواز سنائی دی۔ وہ حقارت سے کہہ رہا تھا: "تم بڑا جواں مرد بنے پھرتے تھے..."

جب تک آدمی مر نہیں گیا تھا، ضمیر یونہی طاقت میں رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھتے ہی جانے کہاں سے جان آئی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ٹیک پر جھکا، پھر چہرے کو دیکھتے ہی پیچھے موت کی گود میں ڈھلک گیا۔

"اے خاکِ آدم! تیرے ضمیر کو سلام"

اچانک بارش ہونے لگی [illegible]

[illegible]

اس نے پھر نفرت سے سکندر حیات کو گالی دی۔ اسے [illegible] اس کے دو ساتھی گاڑی کے دوسری طرف گئے تھے۔ [illegible] دوسرے دروازے کو کھول سکیں۔ اس [illegible] "[illegible] تمہی کو تو ہے؟" [illegible] نے دوسرے ساتھی کو آواز [illegible] "[illegible]"

[illegible] جواب [illegible] کر رہا تھا ویسے دشمن [illegible] کے سامنے [illegible]

[illegible] کی زد میں آ کر گر پڑا تھا۔ رائفل وہیں [illegible]

[illegible]

محبت کرنے والے تو مر کر سنے والے سزا کیوں پاتے ہیں؟"

منشو [illegible] ایک ہاتھ میں اسٹین گن اور دوسرے میں [illegible] پکڑے ہوئے شدید حیرانی سے اس عورت کی باتیں سن رہا تھا زندگی میں پہلی بار ایسی بھاشا سننے کو مل رہی تھی۔ وہ [illegible] کون سی زبان بول رہی ہے [illegible] کا زور کرنے [illegible] رہتی تھی، [illegible] رہی تھی۔ [illegible] بڑھ کر ڈھتے ہوئے [illegible] "[illegible] بول رہی ہو؟ یہ کس دیش کی بھاشا ہے؟"

اس کی ماتا [illegible]

"خاموش، ذرا بھی حرکت کی تو ابھی زمین پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے۔"

منشو [illegible]

[illegible]

وہ کس دیش کی بھاشا [illegible]
زبان نہیں سمجھ سکتے [illegible] اگر ہم [illegible]

کوئی نہیں سمجھ سکتا تو پھر یہ زبان اس کے منہ میں کس نے رکھی ہے؟ یہ زبان جانوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی، کچھ میں نہیں آتا ہم انسان ہیں یا نہیں، ہم طوطے مینا کو بولنا سکھاتے ہیں اور کبھی بولنے والوں میں سے زبان کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ ہم آخر کیا ہیں؟"

"ہاں یہ بات [illegible] انسو [illegible] ہے [illegible] دوست، مجھے تو اس [illegible] ہے"

خسرو [illegible] کہا۔ "بہت [illegible] ہے۔ ہم سب نے [illegible] اس نے [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] ہوں [illegible] تمہیں [illegible] کسی کے پاس [illegible] ہے [illegible] بڑے [illegible] کو کتے کی طرح [illegible] کا [illegible] کر کے رہ جاتا ہے [illegible] سالی سلوک آدمی کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔"

"[illegible] دوست [illegible] اٹھ رہی ہوں؟"

"[illegible] ہی [illegible] تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ عورت [illegible] وہ اس [illegible] ہے"

"[illegible] جہاں مجھے یا [illegible]"

"[illegible] کو [illegible] سوال [illegible] ہے" وہ [illegible] جیسے [illegible] سے ہمارا ساتھ [illegible] کی جان [illegible]۔ اس کا [illegible] تم [illegible] وہ [illegible] ہے"

منشو دادا [illegible] "ہاں مجھے [illegible] الحسن ہو چکا ہے"

"اگر معلوم ہوتا تو میرے محسن کے ہاتھوں راضی خوشی گولی کھا کر یہاں اپنے [illegible] تینوں کے ساتھ لیٹ جاتے، مگر اس [illegible] یہ جو عورت ہمارے سامنے [illegible] کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مجھے اور [illegible] کو یہ [illegible] اپنے [illegible] ہے جو نہیں مل جانے [illegible] کا مال [illegible]۔ میں اسے [illegible] چاہتا تھا [illegible] بھاری [illegible] رہی [illegible] لیکن یہ دونوں سے راضی تھی۔ عورت ایک سے راضی ہو تو محبوبہ۔ دو چار سے راضی ہو تو [illegible] اور سبھی سے راضی ہو تو [illegible] ہے۔ وہ دیکھو جو عورت ہمارے [illegible] کا باعث تھی وہ [illegible] میں سے ایک [illegible] کی طرح آنسو بہا رہی ہے"

خسرو نے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کو آہستگی سے

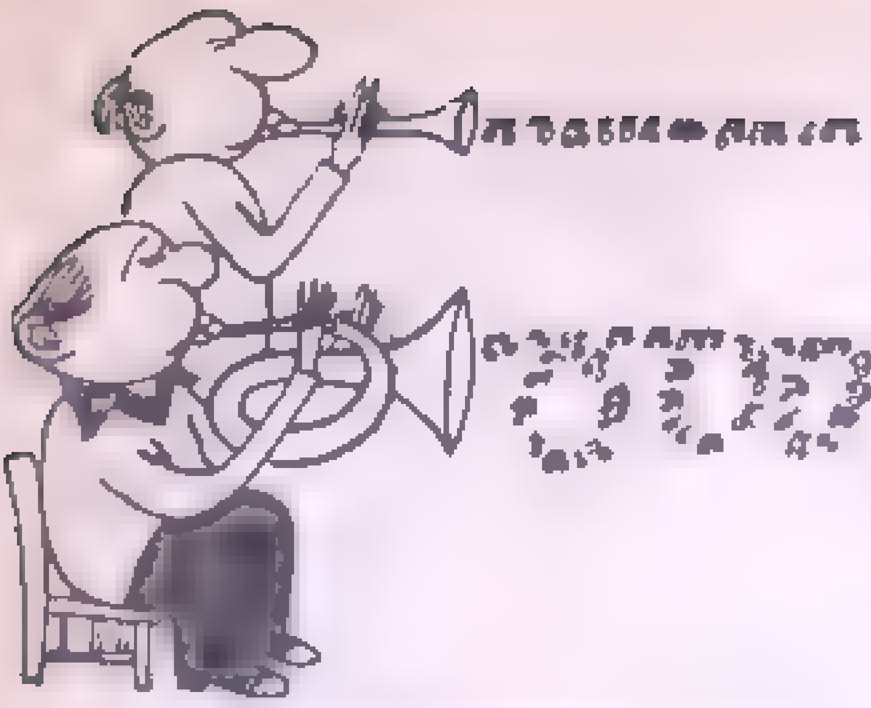

دھکیل دیا تھا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ سارے دشمن مارے گئے ہیں۔ صرف منشو دادا کی آواز آرہی تھی لیکن اب اس کی آواز میں رعب اور دبدبہ نہیں تھا۔ وہ بھوتیوں کے سامنے مجبور اور بے بس ہو گیا تھا۔ خسرو کے جی میں آیا کہ بھوتیوں کو دوستانہ انداز میں مخاطب کرے۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ کیونکہ اپارٹمنٹ کے پیچھے [illegible] کے پاس ایک ہلکی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوری توجہ سے دیکھا۔ کوئی سایہ سا ۔۔۔ ٹرک کے نیچے سے نکل رہا تھا۔ جیسے وہ رینگ کر باہر آیا پھر آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار تھا۔ اس نے اُدھر ایک قدم بڑھایا جدھر سے کلیم الدین بھوتیاں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ منشو دادا کا آدمی تھا اور بھوتیاں پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک قدم بڑھنے کے بعد سوچ میں پڑ گیا تھا۔

سوچنا کیا تھا۔ اس کے منشو دادا کی جان خطرے میں تھی کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس لیے اس نے دوسرا قدم بڑھایا۔ اسی لیے خسرو نے یکبارگی اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس طرح کہ اس کے دونوں بازو اس کی گرفت میں رہیں تاکہ وہ ہتھیار کو استعمال نہ کر سکے۔ یہ چھلانگ کے ساتھ صحیح وقت پر عمل کیا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی۔ خسرو اس سے لپٹ کر ایک طرف گرتا ہوا [illegible] سے لڑھکتا ہوا نالی میں چلا گیا۔

کلیم الدین بھوتیاں نے لڑنے جھگڑنے کی آواز سن کر فوراً ہی اسٹین گن کا رخ اُدھر کیا۔ بھوتیاں کے [illegible] ہی منشو دادا نے اپنے اسٹین گن کی طرف چھلانگ لگائی [illegible] کتنی دیر لگتی ہے۔ تڑ تڑ تڑ کی مسلسل فائرنگ ہونے لگی

اس کے ساتھ ہی منشو داد کی چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ گولیوں کی [illegible] آکر ذرا دور [illegible] لڑھکتا ہوا گیا پھر زمین پر گر کر ساکت ہو گیا دوسری طرف سے خسرو نے روتے ہوئے چیخ کر کہا۔

ہمو یاں [illegible] میں دشمن سے نمٹ لوں گا۔

کلیم الدین ہمو یاں نے ٹارچ زمین پر سے اٹھالی۔ اسے [illegible] کر [illegible] کے پیچھے [illegible] پھر ایک آدھی پیٹی کے پیچھے چھپ کر [illegible] کی روشنی [illegible] پھیلی۔ اس روشنی میں [illegible] ہوئے [illegible] اس میں سے خسرو کون تھا [illegible] ہمو یاں نہیں جانتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک انہیں [illegible] دیکھتا رہا۔

[illegible] کم نہیں تھا وہ اپنے ساتھیوں میں آخری [illegible] اس لیے [illegible] جس وقت خسرو نے اس پر چھلانگ لگائی تھی [illegible] اس کے ہاتھ سے ہتھیار نکل گیا تھا [illegible] ہوئی۔

خسرو کو بھی مین تارا کے ساتھ ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ [illegible] کی امید نہیں تھی۔ اب امید ہو چلی تھی۔ وہ بھی اپنی جان کی بازی [illegible]

[illegible] کی طرف واپس نہ آئے۔

کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے پر مین تارا کھڑی [illegible]

[illegible] کے متعلق ہمو یاں کی زبان سے سن رہی تھی۔ اسے ٹارچ کی روشنی [illegible] دیکھتے ہی کمپارٹمنٹ سے باہر [illegible]

اس نے ٹارچ کی روشنی میں اسے گونگی تک پہنچا دیا۔

مین تارا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ گونگی کے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ سکندر کی لاش کے سرہانے سوگوار بیٹھی ہوئی تھی۔

مین تارا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بہن! میں تمہارے دکھ کو سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی دکھ ہی دکھ اٹھاتی آرہی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تم بہت دیر سے بھیگ رہی ہو۔"

کچھ مسافر اپنے اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر آگئے تھے جو کچھ ہو رہا تھا اس پر تبصرے کر رہے تھے۔ کلیم الدین ہمو یاں اور خسرو کی تعریفیں کر رہے تھے جس محافظ سپاہی نے ہتھیار پھینکا تھا وہ اپنی صفائی میں بیان دے رہا تھا۔ خسرو نے کہا "کوئی بات نہیں حالات [illegible] بڑوں کو مجبور کر دیتے ہیں۔ جب [illegible] کی فوجیں ہتھیار ڈال دیتی ہیں تو تم ویسے بھی ایک تنہا سپاہی تھے بھلا کیا کر سکتے تھے؟"

مین تارا گونگی کو اپنے کمپارٹمنٹ میں لے آئی۔ وہاں اور زیادہ تاریکی تھی لیکن [illegible] اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر [illegible] ہوئے کہا "یہاں [illegible] یہاں ان لوگوں کے ساتھ کہاں سے آرہی تھیں؟"

اس نے جواب میں وہی [illegible] والی بولی شروع کی۔ مجبور تھی۔ کٹی ہوئی زبان سے ژ کا حرف زیادہ ادا ہوتا تھا۔ [illegible] وقت یوں لگتا تھا جیسے [illegible]

مین تارا نے گہری ہمدردی سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر اس [illegible] اپنے سینے سے لگا کر بولی "آہ کس ظالم نے [illegible] ہے تم ایسی بدنصیب ہو کر اپنا دکھ [illegible]

[illegible]

تھی۔ ان روشنیوں میں [illegible]

[illegible] اگر یہاں [illegible]

وہ گاڑی کے قریب آکر رک گئی۔ لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر

یقین دلایا کہ اب یہاں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں رہا ہے۔ فوجی گاڑی سے افسران کی طرف آئے جو ان کے بیانات سننے لگے۔ اس دوران گاڑی کو کٹے ہوئے حصے سے جوڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام کمپارٹمنٹ روشن ہوگئے۔

مین تارا نے پہلے تو ٹارچ کی روشنی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ کمپارٹمنٹ روشن ہوتے ہی اسے تفصیل سے دیکھا پھر بولی: "معلوم ہوتا ہے کئی دنوں سے تمہیں غسل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دیکھو تو کیسی حالت ہوگئی ہے۔ کپڑے بھی پہننے کے قابل نہیں رہے۔ میرے پاس ساری، پیٹی کوٹ اور بلاؤز ہے۔ تمہارا بدن مجھ سے بھاری ہے مگر کام چل جائے گا۔"

اس نے اپنی اٹیچی کھولی پھر اس میں سے ساری، پیٹی کوٹ اور بلاؤز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "لو، یہ لے لو۔ غسل خانے میں چلی جاؤ۔ خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر بدن صاف کرو۔ اگلے اسٹیشن پر تمہیں گرما گرم چائے پلاؤں گی۔ کیا تم نے کچھ کھایا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کپڑے لے کر وہاں سے اٹھی اور ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اسی وقت باہر کچھ شور سنائی دیا۔ لوگ اونچی آواز میں کچھ بول رہے تھے۔ مین تارا نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ معلوم ہوا وہ لوگ کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"ابھی تو وہ یہاں تھا!"

دوسرے نے کہا: "ہاں، جب یہ گاڑی آکر ہماری بوگی سے ملی، اس وقت میں نے بھی دیکھی تھا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔"

خسرو نے کہا: "تعجب ہے۔ وہ ہمارا محسن تھا، مجرم نہیں تھا۔ پھر کہاں چھپ گیا؟"

کچھ لوگ مسلح فوجیوں کے ساتھ ٹرین کے آس پاس تک گئے، دور دور تک جا کر اسے تلاش کر رہے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کلیم الدین بھوتیاں دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ نڈھال سا ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کہیں کیچڑ، کہیں گھٹنے تک پانی اور کہیں اونچے اونچے پودے تھے۔ وہ گرتا تھا۔ پھنستا تھا۔ اٹھتا تھا پھر چلنے لگتا تھا۔ وہ کبھی بھاگتے ہوئے، کبھی چلتے ہوئے ٹرین سے بہت دور نکل آیا۔ اندھیرے میں نہ اسے ٹرین نظر آ رہی تھی اور نہ وہاں کے مسافر اسے دیکھ سکتے تھے۔ بس کمپارٹمنٹ کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ننھی ننھی سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

اس کی تقدیر میں بھاگتے رہنا، چھپتے رہنا لکھا ہوا تھا۔ جب ٹرین کا کٹا ہوا حصہ پیچھے کٹے ہوئے حصے سے جڑنے کے لیے واپس آ رہا تھا۔ تبھی وہ سمجھ گیا تھا کہ ای پی آر کے مسلح سپاہی بھی آرہے ہوں گے۔ وہ بنگالی پولیس سے نہ بھاگتا تب بھی ای پی آر اور مکتی باہنی کے جوان تھے۔ ان سے ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لیا جائے۔ کلیم الدین بھوتیاں جیسے بیج کے تیس ممبران کو بہت سے لوگ جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ پوری فیملی حکومت پاکستان کی وفادار رہی تھی۔ انہوں نے بنگالیوں کی "مادھینتا سنگرام" (آزادی کی تحریک) کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لیے غدار ٹھہرائے گئے تھے اور اب بھوتیاں کو اس کی فکر رہتی تھی۔ جب تک وہ بنگلہ دیش کے اس شمالی حصے سے نکل کر ڈھاکا یا چٹاگانگ کی طرف نہ چلا جاتا، اس وقت تک جان جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔

اگر زندگی خالی، ویران اور بے کیف ہو تو مرنے سے ڈر نہیں لگتا اور اگر زندگی میں ذرا سی رنگینی پیدا ہو جائے، کہیں سے محبت کا ایک پھول کھلنے سے تو مر کے بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس وقت وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن تاریکی میں اس کے سامنے گوری کا چہرہ روشن تھا۔ کیسی پرکشش تھی۔ معلوم ہوتا تھا زندگی ایک لڑکی کے روپ میں اسے لبھانے اور حسنِ حیات کے لیے لڑتے رہنے کا حوصلہ دینے آئی تھی۔

ہاں، آئی تھی لیکن وہ اس سے بچھڑ کر دور چلا آیا تھا اور نہ جانے کتنی دور جا رہا تھا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس نے زیر لب کہا: "شاید کل ایسا ہی کوئی وقت تھا، جب وہ ملی تھی۔ صرف چند گھنٹے ساتھ رہا۔ میری ہمسفر! تم کون تھیں؟ کیا تھیں؟ کہاں سے آئی تھیں؟ اور اب آکر میرے دل سے کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

اس نے سر اٹھا کر سوچا۔ اس کا نام کیا تھا؟ اس نے بتایا تھا: "اوڈما"۔ پتا نہیں یہ کیا نام ہے، سمجھ میں نہیں آیا مگر یہ نام بھی دل میں دھڑکتا ہے۔ نام کوئی ہو، سمجھ میں آتا ہو یا نہ آتا ہو، اگر وہ نام محبت کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو زبان کاٹنے کے بعد بھی خوشبو کی طرح اس پر چھا جاتا ہے۔ پھول کی پتی پتی کاٹی جا سکتی ہے لیکن آج تک خوشبو کو کوئی نہ کاٹ سکا۔

وہ تھکن سے چور چور ہو کر وہیں بیٹھا [illegible]

چکنا چور ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے دور ٹرین کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد سر جھکا کر دوسری طرف گھوم گیا۔ بوجھل قدموں سے جانے لگا۔ اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اندھیرے کا مسافر نہیں تھا۔ اس کے سامنے وہ گونگا چہرہ روشن تھا اور دور تک راستہ دکھائی دے رہا تھا۔

ٹرین چل پڑی تھی۔ خسرو ایک بی ڈی آر کے آفیسر کے ساتھ کمپارٹمنٹ کے اندر آ گیا۔ پھر اس نے نیمن تارا کو تنہا دیکھ کر پوچھا: "وہ عورت کہاں ہے؟"

"غسل خانے میں ہے۔"

"یہ آفیسر اس کا بیان لینا چاہتے ہیں۔ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اس کے ساتھ کون لوگ تھے؟"

نیمن تارا نے کہا: "لیکن وہ تو..."

خسرو نے بات کاٹ کر کہا: "میں آفیسر سے کہہ چکا ہوں۔ اس کی بولی کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ گونگی ہے۔"

"اسے گونگی نہ کہو۔ وہ زبان والی تھی۔ کسی نے اس کی زبان کاٹ دی۔"

آفیسر نے کہا: "ہمارے دیش میں لوگ جانوروں سے [illegible] ہم [illegible] کس طرف جا رہے ہیں؟ ہماری [illegible] ہے؟"

آفیسر نے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیمن تارا [illegible]

وہ [illegible] ایک [illegible] بیٹھ گئی۔ گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ خسرو اور آفیسر کلیم الدین بھوتیاں کے متعلق [illegible] کر رہے تھے۔ اس کے اچانک غائب ہونے پر [illegible] کر رہے تھے۔ خسرو نے کہا: "ہم [illegible] معلوم نہیں کر سکے کہ یہ عورت ان دو جوانوں کے ساتھ کہاں سے آ رہی تھی کیونکہ ایک مارا گیا ہے اور دوسرا [illegible] تمہارے پاس ہے وہ بے زبان ہے۔"

آفیسر نے پوچھا: "کیا وہ عورت بہاری ہے؟"

خسرو نے [illegible] کر کہا: "میں نہیں جانتا۔"

[illegible] "وہ کچھ بول نہیں سکتی ہے اور میں [illegible] سکی۔"

[illegible]

نکل رہی ہے۔"

آفیسر نے کہا: "اسے اب تک باہر آ جانا چاہیے۔ دروازے پر ناک کرو۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے آفیسر کو اور نیمن تارا کو دیکھا۔ نیمن تارا فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئی۔ زور زور سے دستک دینے لگی۔ اسے آوازیں دینے لگی: "سنو! کیا تم سن رہی ہو؟ وہاں کیا کر رہی ہو؟ بہت دیر ہو چکی ہے۔ باہر آؤ یا ہمیں اپنی آواز سناؤ۔"

تقریباً دو منٹ کی چیخ و پکار کے بعد اندر سے اس کی ہلکی آواز سنائی دی۔ نیمن تارا نے دروازے سے کان لگا کر سنا وہ کچھ گڑبڑ گڑبڑ بول رہی تھی۔ اس نے خسرو سے کہا: "تم ادھر چلے جاؤ۔ میں دروازہ کھلواتی ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ نیمن تارا نے پھر دستک دے کر کہا "دروازہ کھولو۔ میں اندر آنا چاہتی ہوں۔"

دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ نیمن تارا نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی کیچڑ آلود لباس میں تھی۔ جو لباس [illegible] دیا گیا تھا۔ وہ ویسے ہی تہہ کیا ہوا تھا۔ گونگی کی آنکھیں [illegible] ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ نیمن تارا ٹوائلٹ کے اندر آ گئی۔ پھر اس نے پوچھا: "تم اتنی دیر سے کیا کر رہی تھیں؟ تم نے لباس بھی نہیں لیا ہے؟"

وہ ٹوائلٹ کے فرش [illegible] بیٹھ گئی [illegible] اداؤں سے اور اشاروں کی زبان سے [illegible] ایک دیوار سے ٹیک لگا کر غسل کے انداز میں [illegible] کو جوڑے سے [illegible] اس کے بعد ایک طرف سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں [illegible] میں کچھ بولتی جا رہی تھی۔ نیمن تارا [illegible] اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر [illegible] میں سمجھ گئی [illegible] پہلے تمہیں نہیں [illegible] کے بارے میں سوچ رہی تھیں [illegible] غسل [illegible] لو [illegible] ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں باتھ روم کے فرش پر سے اٹھ گئیں۔ نیمن تارا [illegible] نکلتے رک گئی۔

[illegible]

تھا۔ آفیسر اس کمپارٹمنٹ سے چلا جائے۔ نین تارا کا حسن ڈرا رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے بیابان تک یہی دیکھتا رہا تھا کہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ بالکل ہی کھلی تھی تو بی ڈی آر کے آفیسر یا دوسرے جوان سنا رہا اس سے باتیں کرتے تھے لیکن چور نظروں سے نین تارا کو دیکھ جاتے تھے۔ جنگجوؤں کو زیادہ سے زیادہ جتلایا جا سکتا ہے [illegible] کے پاس آنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ تو انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اگر نیت میں خرابی ہو تو ضروری نہیں ہے کہ عمل بھی خراب ہو جائے۔ کیونکہ تہذیب ہم انسانوں پر شرافت کا ڈی ڈی ٹی چھڑکتی رہتی ہے۔ ویسے ہم آج تک وہ جراثیم کش دوا ایجاد نہیں کر سکے جو نیت کے جراثیم کو ہلاک کرتی ہو۔"

خسرو نے آفیسر سے کہا "ہم سب یہ تو سمجھ سکتے ہیں لیکن آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں پاتے۔"

آفیسر نے پوچھا: "اس کا مطلب کیا ہوا؟"

خسرو نے [illegible] مسکرا کر اس کا چہرہ آ گیا۔ وہ اس [illegible] بڑی وردی کا وہ دھرم پرست تھا لیکن وہ کبھی [illegible] نہیں سکتا تھا [illegible] کے بارے میں اس کی بہت حساب سوال۔ اس نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ [illegible] تھے۔ ہمارے لیے بڑے محترم سمجھے [illegible] ان کی عزت [illegible] ہے۔ لہٰذا پتا چلا کہ وہ بڑی بری نیت رکھتے ہیں۔"

آفیسر نے اپنا ایک کان پکڑ کر کہا: "اللہ معاف کرے۔ یہ کتنی بری بات ہے۔"

"بری بات اس وقت ہوتی ہے جب نیت بری ہوتی ہے [illegible] ہم آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں سکتے ہیں جب [illegible] بیوی کے ساتھ جنگ رہا ہوں۔ بس یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں کس کی نیت جانے کیسی ہو؟"

آفیسر نے بے اختیار ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھنے [illegible] تھیں۔ ایک [illegible] کو وہ دیکھ [illegible] نہیں تھا [illegible] دیکھے [illegible] وہ ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر کہنے لگا "وہ بے چاری [illegible] ہے [illegible] اس سے کیا پوچھ سکوں گا اور وہ کیا جواب دے گی۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر دروازے پر گیا۔ ہینڈل پر ہاتھ [illegible] ہوئے باہر جانے لگا۔ خسرو نے کہا [illegible]

وہ [illegible] پہنچ گیا تھا۔ اس نے [illegible]

"مجھے اچانک اپنی بیوی یاد آ گئی۔ میں بھی جب اس کے ساتھ کہیں نکلتا ہوں تو لوگوں کی نگاہوں سے بہت گھبراتا ہوں اور یہ ہماری بڑی حماقت ہے۔ ہم میں جو برائی نظر آتی ہے ہم اسے ختم کر دیتے ہیں یا روک دیتے ہیں لیکن کسی کی نیت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں نہ بری نیت سمجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے وقت دانشمندی یہی ہوتی ہے کہ اس راستے سے کترا کر دوسری طرف نکل جائیں۔"

اس نے یہ کہا۔ پھر گھوم کر فوجی انداز میں چلتا ہوا دوسرے ایک لمبے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسی وقت نین تارا ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس کہیں کہیں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ چہرے پر سے بکھری زلفوں کو ہٹاتے ہوئے برتھ پر بیٹھ گئی۔ پھر بڑے درد سے بولی "بے چارہ!"

خسرو نے برتھ کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟"

نین تارا نے انکار میں سر ہلایا پھر کہا "یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان سے کوئی دکھڑا سنائے تو اس کا دکھ معلوم ہو۔"

"ہم سب کے دکھ ایک جیسے ہیں۔ کسی کے کم ہیں کسی کے زیادہ ہیں۔ میں اس کا دکھ نہیں اس کی مجبوری سمجھ رہی ہوں۔"

نین تارا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید حیا کا تقاضا پھر بھی پورا نہ ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ پھر جھجکتی سے بولی "خسرو! اس دوران میں [illegible] کچھ پوچھنا کسی شریف زادی کی بے حرمتی نہ ہوتا۔"

خسرو کو چپ لگ گئی۔ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی گاڑی کی کھٹ کھٹ دماغ پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گاڑی پٹڑی سے نہیں بلکہ ذہن پر سے گزر رہی ہے۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر خسرو نے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے کپڑے اب تک بھیگ گئے ہیں۔ دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے۔ تم غسل کر کے لباس تبدیل کر لو۔ ہم جلد ہی [illegible] پہنچنے والے ہیں۔"

وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی تھی [illegible]

"وہ باہر آئے گی تو میں جا کر لباس بدل لوں گی۔"

خسرو کچھ کہنا چاہتا تھا پھر رک گیا۔ اسی وقت [illegible] کا دروازہ کھل گیا تھا وہ نگاہوں کے سامنے [illegible] تھی۔ پھول دار ساڑی اس کے بدن پر [illegible]

بیچ بیچ کہیں پھول کھل رہے ہوں اور کہیں کلیاں چٹکنے کو رہ گئی ہوں۔ ہری ہری بیلیں اوپر سے نیچے تک لہرا رہی تھیں۔ کہیں چھپ رہی تھیں، کہیں نکل رہی تھیں، کہیں ڈوب رہی تھیں، کہیں ابھر رہی تھیں۔ ساری باغ تھی، گویا بہار تھی۔ دونوں مل کر باغ و بہار ہو گئی تھیں۔

مین تارا نے چونک کر خسرو کو دیکھا۔ ایسے وقت دنیا کی ہر عورت [illegible] اپنے دل کو دیکھتی ہے۔ خسرو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف ہٹ گیا تھا، تاکہ وہ برتھ پر آ کر بیٹھ جائے۔ مین تارا آگے بڑھ کر گوگی کے پاس پہنچی۔ اس کے لانبے بھیگے بال ساری کو بھگو رہے تھے اور جہاں تہاں ساری بھیگ رہی تھی۔ وہاں وہاں بدن سے چپک رہی تھی۔ وہ اس کے بالوں کو سمیٹ کر پانی نچوڑنے لگی۔ اس کے اُجلے چہرے پر بھی پانی کے قطرے شبنم کی طرح لرز رہے تھے۔ وہ ہرنی جیسی وحشت زدہ آنکھوں سے خسرو کو دیکھ رہی تھی، کبھی اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ پھر اس نے مین تارا کا ہاتھ تھام کر خسرو کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ مین تارا نے خسرو کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی: "یہ پوچھ رہی ہے، تم کون ہو؟"

اس نے کہا: "میرا نام خسرو ہے۔ نعیم الدین خسرو اور یہ مین تارا ہے۔ میری شریکِ حیات۔"

مین تارا نے شرماتے، مسکراتے ہوئے اپنے سر کو جھکایا۔ پھر خسرو نے گوگی سے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے پہلے خسرو کو دیکھا۔ پھر مین تارا کو دیکھتے ہوئے بولی: "اوڈھما۔"

وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اوڈھما کو دیکھنے لگے۔ پھر مین تارا نے پوچھا: "کیا تم اپنا نام بتا رہی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "اوڈھما..."

"بھلا یہ کیا نام ہوا؟"

"انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جہاں اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے وہاں کا حرف ادا نہیں ہوتا۔ گوگی کا نام عظمیٰ [illegible] سے سوچنا ہوگا جو نام ایسے ہیں جن کے آخر میں 'ما' آتا ہے۔"

وہ دونوں سوچنے لگے۔ آہستہ آہستہ کئی نام ذہن میں لا کر دہرانے لگے۔ پھر خسرو نے چونک کر کہا: "عظمیٰ!"

گوگی نے خوش ہو کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ مین تارا نے کہا: "اچھا تو تمہارا نام عظمیٰ ہے۔ چلو، اوپر برتھ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہے۔ ہم منزل پر پہنچ کر تمہیں جگا لیں گے۔"

وہ مین تارا کے ساتھ برتھ کے پاس آئی۔ پھر اشارے سے سمجھایا کہ وہ اوپر سو نہیں سکے گی۔ لہٰذا نیچے والی برتھ پر سونا چاہتی ہے۔ مین تارا نے خسرو کی طرف دیکھ کر سوچا، اگر یہ نیچے سوئے گی تو خسرو کو اٹھنے بیٹھنے کی تکلیف ہوگی۔ ایک خیال آیا کہ کمپارٹمنٹ کے فرش پر چادر بچھا کر عظمیٰ کو سُلا دے لیکن عظمیٰ شاید خسرو کے سامنے آرام سے نہ لیٹ سکے۔ خسرو نے کہا: "یہ جہاں کہتی ہے اسے سونے دو۔ ہم گزارا کر لیں گے۔"

وہ نیچے والی برتھ پر جا کر بیٹھ گئی۔ لیٹنے سے پہلے خسرو کی طرف دیکھا۔ ذرا شرماتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ اب اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے چہرہ نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک تو نظر آ ہی رہی تھی۔

مین تارا نے اس پر چادر ڈال دی۔ کیا بدلیاں پہاڑ کو چھپا سکتی ہیں؟ دیکھنے والوں کو بدلیوں میں چاند نظر آ جاتا ہے۔ خسرو نے کہا: "میں اوپر جا کر سو جاتا ہوں۔ تم غسل کر کے لباس بدل لو۔"

مین تارا نے ٹوائلٹ کی طرف دیکھا، پھر خسرو کو دیکھا، پھر عظمیٰ پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد عظمیٰ کی پائنتی برتھ پر بیٹھ گئی۔ آہستگی سے بولی: "میں ابھی ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

◆

۱۹۴۷ء میں سید پور ایک بہت ہی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کی اہمیت محض ریلوے ورکشاپ کی وجہ سے تھی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اس ورکشاپ کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ [illegible] بنگال میں ریلوے کے اتنے بڑے [illegible] ورکشاپ تھے کہ ان کے سامنے سید پور اور پہاڑتلی کے ورکشاپ [illegible] ورکشاپ کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

پاکستان وجود میں آیا تو بہاریوں کے وہ قافلے سید پور پہنچے جن میں ریلوے کے ہنرمند کاریگر، لوہار، ڈرائیور، مکینک اور ہر شعبے کے ماہرین موجود تھے۔ انھوں نے بہار اور بنگال ریلوے حکام کی یہ خوش فہمی ختم کر دی کہ مشرقی پاکستان ریلوے کسی معاملے میں ان کی محتاج ہو سکتی ہے۔ یہ سارے [illegible] ہنرمند تھے اور خاصی تعداد میں ایسے لوگ بھی سید پور آئے تھے جو نوسرباز تھے۔ سڑک کے کنارے بیٹھتے، بھولے راہگیروں کی جیب خالی کر دیتے تھے۔ دیوالی کی رات کو کروڑپتی اور سارے بیوپاری ہندو لاکھوں روپے کا جوا کھیلتے ہیں۔ ان کے

عقیدے کے مطابق لکشمی دیوی ان کے گھر آتی ہے اور لکشمی دیوی کے ساتھ دولت گھر آتی ہے۔ سید پور میں چند لکھ پتی مارواڑی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی سرزمین پر پہلی دیوالی منائی۔ دیوالی کی اس رات مسلمان جواری بھی کھیل میں شامل ہوئے۔ دوسری صبح چند مارواڑیوں نے حساب کیا تو پتا چلا، اس پہلی دیوالی میں بہاریوں نے ان کا دیوالیہ نکال دیا ہے، وہ ایک رات میں لاکھوں روپے ہار چکے تھے۔

ہندو بنیے سمجھ گئے تھے کہ یہ ہجرت کرکے آنے والے ہنرمند بھی ہیں اور چالاک بھی۔ جو بہاری سرمایہ لے کر ہندوستان سے آئے تھے، وہ ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا، بوگرہ اور پبنا جیسے شہروں میں اپنی اپنی کاروباری ذہانت کا سکہ جمانے لگے۔

اس کے باوجود ہندو بنیے صدیوں سے بنگال کی اینٹ اینٹ پر اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے۔ ہندو۔ بنگالی ہوں یا مسلمان بنگالی، سبھی ان مارواڑیوں سے متاثر تھے۔ ان کو اپنا ان داتا سمجھتے تھے۔

بہاری مسلمانوں اور ہندو بنیوں میں ایک بہت ہی وسیع فرق یہ تھا کہ ہندو صرف کاروبار ہی نہیں، سیاست بھی کرتے تھے جبکہ بہاری سیاستدان کبھی نہیں رہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک کسی بہاری نے سیاسی لیڈر کی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کیا۔ البتہ محدود پیمانے پر مشرقی پاکستان کے بہاریوں کی رہنمائی کی اور جتنے بھی بہاری رہنما ہوئے، ان سب کا ایک ہی سیاسی اصول رہا اور وہ یہ کہ پاکستان میں سیاسی حکومت ہو یا فوجی حکومت، بہاریوں کو ہر حال میں پاکستان کا وفادار رہنا ہے۔ ان کا یہ اصول زندہ ہے اور آج بھی بنگلہ دیش کے محصور بہاریوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

ہندو تاجروں نے سیاسی چالیں چلنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ میں اپنی پہلی اور آخری تقریر کے دوران کہا تھا: "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔" اس تاریخی فیصلے پر بنگالی عوام نے شدید احتجاج نہیں کیا۔ اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا اور ادھر سے ہندوستان کا تاجر اور سیاستدان اسے پکاتے رہے۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان دنوں روسی لٹریچر کا سیلاب آ گیا تھا۔ ہر شہر اور قصبوں کے بازار ہاٹ میں لسانی مسئلے پر کتابچے دستیاب ہو جاتے تھے۔ ان کتابچوں کے ذریعے سمجھایا گیا تھا کہ پاکستان میں اکثریت کی جو زبان ہے اسی کو قومی زبان ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ملک جب تک ناعاقبت اندیش سیاستدانوں اور مٹھی بھر سرمایہ داروں کی مٹھی میں رہے گا تب تک عوام کی بھاری اکثریت سے ناانصافی ہوتی رہے گی۔

بعد میں ناعاقبت اندیش سیاستدانوں نے ایسے کتابچوں کی پیشگوئی درست ثابت کر دی۔ چوبیس برس پہلے زبان کے معاملے میں بنگالی اکثریت کو نظرانداز کیا گیا تو ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں چھ نکات کی بنیاد پر بھاری اکثریت سے جیت کر انھوں نے پچھلی ساری ناانصافیوں کا بدلہ لے لیا۔

انسانی تاریخ دراصل ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے۔ مورخین اپنے اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت اس ڈھانچے میں بھرتے جاتے ہیں۔ اس پر تہذیب و ثقافت کی کھال منڈھتے ہیں۔ جب یہ ڈھانچہ مکمل جسم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے منہ میں اپنی اپنی مادری زبان رکھ کر بولتے ہیں۔ اس کی رگوں میں بدلتی ہوئی حکومتوں کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا لہو دوڑاتے ہیں۔ جب پالیسیاں بدلتی ہیں تو تاریخ کے سیاق و سباق زیر و زبر نہیں تو تھوڑے بدلتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ گزرے ہوئے وقت کی سچی ترتیب کا نام ہے۔ تاہم ترتیب کی یہ سچائی مورخین کے ذریعے بدلتی ہے۔ پچھلے چوبیس برس تک پاکستان اور بنگلہ دیش کی تاریخ ایک تھی۔ تاریخ نگار کے قلم ایک تھے۔ آج اسی بنگلہ دیش اور اسی پاکستان کے مورخین اپنے اپنے طور پر تاریخ کے ڈھانچے میں اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت بھر رہے ہیں۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کی کھال منڈھ رہے ہیں اور اب تاریخ کے منہ میں اپنی اپنی زبان رکھ کر بول رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں سید پور کی آبادی تقریباً پچیس ہزار تھی۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں خاندانی منصوبہ بندی کے باوجود اس کی آبادی اسی ہزار ہو گئی پھر مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد صرف ایک ماہ کے اندر اس کی آبادی پانچ لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ آبادی کے اس حیرت انگیز اضافے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ سید پور میں فوجی چھاؤنی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں بہاریوں کی آبادی تھی یعنی ایسا مضبوط قلعہ تھا جس میں پناہ لینے کے لیے آس پاس کے تمام شہروں کے بہاری بھاگے چلے آئے تھے۔

وہ ریل گاڑی سید پور پہنچنے لگی۔ خسرو نے کہا: "منی کو جگا دو۔ ہمارا سفر ختم ہو رہا ہے۔"

یمین تارا نے اسے آواز دی۔ پھر ذرا وقفے سے دوسری بار اسے پکارا۔ اس کے بعد بولی: "بے چاری کئی دنوں سے جاگ رہی تھی۔ جانے کب سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ کتنی گہری نیند میں ہے۔"

یقیناً منی گہری نیند میں تھی لیکن وہ ایسے حالات سے

گزرتی آئی تھی کہ گہری نیند میں بھی ہلکی سی آہٹ چونکا دیتی تھی۔ وہ مین تارا کی پہلی آواز پر ہی نیند کے حصار سے نکل آئی تھی لیکن آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی: انسانوں کے جہنم میں ہے یا جنت میں؟ مین تارا کی دوسری آواز نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ محبت کرنے والوں کی پناہ میں ہے۔ اس وقت مین تارا خسرو سے پوچھ رہی تھی: "کہیں بڑودیدی ہم دونوں کو بوجھ تو نہیں سمجھیں گی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بڑودیدی عورت کے روپ میں دیوی ہیں۔ وہ تم دونوں کو دل سے خوش آمدید کہیں گی پھر تمہاری بات تو کچھ اور ہی ہے۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مین تارا نے نظریں چراتے ہوئے کہا: "بڑودیدی تم پر اتنا بھروسا کرتی ہیں۔ تم انھیں دیوی کہتے ہو کیا اپنی دیوی سے جھوٹ بولو گے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے؟"

"سچ بولنا بہت آسان ہے لیکن عورت خواہ بیوی ہو یا بڑودیدی، اس کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ وہ اگر کسی کو نہ سنائے تو دیوار کو سنا دیتی ہے اور دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگ سن لیتے ہیں۔"

وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اور نجمی کے درمیان نیند کی ایک دیوار حائل ہے لیکن وہ بات اس دیوار کے پار چلی گئی تھی۔ نجمی فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کمپارٹمنٹ میں میاں بیوی کو دیکھا تھا۔ مین تارا نے مسکرا کر کہا: "تم تو جاگ رہی ہو۔"

خسرو نے کہا: "نجمی جاگ بھی رہی تھی اور ہماری باتیں بھی سن رہی تھی۔"

وہ خسرو کو دیکھتے ہوئے برتھ پر سے اٹھ گئی۔ پھر اشارے سے مین تارا کو بتایا کہ وہ ٹوائلٹ سے منہ ہاتھ دھو کر آ رہی ہے پھر وہ ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ "اس کے سن لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ایک تو بے چاری گونگی ہے، دوسرے مظلوم ہے۔ اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ بڑی محبت کرنے والی عورت ہے، ہمارے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔"

خسرو ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ مین تارا نے کہا: "کسی کی محبت بھی بوجھ بن جاتی ہے۔ آخر یہ ہمارے ساتھ کب تک رہے گی؟"

خسرو نے جواب دیا: "حالات سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، تقدیر اچھی ہو یا بری۔ ہر حالت میں عورت کو مناسب پناہ اسی وقت ملتی ہے جب کوئی اس سے نکاح پڑھا کر اس کا سہارا بن جاتا ہے۔ جب تک نجمی کو کہیں سے اخلاقی سہارا نہیں ملے گا ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

مین تارا نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا: "ہماری پہلی ملاقات یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا پھر میں نے تمہارے چمکتے دمکتے حسن پر توبہ کی کالک مل دی تھی۔"

"دوسرے لفظوں میں تم دشمنوں کی نظروں سے مجھے چھپانا چاہتے تھے۔ بے شک اب تک مجھے چھپاتے اور پناہ دیتے آ رہے ہو لیکن نجمی بھی مجھ سے کچھ کم نہیں ہے۔ آخر تم دو دو عورتوں کی حفاظت کس طرح کر سکو گے؟"

"اب تو ہم بڑودیدی کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ جب تک ان کے پاس رہیں گے کوئی تم دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ انشاءاللہ ہم جلد ہی پاکستان جانے کا راستہ نکال لیں گے۔"

گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند سوتے ہیں، لیکن کسی ٹرک یا ریل گاڑی کی آواز سن کر جیسے ساری بستی جاگ جاتی تھی۔ آبادی حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی۔ ریلوے لائن کے آس پاس شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ جھگیوں میں رہنے لگے تھے۔ درختوں کے سائے میں راتیں گزارتے تھے۔ ریل گاڑی کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ جاتے تھے۔ آنکھیں مل مل کر دیکھتے تھے کہ اس گاڑی میں ان کے لیے کہیں سے اناج آیا ہے یا نہیں؟

تلسی رام کے آدمیوں نے دروازے پر دستک دی۔ خسرو نے ان کی آوازیں سن کر دروازہ کھول دیا۔ ان کے ساتھ کچھ مسلح سپاہی تھے۔ ایک نے کہا: "آپ آرام سے اپنی عورتوں کے ساتھ ویٹنگ روم میں چلے جائیں۔ آپ لوگوں کو تلسی رام جی کے مکان میں پہنچا دیا جائے گا۔"

مین تارا نے اپنی اٹیچی اٹھا لی۔ پھر نجمی کے ساتھ خسرو کے پیچھے پلیٹ فارم پر آ گئی۔ وہاں بجلی کی روشنی میں بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ پولیس والے انھیں لاٹھیوں سے دھکیلتے ہوئے اناج کے ویگن سے دور بھگا رہے تھے۔ رائفل بردار سپاہی فائرنگ کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہ تینوں ویٹنگ روم میں آ گئے۔ مین تارا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز پر کہنی ٹیکتے

ہوئے پھر ایک ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا: "مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس ویگن کا تمام اناج ان لوگوں میں تقسیم کر دیتی۔"

"یوں تقسیم کرنے کو خیرات کہتے ہیں اور خیرات دو کو دی جا سکتی ہے، دو ہزار کو دی جا سکتی ہے۔ خیرات سے ایک وقت کی یا دو دن کی بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ بہن تارا! تم ذخیرہ اندوز نہیں ہو اس لیے انسانی ہمدردی سے سوچ رہی ہو۔ ورنہ یقین کرو۔ ان ذخیرہ اندوزوں کے بس میں ہوا اور پانی نہیں ہے۔ ورنہ یہ نیکی کمانے کے لیے دوسروں کو ایک ایک قطرہ پانی پلاتے اور زندگی کی ایک ایک سانس خیرات کے طور پر دیتے رہتے۔ دراصل خیرات اس معاشرے میں دی جاتی ہے اور لی جاتی ہے جہاں ایک کے بس میں سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔"

مکھن رام کا ایک آدمی ایک مارواڑی جوان کے ساتھ ویٹنگ روم کے اندر آیا۔ پھر اس نے کہا: "خسرو میاں! یہ مکھن رام جی کے سالے، آپ کی بڑو دیدی کے بھائی ہری رام ہیں۔"

ہری رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے کہا "خسرو بھائی! آپ مجھے ہری رام نہیں صرف ہریا کہہ سکتے ہیں۔ پورے سید پور میں ہریا سیٹھ کے نام سے مشہور ہوں۔ بڑو دیدی تو آپ کے نام کی مالا جپتی رہتی ہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی اچھا تھی۔ دیدی نے کہا ہے، آپ کو اور بہودی (بہو) کو فوراً ان کے پاس پہنچاؤں۔ پر تو ایک سمسیا (مسئلہ) ہے۔"

خسرو نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے اور بتائیے، مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا: "ایک لاش کو دیکھ کر مردار کھانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ابھی ہمارا اناج کا ویگن آیا ہے اور سید پور کی جنتا کا یہ حال ہے۔ ویسے تو ہمارے آدمیوں اور سپاہیوں نے بھوکے ننگوں کو لاٹھیوں سے ہانک دیا ہے لیکن اور طرح کے بھی بھوکے ننگے ویٹنگ روم سے باہر امڈے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ریلوے کے افسر ہیں، کچھ مکتی باہنی والے ہیں، کچھ یہاں کے پٹھے ہیں۔"

خسرو نے کہا: "میں سمجھ گیا، یہ لوگ اناج کے ویگن میں سے اپنا اپنا حصہ مانگ رہے ہوں گے۔"

"جی ہاں، مگر ہم نے کیا حرام کا اناج منگایا ہے۔ ہماری محنت لگی ہے، ہمارا دھن لگا ہے۔ ویسے میں پہلے ہی ریلوے افسروں کی جیبیں گرم کر چکا ہوں۔ یہ محض دکھاوے کے لیے رعب جمانے آئے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرنے سے یہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے جائیں گے۔ بی ڈی آر والے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ مکتی باہنی والوں سے میں نمٹ لوں گا۔"

خسرو نے پوچھا: "پھر کیا مسئلہ رہ گیا؟"

"وہ کیا ہے کہ سندھو سیٹھ ہمارا لوڈ ویگن یہیں خرید لینا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں جتنی ہماری رقم لگی ہے، وہ اس سے دوگنی رقم دیں گے۔ ہم ویگن ان کے حوالے کر دیں۔"

خسرو نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا: "میں کاروباری باتیں نہیں جانتا۔ مجھے کیا معلوم کہ یہ اناج کس طرح فروخت کرنا چاہیے۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ بھائی! اناج ہم ویگن سے گودام میں لے جائیں گے۔ گودام سے بازار میں لے جائیں گے۔ بڑی جھنجھٹ ہے، قدم قدم پر پولیس والوں کو بھتہ دو، غنڈوں بدمعاشوں کو خوش رکھو۔ ورنہ وہ لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے اچھا ہے کہ دوگنی قیمت مل رہی ہے۔ مال یہیں بیچ دیا جائے۔"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں تو یہی کریں۔"

"میرے کرنے سے ہوتا تو میں کر چکا ہوتا۔ جیجا جی مکھن رام! مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں۔ سختی سے کہلا بھیجا ہے کہ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔ یہ کاغذ لے کر آیا ہوں۔ آپ اس میں لکھ کر مجھے آگیا (حکم) دیں تو میں اپنے طور پر یہ مال یہیں بیچ دوں۔"

اس نے ایک کاغذ خسرو کی طرف بڑھا دیا۔ ایک قلم بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ خسرو نے تھوڑی دیر تک کاغذ اور قلم کو دیکھا۔ پھر کہا: "ہری رام جی!"

ہریا نے ٹوکتے ہوئے کہا: "ہری رام نہیں صرف ہریا۔ میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ آپ کا سیوک ہوں۔"

"اچھی بات ہے ہریا! میں دستخط کرنے سے پہلے بڑو دیدی سے مشورہ کروں گا۔"

"یہ کیا خسرو میاں! کاروبار کے معاملے میں بھلا عورت کیا مشورہ دے سکتی ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ اتنا سمجھتا ہوں کہ اس کاغذ پر اگر دیدی کے بھی دستخط ہو جائیں تو میری ذمے داری بہت حد تک کم ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ دیدی سے ملنے، مشورہ کرنے، دستخط کرنے تک مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"وہ کیا ہے کہ آپ یہاں گھنٹوں بیٹھ کر سوچ سکتے ہیں،

سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو ان خریداروں سے ملواتا ہوں۔ وہ آپ کو کاروبار کی اونچ نیچ سمجھائیں گے۔ آئیے نا، باہر چلیے۔"

وہ کرسی سے اٹھنے لگا۔ پھر اس نے نین تارا اور منی کی طرف دیکھا۔ مونے نور سی ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر کہا۔ "کیا ہے کہ میرا دل [illegible] زمانے میں بکا ہوا ہے۔ میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ آپ دونوں میں سے ہماری ودی کون ہیں؟"

خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نین تارا کی طرف اشارہ کیا۔ نین تارا نے اپنے سر پر آنچل رکھ لیا۔ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کیا۔ ہیرا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آداب! آپ تو ہمارے یہاں سے بھی زیادہ سُندر ہیں۔ کیا ہے کہ ابھی میں کاروبار میں بکا ہوا ہوں۔ کچھ پل میں بہت سی باتیں ہوں گی۔ آئیے خسرو بھائی!"

خسرو نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہیں بیٹھی رہو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ چاروں طرف پہرہ ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

نین تارا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ویٹنگ روم کے دروازے سے زیادہ دور نہ جانا۔"

"نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔"

وہ ہیرا کے ساتھ باہر آیا۔ ریل گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کا ڈبہ [illegible] شیشے پر پردے [illegible] تھیں [illegible] کے ساتھ [illegible] مسافر [illegible] اس لیے [illegible] ان کے [illegible] سوار [illegible] لائن [illegible] دیا گیا تھا۔ [illegible] دروازے کھڑکیاں بند کیے گہری نیند [illegible] پلیٹ فارم پر ایک بھی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ [illegible] تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دھوتی پہنے [illegible] ہوئے تھا [illegible] [illegible] لاش [illegible] [illegible] [illegible] ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے [illegible]

"جے رام جی کی۔"

خسرو نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ہیرا نے کہا۔ "یہ دھرم چند جی ہیں۔ یہاں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ ہمارا [illegible] [illegible] یہ خسرو صاحب ہیں۔ ان کے بارے میں تو میں آپ کو بہت [illegible] [illegible] پہلے ہی [illegible] تھا کہ [illegible]

ان کے ہاتھ سے فروخت ہوگا۔"

دھرم چند نے کہا: "تلسی رام جی کو میں خوب جانتا ہوں وہ اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ انھوں نے خسرو میاں کے اندر بہت سے گن دیکھے ہوں گے۔ اب خسرو میاں آپ کو ثابت کرنا ہے کہ آپ تیز نکلے ہیں۔ کھڑے کھڑے پورا مال فروخت ہو جائے اور وہ بھی دوگنے منافع پر، تو تلسی رام جی کی نظروں میں آپ کا مان اور بڑھ جائے گا۔"

خسرو اس کی باتیں سن رہا تھا اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان دس آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جن کے حلیے چھٹے بدمعاشوں کی طرح تھے۔ کوئی لنگی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں لوہے کی لمبی سی سلاخ تھی۔ کوئی پتلون پہنے ہوئے تھا مگر اوپری جسم ننگا تھا۔ کسی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کی مونچھیں لمبی اور گھنی تھیں۔ پلیٹ فارم کی روشنی میں ان کی آنکھیں سرخ انگارہ جیسی لگ رہی تھیں۔ وہ سب نشے میں چور تھے۔ وقت آنے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔

دھرم چند نے خسرو کی نظروں کو تاڑتے ہوئے کہا: "یہ سب میرے آدمی ہیں۔" پھر ذرا قریب ہو کر کہا: "چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ سب کے سب ہمارے ہیں۔ پاکستان کے وقت ان لوگوں نے ہندوؤں اور [illegible] کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اب یہ لوگ میرے پیچھے دُم ہلاتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر کسی بھی بیوپاری کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال سکتے ہیں۔"

دھرم چند نے اپنی کنپٹی کو ایک انگلی سے ٹھونکتے ہوئے کہا: "یہ دماغ کی بات ہوتی ہے۔ [illegible] آدمیوں کو قتل [illegible] دماغ کی بات ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک بیوپاری [illegible] میں آیا تھا وہ [illegible] نہیں جانتا تھا۔ ان بدمعاشوں نے اس مال کو [illegible] نہیں [illegible] رات ہی میں لوٹ لیا۔ [illegible] ان بدمعاش کے ہاتھ میں لوہے کا [illegible] دو دو [illegible] کو آسانی سے توڑ دیتا ہے۔ جانے ان بدمعاشوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج رات اناج کا ٹرین پہنچنے والا ہے۔ بس یہ دھاوا بولنا چاہتے تھے۔ میں نے [illegible] تلسی رام جی کا مال ہے۔ [illegible] کوئی دھاندلی نہیں ہوگی۔ جی، جی، جی، جی۔ آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔"

خسرو نے ان دس غنڈوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر پلیٹ فارم [illegible] روم کے [illegible] دروازے کو دیکھا جس کے پیچھے

نین تارا اور مٹھل انتظار کر رہی تھیں۔ اب اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا: "سیٹھ دھرم چند! آپ نے کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ آپ بڑے سیانے ہیں اور ادھر ہریا! وہ میرے آدمی کہاں ہیں جو گھلاسے میرے ساتھ آئے تھے۔ مال کی بلٹی ان کے پاس ہے۔ انھیں میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں ابھی معاملات طے کرتا ہوں۔"

دھرم چند خوش ہو گیا۔ خسرو نے کہا: "آپ باہر انتظار کریں۔ میں ویٹنگ روم میں ذرا اپنے آدمیوں سے باتیں کروں۔"

وہ ویٹنگ روم میں آیا۔ مٹھل اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ بے چاری زبان سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ نین تارا نے پوچھا: "باہر کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "دوست نما دشمن ہیں۔ ان کے اشاروں پر چلو تو دوست، نہیں تو دشمن۔" پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا: "سچ پوچھو تو کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ ہمارے تیجا جی مارواڑی ہیں اور یہ دھرم چند جو سودا کرنے آیا ہے یہ بھی مارواڑی ہے لیکن کاروباری معاملات میں جہاں منافع حاصل ہوتا ہے وہاں اپنے مارواڑی کا دشمن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سارا منافع تیجا جی کے کھاتے میں جائے اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ تیجا جی سے دشمنی ظاہر ہو جائے۔ اسی لیے سودا کرنے آیا ہے۔ ڈگنا منافع دینے کو تیار ہے۔ اگر سودا نہ ہوا تو یہ مال بازار تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اُدھر تیجا جی کو یہ خبر پہنچے گی کہ اناج سے بھرے ویگن کو غنڈوں، بدمعاشوں نے لوٹ لیا ہے۔ تیجا جی نے خوب سوچ سمجھ کر یہ سارا اناج میرے حوالے کیا ہے۔ وہ اپنے سالے پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں اور ٹھیک کرتے ہیں۔ یہ ہریا اس دھرم چند سے ملا ہوا ہے۔"

نین تارا نے کہا: "ہاں، اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ تم سے کاغذ پر دستخط کروا رہا تھا تاکہ مال کو اونے پونے بیچنے کی ذمے داری تم پر ہو۔"

"اناج سے بھرا ہوا ویگن ہم لے کر آ رہے ہیں، یہ بات صرف ہریا کو اور بڑودیدی کو معلوم تھی لیکن یہاں پہنچتے ہی دھرم چند اور اس کے بدمعاش ہمارے سروں پر آ پہنچے۔ یقیناً ہریا نے انھیں خبر دی ہوگی۔ یہ سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ پلیٹ فارم پر بی ڈی آر کا کوئی سپاہی نظر نہیں آ رہا ہے اور تو اور تیجا جی کے وہ آدمی بھی نہیں ہیں جو ہمارے ساتھ گھلاسے..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور وہ دو آدمی داخل ہوئے۔ جو گھلاسے ان کے ساتھ آئے تھے ان کے پاس مال کی بلٹی تھی۔ ان کے ساتھ ہریا بھی تھا۔ خسرو نے ان آدمیوں سے پوچھا: "تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

ایک نے جواب دیا: "ہمارا ویگن مال گودام کی آخری لائن پر لگایا جا رہا تھا۔ ہمارے دو آدمی اب بھی مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ ہم ویگن کو ریلوے واچ اینڈ وارڈ کے بھروسے پر چھوڑ نہیں سکتے۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

"وہ بی ڈی آر کے جوان کہاں ہیں، جو یہاں تک ہمارے ساتھ آئے تھے؟"

"کچھ ویگن کے پاس ہیں اور کچھ اسٹیشن کے پیچھے ایک ہوٹل کو کھلوا کر چائے پی رہے ہیں۔"

"ان سے جا کر کہو، پلیٹ فارم پر دھرم چند کے غنڈوں کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔ انھیں بھاگنے کا موقع نہ دیں۔"

ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اگر آپ سودا نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔ میں دھرم چند جی کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ واپس چلے جائیں گے۔"

وہ جانا چاہتا تھا۔ خسرو نے سخت لہجے میں کہا: "ہریا! تم اس ویٹنگ روم سے باہر قدم نہیں نکالو گے۔ یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "کیا ہے کہ دھرم چند جی نے اور ان کے آدمیوں نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ پھر آپ انھیں..."

خسرو نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "میں نے کہا نا، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ نہیں بیٹھو گے تو بڑودیدی کو تمھارا کچا چٹھا سنا دوں گا۔"

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک تلسی رام کا ایک آدمی باہر جا چکا تھا۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا: "خسرو صاحب! باہر جو مارواڑی کھڑا ہوا ہے، وہ بی ڈی آر کے جوانوں سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اس نے اسٹیشن کے پیچھے چائے کی ہوٹل کھلوائی ہے تاکہ تمام سپاہی وہاں کھاتے پیتے رہیں۔"

خسرو ہریا کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! میں تیجا ماما کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ یہاں سید پور میں بڑی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہماری کوئی دکان نہیں ہے کہ ہم صبح سے شام تک راشن بیچنے کے لیے بیٹھے رہیں۔ کہیں نہ کہیں تھوک کے حساب سے کسی نہ کسی سیٹھ کو دینا ہی ہوگا۔ اس لیے میں دھرم چند سے بات کر چکا تھا۔"

ایک بی ڈی آر کا جوان اسٹین گن شانے سے لٹکائے

ہوئے ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "میں آپ لوگوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ یہاں تک ہمارا ساتھ دیا لیکن دشمن ابھی تک پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے کہا: "مجھے ابھی آپ کے آدمی نے بتایا ہے۔ ہمارے مسلح جوانوں نے باہر دھرم چند اور اس کے آدمیوں کو گھیر رکھا ہے۔ کوئی وہاں سے جا نہیں سکے گا۔ دراصل یہ دھرم چند پہلے میرے پاس آیا تھا کہہ رہا تھا "اگر میں اس کا ساتھ دوں تو گودام کے مال سے مجھے اتنا منافع ملے گا جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے جواب دیا: میں ایسا کام کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے فائدہ بھی حاصل ہو اور میری ڈیوٹی پر کوئی بات نہ آئے۔ اگر خسرو صاحب کو ان کی عورتوں کو اور اناج کے گودام کو نقصان پہنچے گا تو مجھ سے جواب طلبی ہوگی۔ اس لیے پہلے خسرو صاحب سے معاملات طے کریں۔"

خسرو نے کہا: "شاباش! آپ نے اچھا جواب دیا۔ آپ پر اب کوئی بات نہیں آئے گی اور رہ گئی آپ کے تھوڑے بہت منافع کی بات تو وہ مجھ سے ملے گا۔ آئیے باہر چلیں۔"

خسرو نے اشارے سے ہریا کو اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سہمت اور دہشت زدہ حالت میں اس کے ساتھ چلتا ہوا باہر آیا۔ باہر بیسیوں پولیس کے مسلح نوجوان نظر آرہے تھے جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان وہ دس بدمعاش سر جھکائے کھڑے تھے۔ دھرم چند نے خسرو کو دیکھتے ہی کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے تو آپ سے کوئی دشمنی نہیں کی۔ میں تو آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔"

خسرو نے کہا: "بڑے بھائی! میں کب دشمنی کر رہا ہوں۔ آپ نے زبان سے دھمکی دی کہ آپ کے آدمی پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال لیتے ہیں۔ اناج کا گودام لوٹ لیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بڑی خاموشی سے دھمکی دے رہا ہوں۔ میرے پاس یہ مسلح جوان موجود ہیں جو میرے ایک اشارے پر آپ کے تمام بدمعاشوں کو بھون کر رکھ سکتے ہیں۔"

پھر وہ ان بدمعاشوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا: "تم سب بیوپاری کہلاتے ہو۔ میں تمھیں بتاؤں کہ بیوپار کے معنی کیا ہیں۔ بیوپار دراصل ہندی کا لفظ بیوہار ہے جو کثرت استعمال سے بیوپار بن گیا۔ بیوہار کے معنی ہیں حسن سلوک۔ اگر تم لوگ حسن سلوک نہیں کرتے ہو تو بیوپاریوں کے نام کو بدنام نہ کرو۔ اس گودام میں ہمارا جو اناج ہے، اس کی مالیت زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپے ہے۔ سیٹھ دھرم چند اس کے ایک لاکھ روپے دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، یہ مال بازار میں جا کر تقریباً دو لاکھ اور چار لاکھ کا منافع دے گا۔ سید پور میں اناج کتنا مہنگا ہے یہ میں سن چکا ہوں۔ غریب والدین اپنے بچوں کو بیچ کر بھی ایک وقت کا چاول خرید نہیں سکتے۔ کیونکہ بچوں کو کوئی خریدنے والا ہی نہیں ہے۔ سب پر اپنی اپنی جان بھاری ہے۔ کچھ دیر پہلے میری شریک حیات نے کہا تھا، اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ یہ سارا اناج غریبوں میں تقسیم کر دیتی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرے جیجا جی کا مال ہے۔ میں انھیں پچاس ہزار کے مال پر زیادہ سے زیادہ دس ہزار کا منافع دوں گا لیکن کل سید پور کے بازار میں اناج سستا فروخت ہوگا۔ اگر چاول پندرہ روپے سیر بک رہا ہے تو میں پانچ روپے سیر فروخت کروں گا۔"

دھرم چند نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ اپنے مال کے اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ویسے میں نے آج تک کسی بھی منڈی میں یہ نہیں دیکھا کہ سارے بیوپاری ایک بھاؤ بیچیں اور کوئی ایک بیوپاری ان کے مقابلے میں سستا بیچ کر چلا جائے۔ آپ نے بیچ لیا تو میں آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ اچھا جی نمستے۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ خسرو نے تمام غنڈوں پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ایک غنڈہ نسبتاً کم عمر تھا اور اچھی صورت شکل کا مالک تھا۔ معلوم ہوتا تھا، حالات نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ اس نے بی ڈی آر کے ایک جوان سے کہا: "ان سب کو جانے دو۔ صرف اس جوان کو گرفتار کر لو۔"

وہ جوان گھبرا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ ساتھی ابھی اپنی جان چھڑانے کی فکر میں تھے۔ اس لیے وہاں سے چلے گئے۔ بی ڈی آر کے ایک جوان نے خسرو کے قریب آکر آہستگی سے کہا: "آپ اسے گرفتار کر کے کیا کریں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اسے حوالات پہنچا دیں گے لیکن یہ ہندو غنڈے دور تک اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسے چھڑا کر لے جائیں گے:

"میں اسے جیل بھجوانا نہیں چاہتا۔ اس سے دو باتیں کر لوں۔ پھر میں آپ لوگوں سے بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر خسرو اس جوان کے پاس آیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے کے انداز میں پلیٹ فارم پر چند قدم دور چلا گیا۔ اس نے پوچھا: "دھرم چند تمھیں کیا دیتا ہے؟"

"وہ ہم سب کو روزانہ دو سیر چاول، آدھا سیر چنے اور ایک پاؤ ستو دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شراب کی ایک بوتل بھی ملتی ہے۔ کبھی ضرورت پڑنے پر نقد روپے بھی مل جاتے ہیں۔"

"یہاں غنڈوں کی کتنی پارٹیاں ہیں؟"

"بس ہماری ایک پارٹی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ کھنا جیسے شہر میں غنڈوں کی دو پارٹیاں تھیں، سید پور تو بہت بڑا شہر ہو گیا ہے۔ جب شہر بڑھتا اور پھیلتا ہے تو غنڈوں کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے۔"

اس جوان نے کہا: "یہاں جتنے بھی غنڈے ہیں، وہ کسی نہ کسی سیٹھ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ غنڈے شراب اور جوئے کا اڈا چلاتے ہیں۔"

"یہاں ایسا کون شخص ہے جو اپنے اثر و رسوخ کا مالک ہو؟"

وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا: "میں بڑے بڑے لوگوں کو نہیں جانتا۔ البتہ ایک جوان ہے جو دیکھنے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن [illegible] والے اس سے گھبراتے ہیں۔ غنڈے بھی اس کے منہ نہیں لگتے۔"

"ابھی اس آدمی کو حاضر کرو۔ تم نے یہ کام کیا تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔"

"جناب، وہ میرے کہنے پر یہاں نہیں آئے گا۔"

"تمہارے ساتھ ایک سپاہی جائے گا۔ تم ابھی جاؤ۔"

خسرو نے ایک سپاہی سے کہا: "ابھی اس کے ساتھ رکشے میں جاؤ۔ یہ جس آدمی کو کہتا ہے اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔"

وہ جانے لگے۔ خسرو نے کہا: "اور سنو! راستے میں اس کے غنڈے ساتھیوں نے یا دھرم چند نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہ دینا۔"

وہ چلے گئے۔ خسرو نے ہریا کے پاس آ کر کہا: "میں ان عورتوں کو جلد سے جلد برڈ وڈیڈی کے سامنے پہنچانا چاہتا تھا لیکن تم نے کاروباری معاملے کو الجھا دیا ہے۔ میں ابھی یہاں سے [illegible] کام۔ تم جاؤ اور برڈ وڈیڈی کو [illegible] کرے آؤ۔"

"[illegible] آپ برڈ وڈیڈی سے میری شکایت کریں گے؟"

"شکایت کرنے کی ضرورت [illegible] ہے۔ کیا ڈیڈی [illegible] ہیں؟" وہ چپ ہو گیا۔ خسرو نے کہا۔ "[illegible] جلدی جاؤ۔ میں ان عورتوں کو زیادہ دیر یہاں [illegible] نہیں چاہتا۔"

[illegible] بی ڈی [illegible] کے جوان نے آ کر کہا: "یہاں [illegible] کی خیر ہو سکتی ہے۔ کل دوپہر کو ہم چلے جائیں گے۔ [illegible] سوچتا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد آپ کا کیا بنے گا؟"

خسرو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر سانس چھوڑتے ہوئے بولا: "جہاں قانون ساتھ چھوڑ دیتا ہے یا بے بس ہو جاتا ہے، وہاں سے غنڈوں کی حکمرانی شروع ہوتی ہے۔ دھرم چند نے غنڈوں کو یہاں لا کر میرے حق میں بہت اچھا کیا۔ مجھے ایک سبق سکھا دیا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس لیے اب میرے غنڈے ان کے غنڈوں کی کاٹ کریں گے۔"

وہ ویٹنگ روم میں آ گیا۔ نین تارا نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، سب چلے گئے۔ فی الحال دشمنوں کی طرف سے خطرہ نہیں ہے لیکن یہاں مجھے کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔ اس لیے تم لوگوں کے ساتھ برڈ وڈیڈی کے پاس نہیں جا سکوں گا۔ میں نے ڈیڈی کو یہاں بلایا ہے۔ وہ آنے والی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ نین تارا اندر سے تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا ابھی اٹھ کر جائے اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرے۔ اس کی پریشانی کچھ تو کم ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اسی دوران منظی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خسرو کے پاس پہنچ گئی۔ پھر وہ اس کے سر پر محبت سے اور ہمدردی سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ نین تارا گم سم بیٹھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ خسرو سے کیوں اتنی ہمدردی کر رہی ہے؟

خسرو آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے باوجود عورت کے ہاتھ کا لمس سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس کے دل میں آیا۔ فوراً آنکھ کھول کر دیکھے۔ پھر دماغ نے سمجھایا، دیکھے گا تو وہ شرما کر دور ہو جائے گی۔ اس سے پہلے لکھنؤ سے آتے وقت وہ اوپری برتھ پر سو رہا تھا۔ نین تارا اسے نیند کی حالت میں سمجھ کر قریب آئی تھی۔ ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانے لگی تھی۔ اس وقت بھی اس نے چاہا تھا کہ سر اٹھا کر دیکھے لیکن ضبط سے کام لیا تھا۔ اس وقت بھی دماغ نے سمجھایا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھے گا تو وہ دور ہو جائے گی۔

نین تارا نادان نہیں تھی۔ اتنا سمجھتی تھی کہ منظی کے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے خسرو سے ہمدردی اور محبت سے پیش آ رہی تھی۔ عورت کے پیار میں تقدس بھی تو ہوتا ہے۔

نین تارا کو حیرانی اس بات کی تھی کہ خسرو کیوں چپ ہے؟ کیوں آنکھیں کھول کر نہیں دیکھ رہا ہے؟ کیا سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں؟ ہر عورت کی چھیڑ خانی سہنے لگتے ہیں؟

اسی وقت منظی نے ہاتھ کے اشارے سے نین تارا کو

خسرو نے کہا: "میں سمجھ گیا۔ ہڑنا کے معنی ہنسنا۔ تو پھر بوڑنا کے معنی بولنا ہوئے۔"

نین تارا نے کہا: "تو پھر عظمیٰ کی بات یہ بنی کہ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا ڈاہیے۔ ڈاہیے کا مطلب ہوا چاہیے۔ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا چاہیے۔"

عظمیٰ خوش ہو کر ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی پھر کہنے لگی: "ہم کو کبھی کبھی ہڑنا بوڑنا ڈاہیے۔ ڈکھ ہڑکے ہو جاشے ہیں۔"

وہ دونوں پھر اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے کہ کون کون سے لفظ کٹی ہوئی زبان سے زخمی ہو جاتے ہیں اور اپنی صحیح صورت میں ادا نہیں ہوتے۔ بات رفتہ رفتہ سمجھ میں آ گئی۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی: "ہم کو کبھی کبھی ہنستے بولتے رہنا چاہیے۔ دکھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔"

نین تارا نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم ہمارے ساتھ رہو گی تو یقیناً ہمارے دکھ بٹتے رہیں گے۔ تم بہت اچھی ہو۔"

خسرو نے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ دیدی اب آنے ہی والی ہوں گی۔"

نین تارا نے کہا: "ہم یہاں تک میاں بیوی بن کر آئے۔ ہم نے دنیا والوں سے جھوٹ کہا۔ کیا بڑی دیدی سے بھی جھوٹ بولیں گے؟"

خسرو نے کہا: "دنیا والوں سے صرف جھوٹ کہا ہے۔ بڑی دیدی سے ہمیشہ جھوٹ کہتے رہنا ہوگا۔ ورنہ جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں نے شادی نہیں کی ہے تو پھر وہ مجھے اپنے پاس سے جانے نہیں دیں گی ــــ وہ کبھی گوارا نہیں کریں گی کہ میں [illegible] اور دشمن مجھے مار ڈالیں۔"

"میری وابستگی سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بہت فرق پڑے گا۔ میں ان سے کہوں گا، تمھارے رشتے دار پاکستان میں ہیں۔ اس لیے ہمارا یہاں سے پاکستان جانا ضروری ہے۔ وہ تمھیں تمھارے رشتے داروں کے پاس جانے سے نہیں روکیں گی۔ [illegible] سے نکل چلوں گا۔"

اس کی باتوں کے دوران عظمیٰ اشارے سے نین تارا کو خسرو کے پاس آنے کے لیے کہا۔ نین تارا نے بھی اشارے سے پوچھا: "کیا بات ہے؟ وہ کیوں بلا رہی ہے؟"

عظمیٰ نے گونگے اشارے میں سمجھایا: "میرے پاس آؤ۔ میری جگہ کھڑی ہو جاؤ اور اس طرح سر سہلاؤ۔"

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ بول سکتی تب بھی خسرو کے سامنے نہ بولتی۔ اشاروں سے ہی سمجھاتی "اپنے مرد کی پریشانی کے وقت ساتھ دینا چاہیے۔ عورت اس کی پریشانیوں کو سمجھ رہی ہے، اس کے کسی مسئلے کو اگر حل نہیں کر سکتی ہے تو کم از کم اس کے پاس سایہ بن کر رہ سکتی ہے۔ اس کے لیے ایسی زمین بن سکتی ہے جو کبھی اس کے پاؤں تلے سے نہیں نکلتی۔"

نین تارا اگرچہ ان باتوں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے قریب جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا۔ اپنے آدمی کے پاس کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے خواہ کسی کا دل کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو۔ خود آگے بڑھ کر اپنی ذمے داریوں کو سنبھالنا چاہیے لیکن وہ سوچتی ہی رہ گئی۔ اسے خسرو کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ [illegible] سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا: "نین تارا! میں جانتا ہوں، تم بے حد ذہین ہو مگر کبھی کبھی ڈرتے ہوئے بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ تم نے جس طرح میرے پاس آ کر میرے ذہن کا بوجھ کم کر دیا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

عظمیٰ ایک ہاتھ سے منہ دبائے ہنس رہی تھی۔ نین تارا بھی اور ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ آخر عظمیٰ سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ [illegible] ہنس پڑی۔ خسرو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ عظمیٰ کو اپنے قریب دیکھ کر بوکھلا گیا۔ [illegible] نے سر جھکا کر [illegible] وہ منہ چھپا کر ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستے [illegible] جب سے وہ اس کی ہم سفر [illegible] سے کھل کر ہنستے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا: "تم دونوں مل کر بیوقوف بنا رہی تھیں۔"

[illegible] میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسی عظمیٰ کو [illegible]

عظمیٰ [illegible] کر بیٹھ گئی پھر سنبھل [illegible]

[illegible] کر دیکھنے [illegible] تھی۔ وہاں سے [illegible] بیٹھی ہی ہی۔۔۔"

تنا رہی تھی کہ [illegible] کھلا ہوا ہے [illegible] اس کے بٹن لگا دو۔

نین تارا اس کے اشاروں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے [illegible] جانے کے خیال سے ہی پاؤں من من بھر کے ہو [illegible] وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا: "میں [illegible] ہوں۔ دیدی آتی ہی ہوں گی۔"

[illegible]

[illegible] مسلمان [illegible] خدا تمھیں سلامت رکھے، اب سامنے سے [illegible] تمھاری [illegible] کو جی بھر کر دیکھوں گی۔"

[illegible] اور عظمیٰ کے پاس آئیں۔ پھر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولیں: "ہائے میری بھابی کتنی [illegible]

[illegible] دیدی [illegible] میں بننے ہی والی ہوں۔"

[illegible] سامنے [illegible]

کر کہا: "بڑی دیدی! پیٹری بدل دیجیے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

عظمیٰ دیدی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے نین تارا کے سامنے لے آئی۔ وہ سر پر آنچل رکھے سر جھکائے شرما رہی تھی۔ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ دیدی کے سامنے آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "آداب۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر کہا: "یہ میری دلہن ہے۔"

دیدی نین تارا کے سحر طاری کرنے والے حسن کو تک رہی تھیں۔ خسرو کی آواز پر چونک گئیں۔ انھوں نے پہلے عظمیٰ کو دیکھا [illegible] گریبان کو دیکھا۔ وہ پتی سیوا کو اپنا دھرم سمجھتی تھیں۔ اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت اس کے بھائی کے گریبان کا بٹن کیوں ٹانک رہی تھی۔ اس کی بھابی سے پتی سیوا کا حق کیوں چھینا [illegible] تھی وہ حق خسرو کیوں اسے دے رہا تھا؟

انھوں نے خسرو سے عظمیٰ کے متعلق پوچھا: "یہ کون ہے؟"

عظمیٰ نے ذرا آگے بڑھ کر کہا: "اور [illegible]"

دیدی شدید حیرانی سے پیچھے ہٹ گئیں: "[illegible] رہی ہے؟ یہ کون سی بھاشا ہے؟"

"دیدی! ظالموں نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔ یہ ٹھیک طرح سے بول نہیں سکتی ہے۔ بے چاری بہت معصوم ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہے لیکن عقل کم ہے۔"

دیدی نے نین تارا کی طرف گھوم کر کہا: "اور تمھاری عمر بھی کم ہے اور عقل بھی کم۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"نین تارا۔"

"نین تارا! تم مجھ سے چھوٹی ہو۔ مجھے خسرو کی طرح عزیز ہو۔ تمھیں [illegible] اچھی بات [illegible] ہے۔ [illegible] تو میری بات سمجھ لو۔ میں ایک ہندو عورت ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی [illegible] سے ماتھے کی بندیا کسی دوسرے کے ماتھے پر چمکے۔"

دیدی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ذرا اپنے قریب جھکایا پھر اس کے ماتھے کو [illegible] سے چوم لیا۔

◆

وہ لانچ [illegible] لہروں کو چیرتی ہوئی تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ [illegible]

کے آخری سرے پر اسی بچے کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ اس سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ اگر رسی ٹوٹ جاتی تو وہ سیدھا برہم پتر کے گہرے پانی میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتا۔

وہ بچہ تقریباً سات برس کا ہوگا۔ نیچے گہرے پانی کو دیکھ کر دہشت سے کبھی چیخ رہا تھا اور کبھی رو رو کر اپنے والدین کو آوازیں دے رہا تھا۔ لانچ کے نچلے حصے میں تیسرے درجے کے مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سبھی اس بچے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ تماشا دیکھنا نہ چاہتے ہوں مگر دیکھنے پر مجبور ہوں۔

بچے کے آس پاس مکتی باہنی کے جوان اسٹین گن لیے ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ مسافروں کی بھیڑ میں سے کچھ رحمدل بنگالیوں نے اعتراض کیا۔ کسی نے کہا: "بچے کو چھوڑ دو۔" کسی نے کہا: "دشمنی بڑوں سے ہوتی ہے، بچوں سے نہیں ہوتی۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے چیخ کر کہا: "ہم نے چوبیس برسوں میں یہ سیکھا ہے کہ ایک طرف سے سانپ آئے، دوسری طرف سے بہاری آئے تو پہلے بہاری کا سر کچلنا چاہیے کیونکہ سانپ کا کاٹا بچ سکتا ہے، بہاری کا مارا بچ نہیں سکتا۔"

مکتی باہنی کے دوسرے جوان نے اسی طرح چیخ کر کہا: "یہ بچہ سانپوں کی جات ہوتا ہے۔ یہ خود کسی سانپ کا بچہ ہے۔"

ایک عورت بھیڑ کو چیرتے ہوئے چیختے ہوئے اس بچے کی طرف جانے لگی: "یہ میرا [illegible] اسے [illegible] چھوڑ دو۔ یہ میرا بچہ ہے۔ مجھے دے دو، یہ میرا بچہ ہے۔"

ایک مسلح جوان نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا: "ہمیں بوکا (بیوقوف) نہ سمجھو۔ تم بنگالی ہو، یہ بہاری ہے۔"

اس عورت نے کہا: "میں بہاریوں کے محلے میں رہتی تھی۔ یہ [illegible] کے ساتھ [illegible] کھیلتا تھا۔ اس سے [illegible] اسے مجھے دے دو، یہ میرا ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ، ایک ماں کی بددعا نہ لو۔"

ایک مسلح جوان نے بچے کے [illegible] جیسے [illegible] کو [illegible] ہوئے پوچھا: "کیا یہ تمہاری ماں ہے؟"

بچہ نادان تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کو ماں کہہ سکتا تھا۔ [illegible]

ان دنوں بہاری اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کوئی اتنے لمبے سفر پر نہیں نکلتا تھا۔ اس لانچ میں تمام مسافر بنگالی تھے یا پھر وہ بہاری ہو سکتے تھے جو روانی سے بنگالی زبان بولتے تھے اور اپنی اصلیت کو چھپا سکتے تھے۔ بچے نادان ہوتے ہیں۔ وہ بہروپ کو نہیں سمجھتے۔ اس لیے بے اختیار مادری زبان میں بولنے لگتے ہیں۔

ایک بنگالی مسافر اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا: "ایسا ظلم نہ کرو۔ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے غصے سے جھنجھلا کر کہا: "تم لوگ کیسے بے حس ہو۔ اتنی جلدی بھول گئے کہ ان بہاریوں نے تمہارے معصوم بچوں کو بھی [illegible] تلے ذبح کیا تھا۔ انھیں ان معصوموں پر رحم نہیں آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

ایک اور بنگالی نے اٹھ کر کہا: "شاید کسی بہاری نے بھی یہی بات کہی ہوگی، کیونکہ ہر قوم میں صرف ظالم نہیں ہوتے۔ مظلوموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ شریف زیادہ اور بدمعاش کم ہوتے ہیں اور جو کم ہوتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں، وہی ظالم اور بدمعاش ہوتے ہیں۔"

مسلح جوان نے آگے بڑھ کر سٹین گن کے دستے سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا اور تکلیف سے سر [illegible] دیتے ہوئے کہا: "ہم نے اس [illegible] کو آزاد کرایا ہے۔ مگر مکتی باہنی والے نہ ہوتے تو آج بھی تم لوگ پاکستانی حکمرانوں کے غلام بنے رہتے۔"

سب کو چپ سی لگ گئی۔ وہاں ایسے تھے جو کسی بھی [illegible] مصیبت میں نہیں [illegible] چاہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ جو ہو رہا ہے ہونے دو، سب اپنے وطن پہنچنے کی فکر کرنا چاہیے۔ کچھ بنگالی انتقام کی آگ میں جل رہے تھے [illegible] ماں باپ کہیں سے آ جاتے۔

[illegible] خوب بارش ہو رہی تھی [illegible] جاری تھی اور لہریں یوں بپھر رہی تھیں جیسے انھیں [illegible]

عرشے پر فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس مسافروں کے لیے کیبن بنے ہوئے تھے لیکن ان دنوں کوئی کسی کو اپنے مقابلے میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس [illegible] کرتا تھا [illegible] کے ہوش میں رہنے والے لوگ [illegible] سے [illegible] ٹکٹ [illegible] کر نچلے درجے میں بیٹھے ہوئے [illegible] آتے تھے کوئی [illegible] منہ لگنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ مکتی باہنی کے [illegible] جوان عرشے پر آکر اعلان کر رہے تھے [illegible] کس کا ہے؟ [illegible] بھی ہے سامنے آجائے پھر ہم اس بچے کو نہیں ماریں گے نہیں تو یہ پانی میں بہہ جائے گا

سبھی اس تجسس میں مبتلا تھے [illegible] آخر [illegible] کا ہے؟ اس کے والدین یا [illegible] سامنے کیوں نہیں آتے [illegible]؟ [illegible] ایک ہی جواب [illegible] [illegible] اس کی [illegible] میں [illegible] ہے

[illegible]

کیوں نہ لگے؟ سب یہ بات یقینی ہے کہ [illegible] سامنے جائے گی تو بچہ زندہ نہیں بچے گا۔ [illegible] ساتھ وہ بھی ماری جائے گی۔ شاید اس کے ساتھ اس کے خاندان کے [illegible] لوگ بھی مارے جائیں [illegible] بچے کی خاطر [illegible]

[illegible]

انسپکٹر نے فرسٹ کلاس [illegible] ہوئے کہا: "میں کیا کر سکتا ہوں۔ [illegible]

ایک اور مسافر نے کہا: "ہم تمام بہاریوں کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ صرف ایک معصوم بچے کی جان بچانے کی بات کر رہے ہیں۔ تم اپنے سپاہیوں کے ساتھ جا کر انہیں سمجھانے کی کوشش تو کرو۔"

"میں سب سے پہلے مکتی باہنی والوں کو سمجھا چکا ہوں [illegible] کے نتیجے میں گالیاں سن چکا ہوں۔ غنیمت ہوئی کہ انہوں نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ ہم میں سے اگر کوئی بہاریوں کی حمایت میں کچھ کہتا ہے تو وہ غدار کہلاتا ہے۔ [illegible] ان بہاریوں کی حمایت میں شامل ہو جاتا ہے [illegible] حکومت پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔"

ایک عورت نے غصے سے کہا: "آپ انسپکٹر کی وردی [illegible] صرف [illegible] بنایا جاتا ہے۔ اس معصوم بچے کی کلائیاں رسیوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرح لٹکا رہے گا [illegible] کی [illegible] ڈوب جائے گا۔"

انسپکٹر نے کہا: "آپ مجھے الزام نہ دیں [illegible] وہ بچے [illegible] قصور مکتی باہنی والوں کا نہیں، بچے کے والدین کا ہے۔ وہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کیوں ہم مسافروں کو پریشان کر رہے ہیں؟"

اس بنگالی خاتون نے کہا: "تو پھر آپ مکتی باہنی کے [illegible] کو یہ سمجھائیں کہ بچے کو رسی سے آزاد کر دیں۔ [illegible] کے [illegible] اور بڑی ہوتے [illegible] صورت پہچان [illegible] ایک [illegible] عورت اور مرد کی صورت دکھاتے [illegible] بچہ [illegible] اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

مشورہ معقول تھا۔ انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر [illegible] اس کا ایک سپاہی [illegible] [illegible] پہلے نچلے حصے [illegible] تھے۔ جو لوگ بغیر ٹکٹ سفر کرتے تھے ان سے وہ دو روپے، چار روپے وصول کر رہے تھے۔ یہی ان کی اوپری آمدنی تھی۔ انسپکٹر فرسٹ کلاس کے [illegible] بیٹھے [illegible] اوپری آمدنی کا حساب کر [illegible] مسافروں کے اصرار پر وہ کیبن سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کو بلایا پھر ان کے ساتھ مکتی باہنی کے جوانوں کے پاس آکر کہا: "یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ بچہ آخر بچہ ہے۔ اس کی رسیاں کھول دو۔"

ایک جوان نے کہا: "انسپکٹر! ہم تمہارے معاملات میں دخل نہیں دے رہے ہیں۔ ورنہ ہم اچھی طرح جانتے [illegible]

سپاہی یہاں تمہیں گرم کرتے پھر رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے جھینپ کر کہا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ رشوت خوری یا تھوڑی سی ہیرا پھیری اور بات ہے لیکن عوام کے سامنے دہشت پھیلانا بہت بڑا جرم بھی ہے اور غیر انسانی سلوک بھی ہے۔"

"انسپکٹر! ان کے لیے یہ غیر انسانی سلوک نہیں ہے، جنہوں نے اس بچے کو پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک ہمارے سامنے آچکے ہوتے۔"

"اس قدر تشدد کا مظاہرہ کرنے سے وہ سامنے نہیں آئیں گے۔ شاید بچے کی موت پر بھی خود کو بے نقاب نہ کریں۔ اس کی ایک دوسری صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس بچے کی رسیاں کھول دو پھر اسے ہمارے ساتھ لے کر ٹرین کے پچھلے حصے سے اوپری حصے تک گھومتے پھرو۔ بچہ ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھے گا اور اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

ایک جوان نے غصے سے کہا: "ہم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ ہم کیوں اس بچے کو لے کر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گھومتے رہیں۔ جیسے مرضی ہوگی وہ ادھر آئے گا۔"

"آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔"

"یہاں آنے کا تو ابھی ہم اور انتظار کریں گے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس بچے کے ایک ہاتھ کی رسی کاٹ دی جائے گی۔ [illegible] ایک ہاتھ سے لٹکا رہے گا پھر آدھے گھنٹے کے بعد دوسرے ہاتھ کی رسی بھی کاٹ دی جائے گی۔"

[illegible] نہیں، ہم ایسی حماقت نہیں [illegible] ٹوٹ جائے گی پھر وہ [illegible] ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے [illegible] ہمارے [illegible] کے لیے رہ جائیں گی۔"

[illegible]

فرسٹ کلاس کے ایک مسافر نے پوچھا: "کیا ہوا ہے؟"

[illegible]

[illegible]

آنکھ سے سو کر، ایک آنکھ سے جاگ کر ہمیں آزادی دلائی ہے۔ ہم ان کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے اور ہمیں بولنا نہیں چاہیے۔"

"ہاں نہیں بولنا چاہیے، لیکن آزادی دلانے والے ناقابلِ برداشت ظلم و ستم کے ذریعے آزادی کو بدنام کرنے لگیں تو چپ نہیں رہنا چاہیے۔"

سب نے اس بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قدآور شخص تھا۔ اس نے پتلون اور نصف آستین کی بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی داڑھی مونچھیں اور سر کے بال اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ چہرے کا بہت کم حصہ نظر آتا تھا۔ اس کا لباس اور جوتے کیچڑ آلود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں سے اور دلدلوں سے گزرتا آیا ہو۔ اب اس کے جسم اور لباس پر کیچڑ سوکھ گئی تھی۔ اس کی بغل میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی اور وہ چیز کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے اس نے چھوٹا سا بستر باندھ کر بغل میں داب رکھا ہو۔ انسپکٹر نے پوچھا: "تو کیا تم کون ہو؟"

اس قدآور نے جواب دیا: "میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات بہت سے نام سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر آتے ہیں تو مجھے بتایا جائے کہ اوشما کا مطلب کیا ہے؟"

سب لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا: "اوشما ایک حسین عورت کا نام ہے۔ وہ عورت اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت سے پیار بھری [illegible] اپنا نام بتا رہی ہیں: اوشما۔"

ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ کسی کا دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اوشما کوئی نام ہوتا ہے۔"

اس نے کہا: "ہاں، اگر کسی کی زبان کٹی ہو اور وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے [illegible] ادا کرے تو یہی ادا ہوتا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ جس نام کے آخر میں ما آتا ہے وہی اس کا نام ہو سکتا تھا۔ نجمہ، سلمیٰ۔ اگر وہ پنجابی عورت ہے تو رشماں۔ ہندو عورت ہے تو رما، سوما۔ جانے کتنے نام ذہن [illegible] لگے کیونکہ یہ محبت [illegible] سے ادا ہوا، یہ کٹا ہوا نام [illegible]"

"ایک عورت [illegible] جان جانے والی ہے اور تم اپنی محبت کا قصیدہ پڑھ رہے ہو۔"

"بچے کو عورت پیدا کرتی ہے اور عورت کی [illegible] سے اس بچے کو دیکھو، ہاتھ جو رسیوں سے بندھا ہوا ہے

سی وقت بھی رسیاں کاٹی جا سکتی ہیں اور اسے پانی میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ میں پہچانتا ہوں اس بچے کو دیکھتے ہی۔ ابھی ابھی اوڑما دلہن بن کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں اپنے ایمان سے اور روح کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں۔ محبت بنگلیوں اور بھاریوں کی جاگیر نہیں ہے۔ محبت کسی سے بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے دیکھا، اوڑما ایک بچے کی ماں بن گئی ہے۔ وہ بچہ سات یا آٹھ برس کا ہو گیا ہے اور اسے دشمنوں نے رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا ہے۔ میرے سر کے اندر اوڑما چیخ رہی ہے۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ میں موجود نہیں ہوں تو کیا تم میرے بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ دو گے؟ ماں جنم دیتی ہے، باپ بچے پہ سایہ کیے رہتا ہے۔ ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے، باپ خون اور پسینہ ایک کرتا ہے۔ میں اپنا بچہ تم سے لوں گی، میں اپنا بچہ تم سے لوں گی۔ یہ آواز میرے سر کے اندر گونج رہی ہے۔"

سب چپ چاپ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسا کہنے کے دوران اپنی بغل میں دبے ہوئے بستر کو کھول رہا تھا۔ لپٹے ہوئے کپڑوں کو نکال کر نیچے قدموں کے پاس گراتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے اندر سے جو چیز برآمد ہوئی اسے دیکھتے ہی سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"ہمارا نام کلیمو دین بھوتیاں (میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے)، یہ اسٹین گن میں نے اپنی اور اوڑما کی حفاظت کے لیے حاصل کی تھی۔ اب اسے اس بچے کی حفاظت کے لیے استعمال کروں گا۔"

انسپکٹر نے ہمدردانہ انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔ تم جذباتی بن رہے ہو۔ وہ تمہاری اوڑما کا بچہ نہیں ہے۔"

وہ غصے سے گرج کر بولا: "میری اوڑما نے اس بچے کو [illegible] دیا ہے۔ اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اسے اپنا دودھ [illegible] کام [illegible]

[illegible]

طرف برابر کی ٹکر ہوگی۔"

"مگر وہ تعداد میں چار ہیں۔ ان کے پاس چار گنیں ہیں۔ تم ایک ہو۔ تمہارے پاس ایک۔۔۔"

اس نے بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا: "انسپکٹر! یو آر آن ڈیوٹی۔ ڈیوٹی دینے والا سپاہی دشمنوں کی تعداد نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے حوصلوں کو آزماتا ہے اور اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ تم بھی یہی کرو گے ورنہ۔۔۔"

انسپکٹر نے اسٹین گن کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ورنہ؟"

"تم بھی ان سب لوگوں کے سامنے قانون کی وردی اتار کر دریا میں بہا دو گے۔ جب یہاں قانون نہیں ہوگا تو پھر لاقانونیت ہوگی۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھاتے ہوئے کہا: "پھر دو میں سے ایک بات ہوگی۔ وہ بچہ زندہ سلامت میری گود میں آئے گا یا پھر اس لانچ کا ایک مسافر بھی دوسرا کنارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس بچے کے ساتھ یہ لانچ بھی دریا میں غرق ہو جائے گی۔ میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے۔ میں جو کہتا ہوں، وہ کر دکھاتا ہوں۔"

* * *

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔

آسیب زدہ عمارت کا تصور کسی ویرانے میں کیا جاتا ہے یا ایسی جگہ جو آبادی کے آخری سرے پر ہو۔ جدھر دن کے وقت بھی جانے والوں کے گھٹنے کانپنے لگتے ہوں لیکن وہ عمارت ویرانے میں نہیں تھی۔ اس کے دروازے پر مٹی کے دو شیر بنے ہوئے تھے اس لیے وہ عمارت شیر بلڈنگ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس کے آس پاس تنگ گلیاں تھیں۔ وہاں ایک دوسرے کے قریب مکانات بنے ہوئے تھے۔ لوگ دن رات اُدھر سے گزرتے رہتے تھے اس کے باوجود وہاں دن ہو یا رات، کبھی کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی تھی اور وہ اس عمارت سے نکل کر بھاگ آتی تھی۔ کبھی کوئی [illegible] یا کوئی پیچھے چلتے چلتے بے ہوش ہو جاتا تھا۔

[illegible]

یا کوئی جن ہے یا کیا ہے؟

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہوئے [illegible] باہر تاریکی تھی۔ [illegible] اپنے دانتوں کی مالش کر رہے تھے۔ [illegible] میں بھی ایک عمل ہوں گزرنے [illegible] تھی وہاں بظاہر وحشت زدہ کر [illegible] اس عمارت [illegible] بیٹھی کھاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ خسرو کے دل میں ایک ذرا سا [illegible] وہ [illegible] سے [illegible] لیکن چند قدم آگے جاتے ہی ایک دم سے اچھل پڑا۔ [illegible] عورت کے [illegible] سے گونجتی ہوئی باہر [illegible] تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس ماحول میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے مکانات اسی طرح خاموش تھے۔ [illegible] جھانک کر شیر بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دو چار مرد اپنے [illegible] ہوئے تھے [illegible] کچھ [illegible] سے پوچھا "معاف کیجئے صاحب! کیا بات ہے۔ یہاں کون چیخ رہا ہے؟" [illegible] نے بیزاری سے کہا: یہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی [illegible]

[illegible]

اس نے بیزاری سے پوچھا: یہاں [illegible]

جواب کیوں [illegible]

[illegible]

اس نے ناگواری سے کہا: یہ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی وہیں مرنے کے لیے سید پور پہنچ جائیں۔ ان کے آنے سے مہنگائی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ ہم یہاں دانے دانے کے لیے ترستے ہیں۔ راشن اتنا مہنگا ہے کہ روز اپنے گھر کی کوئی چیز بیچنے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرتا۔"

"آپ کے خیال میں ہمارے پناہ گزین بے موت مرنے کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ تاکہ آپ کے زندہ رہنے کے لیے راشن سستا ہو جائے!"

اس نے گھور کر خسرو کو دیکھا۔ اسی وقت پھر چیخ سنائی دی۔ خسرو تیزی سے چلتا ہوا شیر بلڈنگ کے دروازے پر آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک بہت ہی وسیع و عریض ہال تھا۔ اس میں جگہ جگہ پھٹی پرانی چادریں تان کر دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان چادروں کی دیواروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے کمرے سے بن گئے تھے۔ ہر چادر کی چار دیواری میں [illegible] کا ایک ایک خاندان آباد تھا۔ وہ عمارت بالکل بوسیدہ تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ سے پلاستر اکھڑے ہوئے تھے۔ چھت سے پانی رستا رہتا تھا اس لیے چھت اور دیواروں پر کہیں کہیں کائی سی جم گئی تھی۔ ہال کے [illegible] میں کچھ لوگوں نے ایک پندرہ برس کے لڑکے کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت ہی دہشت زدہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی کچھ لوگ اسے پنکھا جھل رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔ ایک صاحب پانی دم کر کے اسے پلا رہے تھے۔ خسرو تھوڑی دیر تک [illegible] دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا: "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

ایک نے جواب دیا: "کچھ نہیں۔ یہ بیچارہ دہشت زدہ ہے۔ یہاں اس نے کچھ دیکھا ہے۔"

[illegible]

کسی کے سامنے اس کی بیوی، بہن اور بیٹی کی عزت کو کھلونا بنایا گیا۔ ایسے ایسے ظلم ڈھائے گئے، جن کی یاد آنے سے بے اختیار چیخیں نکل جاتی ہیں۔ یہ عمارت آسیب زدہ نہیں ہے۔ ہم آفت زدہ ہیں۔"

ایک شخص نے جواباً کہا: "ویسے تو ہم سب آفت زدہ ہیں لیکن ہم جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں کچھ لوگوں کی طرح بے اختیار نہیں چیختے۔"

ایک بوڑھے نے کہا: "بیٹے! کچھ لوگ جنونی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ آسیب زدہ ہوتے ہیں۔ آپ دیکھو کہ اب تک کتنے ہی مرد، عورتیں اور بچے جنون میں مبتلا ہو کر یہاں سے چلے گئے۔ سیدپور میں جگہ جگہ پناہ لیتے رہے۔ ہزاروں خاندان ریلوے لائن کے دونوں کناروں پر جھگیاں ڈالے آباد ہیں۔ ہزاروں لوگ مختلف کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ایسے لاکھوں افراد ہیں جو ظلم اور بربریت کا ناٹک اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں لیکن کسی جگہ رہ کر وہ جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کبھی بے اختیار چیخیں نہیں مارتے۔ صرف یہ عمارت ایسی ہے جہاں آ کر جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

وہ بوڑھا درست کہہ رہا تھا۔ خسرو وہاں ایک ہفتے سے یہی سنتا آ رہا تھا کہ یہ بلڈنگ آسیب زدہ ہے لیکن اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ باہر سے آنے والے پناہ گزین کسی پناہ گاہ میں [illegible] جاتے اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا: "بڑے میاں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں اب تک جتنے لوگ آسیب میں مبتلا ہوئے، وہ باہر دور جا کر ٹھیک ہو گئے۔ یا پھر جنون طاری نہیں ہوتا ہے۔ یہاں ضرور کچھ ہے جو ہمیں تو نظر نہیں آتا لیکن چند لوگوں کو نظر آتا ہے اور وہ یہاں سے گھبرا کر چلے جاتے ہیں۔"

خسرو نے کہا: "انہیں روکنا چاہیے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کیا دیکھتے ہیں؟ کیوں چیختے ہیں؟"

ایک اور بوڑھے نے کہا: "ہم کسی کو یہاں روک کر اس کی جان کے دشمن نہیں بن سکتے۔ یہاں کوئی نادیدہ بلا ہے۔ پہلے ایک عورت اس کی شکار ہوئی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ہم اسے روکتے رہے، اس سے پوچھتے رہے پھر وہ مر گئی۔ اس کے بعد ایک بوڑھی عورت جان سے گئی۔ اس کے بعد ایک بچہ اور پھر ایک جوان مرا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ یہاں آنے کے بعد جو بھی دہشت زدہ ہوتا ہے اسے روکنا نہیں چاہیے بلکہ جلد سے جلد یہاں سے بھگا دینا چاہیے۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا اس نادیدہ بلا سے آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا ہے؟"

"ہم ڈر کر کیا کریں گے۔ یہ جگہ چھوڑ کر جائیں گے تو کہیں مفت رہنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ کرایہ ادا کرنا پڑے گا یا ریلوے لائن کے کنارے جھگی ڈال کر رہیں گے۔ وہاں بھی پولیس والے اور کبھی غنڈے آ کر تنگ کیا کرتے ہیں۔ کچھ پیسے وصول کرتے ہیں، مار پیٹ کرتے ہیں، ہماری بہو بیٹیوں پر بری نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں عزت بھی محفوظ ہے اور کرایہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی بلا آئے گی تو زیادہ سے زیادہ جان لے گی لیکن عزت نہیں لے گی نہ غنڈہ ٹیکس وصول کرے گی۔"

خسرو نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا: "انسان انسانوں سے اس قدر سہما ہوا ہے کہ اب نادیدہ بلاؤں کی دہشت کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ چادروں کی ایک چار دیواری میں ایک جوان شخص نظر آیا۔ وہ ٹاٹ کی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ سانس کس طرح لیتا ہوگا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا: "تمہیں کیا ہوا تھا؟ یہ پٹیاں اس طرح کیوں بندھی ہوئی ہیں؟"

اس نے خسرو کو ایسے دیکھا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکل سکی۔ دو چار آدمی اس کے آس پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا: "بھائی صاحب! یہ بولے گا کیسے؟ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے ساگو یا بھات کا پانی اس کے حلق تک پہنچاتے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ اسے نگلتا ہے۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا دشمنوں نے اس کی گردن پر وار کیا تھا؟"

"ہاں! یہ سنتاہار کا رہنے والا ہے۔ آپ شاید جانتے ہوں گے، سنتاہار میں ایک بھی بہاری زندہ نہ رہ سکا۔ سبھی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان قتل ہونے والوں میں یہ شخص بھی تھا۔ اس کا نام شہباز ہے۔ سنتاہار ریلوے لائن کے پاس سیکڑوں بہاریوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ کسی کو گولی ماری گئی، کسی کی گردن پر چھری پھیری گئی۔ اس کی گردن بھی خنجر سے تک کاٹی گئی تھی۔ یہ ان لاشوں کے درمیان پڑا رہا۔ مارنے والوں نے سمجھا کہ یہ مر چکا ہے۔ یہ تمام دن وہاں پڑا بارش میں بھیگتا رہا۔"

شہباز کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن کہنے والوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہنے والے کے بازو کو تھام لیا۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ شہباز نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھائیں۔ تب ایک شخص نے کہا: "یہ کہہ رہا ہے، وہاں بارش میں ریلوے لائن پر

ایک دن نہیں بلکہ دو دنوں تک پڑا رہا!"

خسرو نے پوچھا "جب یہ بول نہیں سکتا ہے تو آپ لوگوں کو اس کی روداد کیسے معلوم ہوئی؟"

"یہ بول نہیں سکتا ہے، لکھ تو سکتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنی داستان تفصیل سے لکھی تھی۔"

"کیا سنتا ہار میں اسے طبی امداد نہیں ملی؟"

"کیا بات پوچھ رہے ہو بھائی! جہاں ہمارا وجود برداشت نہیں کیا جاتا" وہاں ہمارے زخموں پر مرہم کون لگاتا ہے؟ اگر حرفی دیکھ لیتا کہ یہ قتل کیے جانے کے باوجود زندہ ہے تو وہ اسے یہاں تک پہنچنے کا موقع ہی نہ دیتا۔"

"لیکن یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ گلا [illegible] تک کاٹ دیا گیا اور یہ زندہ یہاں تک پہنچ گیا۔ کیسے پہنچا؟"

"یہ ٹرین کے ذریعے نہیں آسکتا تھا۔ کوئی ہمارا اپنی [illegible] گاہ سے نکل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کرسکتا۔ [illegible] سنتا ہار سے پیدل آیا ہے۔"

خسرو نے شدید حیرانی سے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ "یہ سنتا ہار سے [illegible] ناقابلِ یقین بات ہے۔ سنتا ہار یہاں سے [illegible] میل [illegible] ہے۔ یہ وہاں سے پیدل کیسے آسکتا ہے؟"

"[illegible] ہے۔ یہ اپنی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] تک چلتا رہا۔ [illegible] گاؤں میں جا کر پناہ [illegible] مانگتا رہا۔ گاؤں والے جو خود دو وقت کے فاقے کرتے ہیں وہ کسی کے جانی دشمن نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ اسے [illegible]

[illegible]

[illegible] ناقابلِ یقین واقعات [illegible] حالات میں

کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیناج پور میں ایک ستر برس کی بڑھیا کو دیکھا۔ وہ بکریوں کے ایک باڑے میں نیم مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ دشمنوں نے شاید لوہے کی کسی راڈ سے یا کسی ہتھیار سے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پھٹ گیا تھا۔ وہ چکرا کر گری تھی۔ دشمنوں نے اسے مردہ سمجھا۔ اگر وہ نیم مردہ بھی سمجھی جاتی" تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس خیال سے کہ ستر برس کی بڑھیا سسک سسک کر، تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔"

اس بوڑھے نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا ہے۔ شاید تین دن یا چار دن کے بعد میں اس باڑے میں پہنچا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کبھی آہستگی سے کھلی تھیں کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا" اس کے سر کا پچھلا حصہ خون آلود تھا۔ جدھر سے پھٹ گیا تھا" ادھر اس کا مغز نظر آرہا تھا اور اس مغز میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو یک دم سے آنکھیں بند کرلیں۔ دیکھا نہ گیا۔ کیڑے لاش کو کھاتے ہیں لیکن وہ قبر میں نہیں تھی۔ زمین کے اوپر تھی۔ وہ مردہ نہیں تھی۔ نیم مردہ تھی" ابھی زندہ تھی اور کیڑے زندہ لاش کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے دل کا کرب جھلکنے لگا۔ وہ منہ سے بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا پھر وہاں سے گھر لے آیا۔ اسے ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ ان کیڑوں کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لیکن ایک انسان تو [illegible] تک کیوں [illegible] ہو۔ اگر اس میں زندگی کے ذرے بھی باقی ہوں تو اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔

میں نے ایک قینچی لے کر [illegible] کے تمام بال کاٹ دیے۔ اس کا پھٹا ہوا سر اور [illegible] واضح طور پر نظر [illegible] لگے کیڑے اور [illegible] کلبلاتے ہوئے دکھائی دیتے میں [illegible] ایک ایک کیڑے کو اپنی چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر وہاں سے نکال کر ایک طرف پھینکنے لگا۔ جیسے سر سے جوئیں ٹٹول ٹٹول کر [illegible] طرح میں انہیں چن چن کر نکال رہا تھا۔ [illegible] یہ خیال تھا کہ میرا ہاتھ اس کے سر سے [illegible] وہ بہت کمزور تھی میرے ہاتھ کی ہلکی سی چوٹ اسے ختم کرسکتی تھی۔ ایک

گھنٹے بعد میں بار بار [illegible] اس کے بیٹے [illegible] کے بعد اس میں [illegible] آئی اس نے نقاہت سے پوچھا "میرا پوتا کہاں ہے؟"

[illegible] نے پوچھا "تمہارا پوتا کون ہے [illegible]"

"وہ امن کمیٹی والے آئے تھے۔ میرے پوتے کو یہ کہہ کر [illegible] میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔"

[illegible] آپ پانچ ماہ پہلے کی بات [illegible] یہاں امن کمیٹی قائم ہوئی تھی [illegible]

[illegible] کے سامنے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے [illegible] ماہ پہلے کی بات ہے۔ تو کیا ہوا، پانچ ماہ سے میں انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس کے [illegible] بھی میرے لیے زندہ ہوگا۔ جب تک وہ نہیں آئے گا میں نہیں مروں گی۔"

[illegible] موت سے لڑ رہی تھی۔ [illegible] تھے اور جو لوگ اپنے [illegible] تھے۔ [illegible] دل کا [illegible] کرتے تھے۔

خسرو کو ان سب سے ہمدردی تھی لیکن اتنی فرصت [illegible]

پہلے ویگن کا اناج اس نے دوگنے منافع پر فروخت کیا [illegible] عوام کے [illegible] کیونکہ دوسرے [illegible] نا انصافی کر رہے تھے کبھی [illegible] روپے سیر کے حساب سے چاول بیچ رہے تھے اور کبھی وہی چاول [illegible] روپے [illegible] روپے فی سیر کے حساب سے فروخت کرتے تھے [illegible] خسرو نے [illegible] روپے سیر کے حساب سے چاول فروخت کیا [illegible] بنا چکے تھے۔

وہ سوچتا ہوا ایک گلی سے دوسری گلی میں [illegible] رہا تھا۔ اچانک [illegible] سے سامنا ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا "خسرو [illegible]"

"ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی جبکہ میں نے کہا تھا [illegible] مال میں آ گئے ہو۔"

[illegible] آ کر کہا "بات مال کی نہیں ہے۔ بات [illegible] ہے۔ وہ کیا ہے [illegible]"

[illegible] تم لوگ [illegible]

"وہ ہماری بہشتی لاپتا ہے۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا "بہشتی لاپتا ہے۔ کب سے ہے؟"

[illegible] اس کے بعد واپس نہیں آئی۔"

[illegible] بھی اسے دیکھ کر بدمعاشی پر آمادہ ہو سکتا [illegible] میں پوچھا گیا ہے؟

[illegible]

[illegible] چلتے [illegible] کوئی [illegible] نہیں کر سکتا۔"

"خسرو بھائی! یہ سب ٹھیک ہے [illegible] میں یقین سے کہتا ہوں [illegible]

[illegible] اسے ذہن سے غائب کر دیا ہے۔"

[illegible] خسرو نے پوچھا۔ "تمہیں کس غنڈے پر شبہ ہے؟"

"[illegible] پر شبہ ہوگا۔ یہاں کوئی بنگالی غنڈہ تو ہے نہیں [illegible] والے آتے ہیں لیکن وہ کسی ہندو عورت [illegible] ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ یہ بہاریوں کا کام ہے۔"

خسرو تیزی سے چلتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ ہریا نے پوچھا: "کیا آپ کرو دیدی کے پاس جا رہے ہیں؟"

"ہاں! میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

"دیدی پہلے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ آپ ان [illegible] تو پہلے شانتی کو تلاش کریں۔"

"[illegible] میں [illegible] کہاں تلاش کیا جائے۔ کیا تھانے میں رپورٹ لکھائی گئی ہے؟"

"میں نے سب [illegible] سب کچھ بتا دیا ہے لیکن تاکید کی ہے [illegible] رپورٹ درج نہ کرے۔ ہماری بدنامی ہوگی۔ جب [illegible] شانتی کو [illegible] انسپکٹر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ سپاہی اپنے طور پر اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

[illegible] تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

[illegible] غنڈے بدمعاش کا کام ہے تو شانتی [illegible] حاجی پاڑہ میں مل سکتی ہے۔"

[illegible] ہو سکتی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] آ جائے گی۔"

وہ دس منٹ میں حاجی پاڑہ پہنچ گئے۔ [illegible] تلاش [illegible] کوئی [illegible] آ جاتا [illegible] نہیں رہی تھی۔ جب [illegible] اسی طرف [illegible] تقریباً پانچ لاکھ تھی جس میں ڈیڑھ لاکھ عورتیں ضرور ہوں گی۔ کچھ بوڑھی ہوں گی کچھ جوان ہوں گی اور کچھ نوجوان ہوں گی۔ وہ سب شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی ان پر شک نہیں کر سکتا تھا لیکن حالات بڑے بے رحم تھے۔ جہاں کہیں مال کی قیمت انسان کی قوت خرید سے بہت اوپر ہو جاتی ہے وہاں پیٹ کے سامنے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ اناج خریدنے کے لیے گھر کا فرنیچر یا پورا گھر صرف ایک بار بیچا جا سکتا ہے اور پیٹ کا جہنم روز بھر جاتا ہے۔ تب ہی گناہ کا بازار [illegible] ہے۔ عورت ہاتھ کے میل کی [illegible] سے نکلتی ہے [illegible] ہو جاتی ہے [illegible] کے باپ کے [illegible] تاب نہیں رہا تھا۔ کئی جگہ [illegible] کئے تھے۔ [illegible]

[illegible] نے کہا [illegible] دوسری گلی میں جا رہا ہوں۔ آپ اس گلی میں دیکھیں [illegible] آؤں گا اور آپ سے اسی گلی میں ملوں گا۔"

خسرو نے کہا: "میں ایسے بدنام محلے میں کبھی نہیں آیا۔ اور تم مجھے یہاں [illegible]

[illegible]

"کیا ہے کہ میں شانتی کو [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک تاریک مکان کے دروازے پر بھاری بھرکم بولوں [illegible] سنائی دی۔ پھر دو سائے وہاں سے [illegible] تھے۔ ان کا حلیہ [illegible] اس مکان میں جانے [illegible] ضرورت ہے [illegible] تو ہم تمہاری ضرورت کی چیز مہیا کر دیں گے۔"

ایک نے بندوق کی نال سے خسرو کے سینے پر ٹھوکا دیا اور اشارے سے اس تاریک مکان میں چلنے کے لیے کہا۔ خسرو نے التجا کی: "دیکھیے ہم اپنے گھر کی ایک عورت کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔ اگر آپ کو ہم سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو تو ہمیں بتا دو اور اگر آپ میری اس گمشدہ بہن کو ڈھونڈ نکالیں تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

بندوق کی نال سے ٹھوکا دینے والے نے کہا: "بس چلو وہیں ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔"

خسرو نادان نہیں تھا۔ ایسی چالبازیوں کو سمجھتا تھا۔ اس کے دل نے کہا: "یقیناً ان لوگوں نے ششی کو چھپا رکھا ہے اور اس کے لیے سودا کرنا چاہتے ہیں۔" بہر حال مجبوری تھی۔ ان کی بات مان کر ہی ششی کو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں قانونی کارروائیوں کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔

وہ ہریا کے ساتھ اس مکان میں داخل ہوا۔ مسلح جوانوں میں سے ایک ان کے پیچھے تھا۔ اس وقت تک اس تاریک مکان میں لالٹین جلا دی گئی تھی۔ ان دونوں کو ایک بڑے سے کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز تھی اور میز کے پاس دو کرسیاں تھیں۔ میز کے اوپر شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک نے خسرو سے کہا: "کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" دوسرے نے ہریا سے کہا: "اے! تم بھی وہاں بیٹھو۔"

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے پھر ان سے کہا گیا۔ "بوتل کھولو اور پینا شروع کر دو۔"

خسرو نے کہا: "میں نے اس لعنت کو آج تک ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ مجھ سے کام کی باتیں کرو اور مجھے جانے دو۔"

"کام کی باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں، جب تک بدمست ہو کر مدہوش نہ ہو۔ ہم تو پیے ہوئے ہیں تمہیں بھی پلانا چاہتے ہیں۔"

ہریا نے کہا: "کیا ہے کہ میں پیتا ضرور ہوں مگر یہ کوئی منوانے کا طریقہ نہیں ہے۔ ہم پریشان ہیں۔ اپنے گھر کی عورت کو ڈھونڈ رہے ہیں اور تم یہ مذاق کر رہے ہو۔"

خسرو چور نظروں سے ان کی بندوقوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اسے ہریا سے توقع نہیں تھی کہ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر وہ ساتھ دیتا تو ان دونوں پر قابو پانا کچھ ایسا مشکل نہ ہوتا۔ پھر وہ ششی کو اس مکان میں تلاش کر سکتے تھے۔

ایک نے کہا: "اگر تم دونوں باتوں میں وقت ضائع کرنا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ ہم تمام رات تمہاری باتیں سنتے رہیں گے لیکن ضرورت مند تم لوگ ہو۔ تم کسی کو یہاں سے لے جانا چاہتے ہو۔ اس کی پہلی شرط یہی ہے کہ پینا شروع کر دو۔ بھاگنے کے متعلق نہ سوچنا اور سوچا ہے تو پہلے کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھ لینا۔"

خسرو اور ہریا نے دیکھا، دروازے اور کھڑکی کے پاس دو دو رائفل بردار نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ شاید خسرو یا ہریا کے جاننے والوں میں سے ہوں گے۔ اسی لیے اپنے اپنے چہرے کو چھپا رہے تھے۔

ہریا نے بوتل کھول کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا: "میں تم لوگوں کی بات مان کر پینا شروع کر رہا ہوں۔ اتنا بتا دو کیا ششی تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں ہمارے پاس ہے۔"

"میں خسرو کو بھی پینے پر آمادہ کر لوں گا لیکن پہلے اس کی آواز سنائی جائے یا اس سے ہم کو ملایا جائے۔"

خسرو نے تائید کی: "ہاں پہلے ہم ششی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ان میں سے ایک نے ہریا کے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا: "تم ہمارے ساتھ چلو اور ششی کو دیکھ کر آؤ۔ ہم دونوں کو نہیں جانے دیں گے۔"

خسرو نے کہا: "ٹھیک ہے ہریا! تم اطمینان کر کے آ جاؤ۔"

ایک مسلح جوان ہریا کو دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔ خسرو نے دوسرے مسلح جوان سے کہا: "میں نے جو گناہ کبھی نہیں کیا، وہ مجھ سے کیوں کرواتے ہو۔ پینا کیا ضروری ہے؟ ششی یہاں موجود ہے تو اپنا مطالبہ پیش کرو۔ ہم پورا کریں گے اور اسے لے جائیں گے۔"

"ہمارا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ بوتل کھولو اور پینا شروع کرو۔ نہیں پیو گے تو ہم زبردستی پلائیں گے۔ مار مار کر پلائیں گے۔"

خسرو نے شراب کی بوتل کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا: "تم لوگ کسی ہندو عورت کو بھی نہیں چھیڑتے پھر ایسی حرکت کیوں کر رہے ہو؟"

"ہمیں کسی ہندو عورت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تمہیں پلانا چاہتے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ یہ بوتل ختم کر دو اور ششی کو ساتھ لے جاؤ۔"

ہریا اس مسلح جوان کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس نے کہا: "میں نے ششی کو دیکھا ہے۔ وہ ادھر سامنے والے مکان کے کمرے میں چارپائی سے بندھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے منہ کو دبا دیا اور یہاں گھسیٹ

کرلے آئے۔"

خسرو نے کہا: "ہم کشتی کو ہر قیمت پر لے جائیں گے لیکن یہ رُک کوئی قیمت نہیں لگاتے ہیں۔ ورنہ میں کبھی پیدا نہیں ہوں۔ خدا کے لیے سمجھوتے کی کوئی راہ نکالو۔"

بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرش پر گرتے ہی وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا، اسی وقت ایک نے رائفل کے کندے سے اس کی پیٹھ پر ضرب لگائی۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ دوسرے نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ سے اس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔ وہ کروٹ لیتا ہوا چاروں شانے چت ہوگیا۔ پھر اس نے اس کے سینے پر اپنے وزنی بوٹ سے دباؤ ڈالا۔ رائفل کی نال کو اس کے حلق پر رکھا۔ دوسرے نے بوتل کھول لی اور کہا: "اپنا منہ کھولو۔"

خسرو نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا تھا۔ رائفل والے نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھی۔ اس کے حلق پر رائفل کی نال کا دباؤ ڈالا اور کہا: "میں فائر کردوں گا۔"

حلقوم پر اس طرح دباؤ پڑ رہا تھا کہ خسرو کا منہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بوتل کے منہ کو اس کے منہ کے اندر ٹھونس دیا۔ شراب اس کے حلق تک پہنچی [illegible] لگی۔ سانس رکنے کی وجہ سے حلق کے اندر بھی تپش سی پیدا ہوئی۔ ایسی جلن ہوئی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ وہ دیسی شراب تھی، پانی ملائے بغیر پلائی جا رہی تھی اور وہ بھی ایک ہی سانس میں۔ [illegible] اس کا تو حال برا ہو رہا تھا۔ [illegible] ادھر ادھر [illegible] کر بوتل کو منہ سے ہٹا[illegible] شراب حلق سے اتر چکی تھی۔ بوتل والے [illegible] کے سر کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر فرش پر بٹھا دیا۔ [illegible] والے نے کہا: "ہم تو عزت کے ساتھ کرسی پر بیٹھا کر [illegible] تھے مگر یہ عزت کے قابل نہیں ہے۔ [illegible] پڑا رہنے دو۔"

خسرو فوراً ہی [illegible] اس کا سر چکرا [illegible] تو کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بوتل پھر اس کے منہ سے لگائی گئی۔ وہ [illegible] پینے لگا۔ رائفل والے نے اس کے گھٹنے پر رائفل کے کندے سے ضرب لگائی۔ وہ چیخ پڑا۔ تکلیف سے کراہنے لگا۔ چیخنے کے دوران منہ کھلتا ہے۔ بوتل والے نے کھلے ہوئے منہ میں پھر تھوڑی سی شراب انڈیل دی تھی۔ اس نے بوتل کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا: "مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر مجھے شراب پلا کر تمھیں کیا فائدہ پہنچے گا۔"

ایسا کہنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ الفاظ صاف طور سے ادا نہیں ہو رہے ہیں لیکن دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا آخر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیا اس لیے کہ آج امانت کا ڈیلن یہاں پہنچ رہا ہے اور وہ ڈیلن کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے آدمی نہیں ہوں گے۔ پھر یا بھی یہیں رہے گا تو ڈیلن کو لوٹ لیا جائے گا۔

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ بوتل پھر اس کے منہ سے آکر لگ گئی تھی۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ لیا گیا تھا۔ جتنی وہ پی چکا تھا، اتنی ہی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ سر گھوم رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود اتنا حوصلہ تھا کہ وہ پینے سے اب بھی انکار کر رہا تھا اور وہ لوگ طرح طرح سے اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ زبردستی اس کے منہ میں زہر ڈال رہے تھے اور اسے نگلنے پر مجبور کر رہے تھے۔

اناڑی آدمی ایک گھونٹ پینے کے بعد ہی بہک جاتا ہے جبکہ اسے ایک پوا پلا دیا گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ ادھر سے ادھر جھوم رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک جانا چاہتا تھا۔ اسے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا۔ پھر کرسی پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بڑبڑانے لگا: "میں مار ڈالا گیا ہوں [illegible] کشتی کو یہاں سے [illegible] گا۔"

نشے کی زیادتی سے اس کی [illegible] تھی۔ اس کی بات اچھی طرح [illegible] منہ سے نکلتی تھی، آدھی بات منہ میں ہی رہ جاتی تھی۔ ایک رائفل بردار نے کہا: "اب یہ ہمارے کام کا ہوگیا ہے۔ اسے لے چلو۔"

دو آدمیوں نے اسے دو طرف سے سہارا دے کر اٹھایا۔ [illegible] لیکن اپنا [illegible] ان کے سہارے چل رہا تھا۔ وہ مکان سے [illegible] تاریکی تھی۔ دور مکانوں کی روشنیاں اتنی مدھم تھیں کہ وہ تاریکی کو دور نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسے سہارا دے کر [illegible]

سامنے والے مکان میں لے گئے۔ وہاں بھی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ [illegible] خسرو اندھیرے میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دو مردوں کا سہارا لے کر چل رہا ہے۔ کسی دروازے سے گزر کر مکان میں داخل ہو رہا ہے جو کسی نے کان کے قریب سرگوشی میں کہا۔ "اب تم اس دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاؤ۔ سامنے ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے کے پیچھے [illegible]"

اسے ایک دیوار کے سہارے چھوڑ دیا گیا۔ سب دور ہٹ گئے تاکہ [illegible] پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ دور سے تماشا دیکھ رہے ہیں یا چلے گئے ہیں۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ [illegible] ہو رہا ہو اور ٹٹول ٹٹول کر راستہ [illegible] پھر وہ ایک دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ [illegible] کسی نے اس کے منہ پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے [illegible] صاحب! آپ نے پہنچنے میں اتنی دیر لگا دی۔ بے چاری [illegible] آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جائیے دروازہ کھلا ہوا ہے!"

پھر ٹارچ کی روشنی کمرے کے اندر پھینکی گئی۔ وہاں ایک [illegible] کی طرف [illegible] دیکھ لیا تھا۔ [illegible] تلسی رام نے تم پر بھروسہ کیا [illegible] تم نے ثابت کر دیا کہ ہماری [illegible] بھائی کہتے ہوئے شرم [illegible]

[illegible]

خسرو دو آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ اس نے اب تک اس [illegible] کر اپنے [illegible] وہ [illegible] سے گھسیٹ کر دوسری سمت لے جا رہے تھے۔ اب [illegible] کی طرح بکھر رہا تھا۔ نشہ برداشت [illegible] چاہتا تھا کہ نیند آ جائے یا پھر وہ مر جائے۔

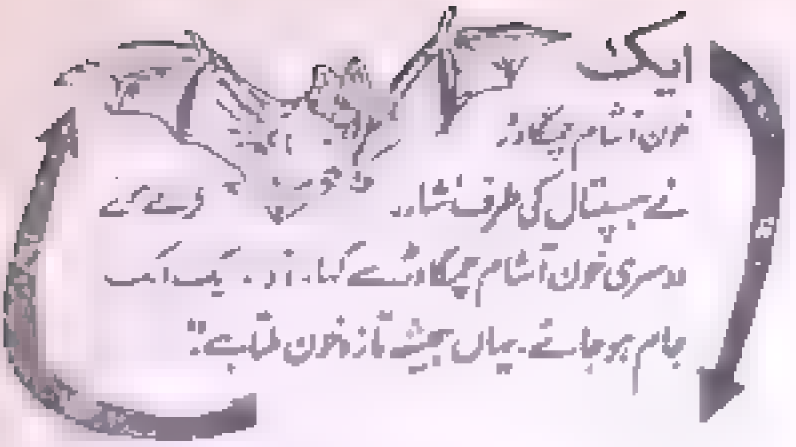

ایک خون آشام چمگادڑ نے ہسپتال کی طرف اشارہ [illegible] دوسری خون آشام چمگادڑ سے کہا۔ "آؤ، ایک ایک جام ہو جائے۔ یہاں ہمیشہ تازہ خون ملتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگے فرش پر چاروں شانے چت پڑا ہوا ہے۔ اس کے آس پاس کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا: "ایسی ہی چال کو کہتے ہیں، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب اس مسلمان بچے کا گزر تلسی رام کے ہاں نہیں ہوگا۔ بڑی بے عزتی سے نکالا جائے گا!"

"تم بے عزتی سے نکلنے کی بات کرتے ہو، ہمارے جوان زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارے دھرم کی کسی عورت پر ہاتھ ڈالے اور یہاں سے زندہ چلا جائے یہ ممکن نہیں ہے۔"

دھرم چند کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "یہ سالا ہریا بڑا پاپی ہے۔ جب دیکھو میرے سامنے [illegible] کا ذکر کرتے وقت ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا تھا۔ میں نے سمجھایا۔ پہلے [illegible] ایسا کرو کہ وہ بھی ہاتھ لگے اور دیگوں کا اناج بھی اپنا ہو۔ میرا نام بھی دھرم چند ہے۔ پہلے میں دھرم سے انگلی سیدھی کر کے [illegible] نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہیں نکلتا تو انگلی ٹیڑھی کرتا ہوں۔ اب دیکھ لو۔ ایک ذرا انگلی ٹیڑھی کی تو اُدھر [illegible] بن گیا۔ کل صبح خسرو اپنی دونوں عورتوں کے ساتھ [illegible] جائے گا اس کے بعد دیگوں کا مال [illegible] ہمارے ہاتھ بیچے گا۔"

وہ تمام باتیں خسرو کے کانوں میں [illegible] کے کانوں پر آنکھوں پر اور [illegible] وہ سن رہا تھا مگر سمجھنے کے قابل نہیں تھا [illegible] کی نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

⁂

لانچ اپنی مخصوص رفتار سے دوسرے کی سمت [illegible] چلی جا رہی تھی۔ دوسرا کنارا ابھی بہت دور تھا [illegible] تھا اور اس کنارے تک پہنچنے سے پہلے کلیم الدین [illegible] کی دھمکی پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہوا تھا۔

اس کے آس پاس دور دور تک فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے مسافر کھڑے ہوئے تھے۔ عرشے پر بیرونی گرمی تھی۔ ملاحوں [illegible] کے جوان لانچ کے نچلے تختے میں تھے۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ انسپکٹر نے کہا: "میں یہ قانون کی وردی اتار کر تمھارے بچے کے متعلق دریا میں بہا سکتا ہوں مگر یاد رکھو میں بزدل نہیں ہوں۔ تمھارے ساتھ مل کر ملکی باشی والوں سے مقابلہ اس لیے نہیں کرنا چاہا تاکہ فائرنگ کے دوران بے گناہ مسافر مارے جاتے۔ میں خود کو اس کا ذمے دار نہیں ٹھہرانا چاہتا۔"

قیم الدین صاحب نے غصے سے پوچھا: "آپ ایک پولیس آفیسر ہو کر یہ برداشت کر رہے ہیں کہ یہ معصوم بچہ دریا میں ڈبو دیا جائے گا؟"

"بعض حالات میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک کی جان جائے یا سب کی جان جائے؟ اگر سب کی جان بچانے کے لیے ایک کی قربانی دینی ہو تو مجبوراً خاموش تماشائی بن کر رہنا پڑتا ہے۔"

"[illegible] ہے تمھارے قانون کی کتاب میں کہیں [illegible] انسانیت کا تقاضا ہے اگر ایک بچہ [illegible] جا رہا ہو تو اسے بچانا ہمارا سب [illegible]"

[illegible]

[illegible] انسانیت کا تقاضا ہے؟"

[illegible]

کہا: ہاں ہم سب ایک ہو کر اس بچے کی جان بچا [illegible]

[illegible]

اس کے بعد سب ہی ہال میں تالیاں بجانے لگے۔ کچھ [illegible]

ان ملکی باشی کے مسلح جوانوں پر دباؤ ڈالیں۔

ایک نوجوان نچلے حصے سے دوڑتا ہوا عرشے پر آیا۔ اس نے کہا: "ان لوگوں نے بچے کی رسیاں کھول دی ہیں۔ اسے ساتھ لے کر ایک ایک مسافر کے سامنے جا رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا: "آخر انھوں نے میری بات مان ہی لی۔"

خوبیاں نے کہا: "قانون پر عمل کرانے کے لیے کچھ سیدھے کچھ ٹیڑھے راستے ہوتے ہیں۔ اگر آپ وہاں مسلسل موجود رہتے تو وہ بہت پہلے ہی آپ کی بات مان لیتے۔"

ایک عورت نے کہا: "چلو، اب اس بچے کو ڈبویا نہیں جائے گا۔ اتنا تو اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بچہ ہم مسافروں میں سے اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالے گا۔"

[illegible] والے نوجوان نے کہا: "وہ لوگ اوپر بھی آئیں گے اور بچے کے ماں باپ کو تلاش کریں گے۔"

قیم الدین جعفری نے [illegible] میں لپیٹتے ہوئے کہا: "میں آپ تمام لوگوں سے التجا کرتا ہوں کہ ان ملکی باشی کے لوگوں کو میرے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔ ورنہ وہ میرے متعلق طرح طرح کے سوالات کرتے رہیں گے۔ انھیں یہ بتانا نہیں چاہتا کہ [illegible] کہاں سے آیا ہے؟ اس پر [illegible] شروع ہو جائے گا۔"

[illegible]

وہ وہاں سے عرشے کے [illegible]

[illegible] ریلنگ سے ایک لائف بوٹ منسلک تھی تاکہ ڈوبنے والوں کو اس لائف بوٹ کے ذریعے بچایا جاسکے۔ اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible] نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ریلنگ کی طرف منہ کیے جیسے تمام مسافروں

سے منہ پھیرے ہوئے تھی۔ جگجوتیاں نے دیکھا وہ اپنے آنچل کے ایک سرے کو تھام کر چہرے تک لے گئی تھی۔ شاید منہ صاف کر رہی تھی۔ شاید آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔

کلیم الدین جگجوتیاں کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی۔ زینے پر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چار مسلح مکتی باہنی والوں کے ساتھ ساتھ کتنے ہی مسافر چلے آ رہے تھے۔ ایک مکتی باہنی کے جوان نے بچے کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچتا ہوا عرشے پر لا رہا تھا۔

حفاظتی کشتی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کھڑے ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے ۔۔۔ اس نے اپنا آنچل ادھر ادھر سے درست کیا اسے چہرے کو چھپانے کی فکر تھی۔ اس نے گھونگھٹ کو اور کھینچ لیا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک مسافر کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ بھیک مانگ رہی تھی۔

وہ لوگ بچے کو عرشے پر لے آئے تھے۔ تمام مسافر دور دور تک کھڑے ہوئے تھے اور اس بچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچہ اب نہیں رو رہا تھا۔ شاید روتے روتے تھک گیا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دہشت مسلسل طاری رہے تو خوف کی شدت کم ہو جاتی ہے یا پھر بچے کو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے پانی میں نہیں ڈبوئیں گے تب ہی اسے [illegible] کر کے وہاں سے آئے ہیں۔

ایک مسلح جوان نے بچے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "آگے بڑھو اور اپنے ماں باپ کو پہچانو۔"

وہ کیبن کے پاس بیٹھی ہوئی اور کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "امی! امی!"

وہ بھیک مانگنے والی تیزی سے زینے کے پاس آئی۔ پھر پیچھے جانا چاہتی تھی کہ بچے نے اسے دیکھ لیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا، تاہم بچہ اپنی ماں کو اس کے لباس سے اور اس کی چال سے پہچان لیتا ہے۔ وہ امی کہہ کر دوڑتا ہوا آیا پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

وہ رو رہی تھی گھونگھٹ میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی لیکن منہ سے آواز نہیں نکال رہی تھی۔ بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہا تھا۔ "امی! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ بچا لو۔ مجھے اپنی گود میں اٹھا لو۔ ابو کہاں ہیں؟ امی! ابو کہاں ہیں؟"

عرشے پر تمام مسافر گم صم کھڑے ماں بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ مکتی باہنی کے ایک جوان نے اس بھکارن کے قریب پہنچ کر کہا۔ "بچے کی ماں تو مل گئی۔ باپ کہاں ہے؟"

وہ چاروں طرف مرد مسافروں کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے بھکارن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "منہ کیوں چھپا رہی ہو۔ بتاؤ اس کا باپ کہاں ہے؟"

اب اس کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی وہ خوبصورت رہی ہوگی مگر اب کھنڈر بن چکی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن پر کہیں کہیں زخموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اس نے بنگالی زبان میں کہا۔ "امار سوامی مورے گچھے (میرا شوہر مر چکا ہے)۔"

ایک مسلح جوان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ بچہ کئی بار اپنے باپ کو پکار چکا ہے۔ یہ سات آٹھ برس کا ہے۔ اتنا تو سمجھتا ہے کہ جو مر جاتے ہیں انہیں مدد کے لیے پکارا نہیں جاتا۔ یہ صرف تمہیں ہی پکارتا رہتا۔"

"یہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میں نے ایک بار اس سے مرنے کی بات کہی تھی تو یہ بیمار پڑ گیا تھا۔ تب سے میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے باپ کی تصویریں دیکھ کر کہتی تھی کہ یہ دوسرے ملک کام کرنے گئے ہیں۔"

ایک مسلح جوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "بہت خوب! تم اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھیں لیکن اس کو مرنے کے لیے ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔"

ماں نے بچے کو اٹھا لیا۔ پھر گلے سے لگا کر رونے لگی۔ سب اس کا جواب سننے کے منتظر تھے ۔۔۔ وہ بچے کو لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریلنگ کے پاس آئی۔ پھر بچے کو اتار کر عرشے پر کھڑا کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہوتی کہ بچے کو مرنے کے لیے دشمنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ مجبور ہو کر سوچا اگر میں اس طرح چھوڑ دوں گی تو یہاں سیکڑوں مسافر ہیں۔ سیکڑوں ماؤں میں کسی کے دل میں تو ممتا جاگے گی۔ اگر وہ میرے بچے کو نہیں اپنائے گی تو کم از کم اسے مرنے بھی نہیں دے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "جب تک [illegible] سے لٹکتا رہا میری ممتا سولی پر چڑھی رہی۔ میں اپنے آپ کو اسی امید پر تسلی دیتی رہی کہ اسے بچانے کے لیے سارے مسافر ایک ہو جائیں گے۔ کسی قوم میں سب کے سب وحشی نہیں ہوتے۔ سب سے بہاری یا سارے بنگالی ظالم نہیں ہیں۔ بڑے انتقامی جذبوں کے باوجود انسان کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے۔ ہمدردی اور محبت کرنے پر مجبور کرتا

ہے۔ تم کہتے ہو میں نے اپنے بیٹے کو موت کے منہ تک چھوڑ دیا، میں [illegible] ہوں۔ جب تک یہ بچہ موت کے شکنجے میں رہا تب تک میں نے یہاں باضمیر انسانوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ وہ سب میرے بچے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ سب کے دل میں ممتا اور پدری شفقت تھی۔ سب اس بچے کے لیے سوچ رہے تھے۔ میں نے دیکھا [illegible] کی اوپر سے نیچے تک مسافر عورتوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس بچے کی باتیں کر رہی تھیں۔ میرا بچہ ایک ممتا کی بہت بڑی [illegible] بن گیا تھا۔ میں نے بس ایک ممتا کو ہار کر ساری ماؤں کی محبتیں اپنے بیٹے کے لیے جیت لی تھیں۔“

ایک مسافر نے کہا: ”ہمیں تمہارے بچے سے ہمدردی ہے۔ ہم اسے مرنے نہیں دیں گے لیکن تم نے اپنے بچے کو بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا؟ کیا ہماری انسانیت کو آزمانے کے لیے؟“

وہ بولی: ”انسانیت کو آزمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے [illegible] کو دیکھا ہے جو ہماری غنڈوں کے خلاف [illegible] رہے۔ بنگالیوں کو دیکھا ہے جو یہاں بدمعاشوں کا سامنا کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے بچے کو چھوڑ دوں گی تو کوئی نہ کوئی محبت کرنے والا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا ورنہ اگر کوئی نہیں لے گا تو یہ بھیک مانگ مانگ کر کسی طرح اپنی زندگی گزار لے گا۔“

ایک عورت نے پوچھا: ”تم اتنی سنگدل کیوں ہو؟ اپنے بچے کو موت کے منہ [illegible] چھوڑ رہی ہو۔“

دوسری عورت نے کہا: ”اور کیا بات ہو سکتی ہے، بھیک مانگ کر بھی پیٹ نہیں بھرتا ہوگا، اس لیے اولاد کو چھوڑ رہی ہے۔“

وہ [illegible] میں [illegible] کر لوں؟ نہیں میں [illegible] کھا سکتی ہوں [illegible] سلامت کیسے اور بچے [illegible] سامنے رکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ [illegible]۔ بڑی بڑی [illegible] میں مجبور ہو گئی ہوں۔“

کسی نے پوچھا: ”کیا مجبوری ہے؟“

وہ بچے سے الگ ہو کر مسافروں کے درمیان سے گزرتے [illegible] بہت ہی [illegible] اس کے لیے بھیک مانگتی ہوں۔“

کسی نے کہا: ”یہ بچہ بھی تمہارے ساتھ بھیک مانگتا ہے [illegible] ہو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بھی بھیک مانگتا ہے تو ایک سے دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے لیکن یہ بنگلہ بولتے بولتے بے اختیار اردو بولنے لگتا ہے۔ بچہ ہے میں اسے سمجھاتی ہوں مگر یہ سمجھتا نہیں ہے۔ اس کی یہ عادت مجھے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میں خیرات مانگتی ہوں تو کوئی مجھے اللہ کے نام پر دیتا ہے کوئی میری جوانی کے نام پر کچھ دے جاتا ہے لیکن جب یہ بچہ اچانک اردو بولنے لگتا ہے تو میرا راز فاش ہو جاتا ہے۔ خیرات دینے والے سمجھ لیتے ہیں کہ میں بہاری ہوں۔ بس وہ میرے بچے کے سامنے میرے وجود کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔“

کچھ لوگ مسکرا رہے تھے کیونکہ بنگال کے رستوں پر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنے سر پر آنچل رکھنے کے بہانے اپنا منہ چھپا رہی تھیں۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ وہ کہنے لگی: ”میں نے سوچا تھا کہ جاؤں گی اور وہاں کچھ دیر کیمپ میں پناہ لوں گی لیکن یہاں [illegible] ہونے سے پہلے میرے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میرے اندر کی ممتا چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ ماں اور بیٹے کے درمیان [illegible] کی اونچی دیوار کھڑی کر دو [illegible] ماں کو [illegible] نہ سکے۔ میں نے اسے [illegible] کے مسافروں میں لا کر چھوڑ دیا۔ جب باپ چھوڑ کر یہاں [illegible] مجھے [illegible] کرتا ہوا [illegible] کہہ کر بچے چلی گئی۔ جب یہ بچہ [illegible] تو میں [illegible] ان لوگوں کے پیچھے پڑ رہ گیا۔“

وہ [illegible] چپ ہوئی پھر [illegible] کہنے لگی: ”مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ یہ تو کمانے والا بیٹا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے چھوڑ دیا [illegible] ماں بیٹا ساتھ نہیں رہ سکتے اس لیے ماں نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔“

اچانک وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو [illegible] ایک عورت اس کی طرف بڑھی۔ دو عورتوں نے اسے سہارا دے دیا۔ ایک عورت نے پوچھا: ”کیا ہوا؟“

[illegible] کوئی دوائی [illegible] مل سکتی ہے؟“

کچھ عورتوں کو ایک بھکارن کے ماں بننے سے دلچسپی [illegible]

چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ وہ اسے سہارا دے کر کیبن میں لے آئیں۔ کیبن کے مرد باہر چلے آئے ایک نے ناگواری سے کہا: "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے دیش میں ہزاروں بھکارن [illegible] ان سب کو اپنے سر پر بٹھالیں؟"

دوسرے جنٹلمین نے کہا: "ہم مہنگے ٹکٹ لے کر فرسٹ کلاس میں اس لیے تو سفر نہیں کرتے کہ [illegible]"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کلیم الدین بھوتیاں کی گرج دار آواز سنائی دی۔ سب ادھر پلٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے اسٹین گن پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا: "بکواس کرنے سے پہلے اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہم گناہ کے لیے ایک تھرڈ کلاس عورت کو فرسٹ کلاس میں لے آتے ہیں لیکن گناہ کا خمیازہ بھگتنے کے لیے اسی عورت کو سامنے کے تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہیں دیتے۔"

ایک شخص نے کہا: "یہ باتیں ان سے کہو جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔"

"اگر شریف ہو تو باضمیر بھی ہو۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کرو۔ کیا اس بہاری بچے کو مار ڈالنا چاہیے؟"

ایک شخص نے کہا: "نہیں! ہم اسے مارنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

دوسرے نے کہا: "ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ یہاں مکتی باہنی کے جوان موجود ہیں۔ انھوں نے ہمارے دیش کو ظالموں سے مکت کیا ہے۔ یہ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ انھوں نے آزادی کی جنگ [illegible] ہے یہ اچھی طرح فیصلہ کریں گے۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے کہا: "ہمارا فیصلہ ہے ہمارے دیش کی زمین پر ایک بہاری بھی زندہ نہ رہے۔ ہم ان کے بچوں کو اگر جان سے نہیں ماریں گے تو کم از کم اپاہج بنا [illegible]"

ان کی باتوں کے دوران کلیم [illegible]

[illegible]

[illegible] خوبصورت ڈال لیا ہے۔ میری زندگی۔"

میں نہیں جانتا کہ وہ بنگالی تھی یا بہاری۔ وہ [illegible]

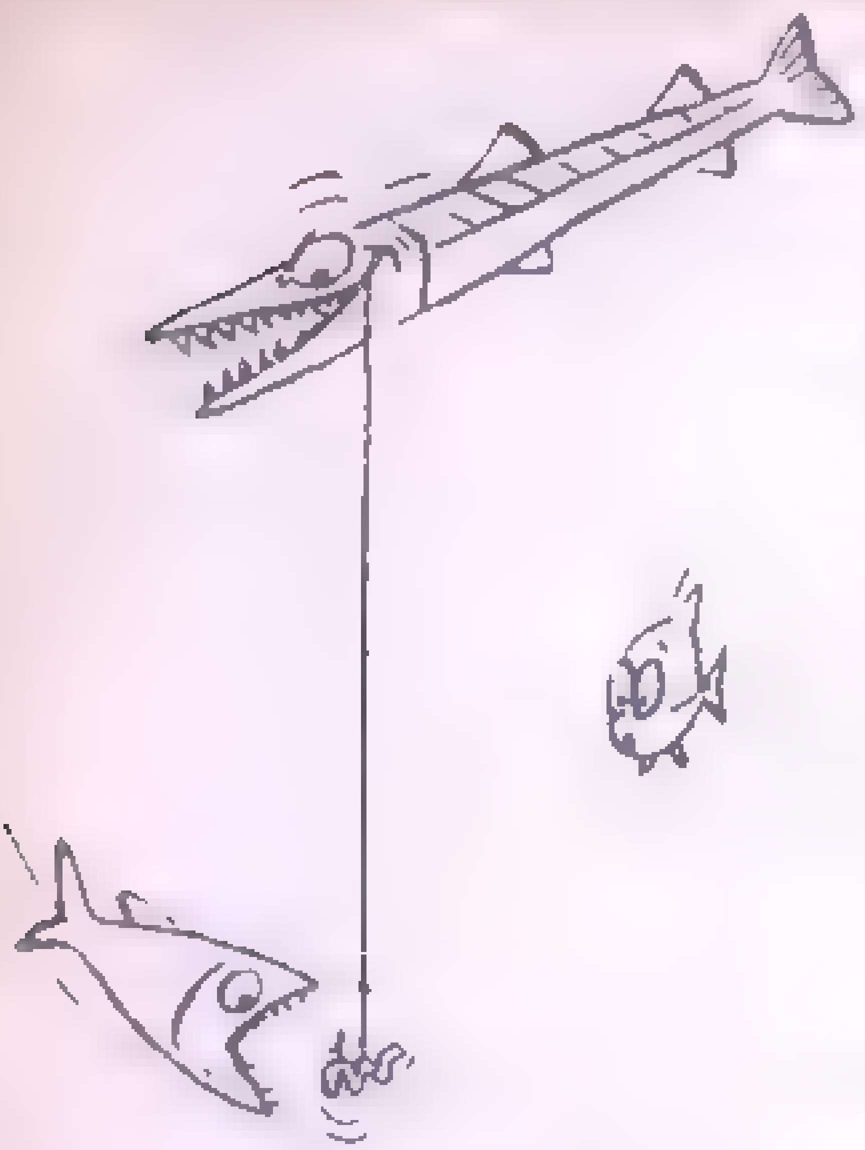

تک ہمارے ساتھ سفر کرتی رہی۔ جب ہمارا ایک بہاری ساتھی مارا گیا تو وہ اس کے لیے بین کرنے لگی۔ اسی عورت کی اداؤں نے سمجھایا کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ میں اس عورت کے نام پر [illegible] میں نے کچھ دیر پہلے یہاں کے مسافروں کو دھمکی دی تھی کہ اس بچے کو ہاتھ لگایا تو ایک ایک مسافر کو [illegible] نہیں پہنچ سکے گا [illegible] بھی اس بچے [illegible]

ایک مکتی باہنی کے جوان نے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے کہا: "تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہم چار ہیں اور تم ایک ہو۔"

[illegible] نے کہا: "میرے پاس اٹھائیس کارتوسوں کا ایک [illegible] جتنی دیر میں تم مجھ پر گولیاں برساتے ہو گے۔ میں اتنی دیر میں ایک راؤنڈ تمام مسافروں پر خالی کر دوں گا۔"

مسافر سہمے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں [illegible] کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ کوئی حرکت کرے گا تو [illegible] ہو جائے گی۔"

سب اپنی اپنی جگہ سہمے ہوئے کھڑے رہے۔ کلیم [illegible]

[illegible]

عمل نہیں کروں گا۔ میں انسان ہوں۔ میں نے کہا تھا [illegible]

[illegible]

تم سب سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے یہ گولیاں تم پر خالی نہیں کروں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ دوسری طرف پلٹ گیا۔ دوسری طرف طرف دریا تھا، کھلا آسمان تھا۔ وہ اچانک ہی فائرنگ کرنے لگا۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ ہی دائیں سے بائیں گولیاں چلاتا گیا اور کہتا گیا۔ "ہمارے دیش میں گولیاں بہت چل چکیں۔ اب انہیں دریا میں بہا دو۔"

تڑ تڑا تڑ کی آواز دور تک دریا میں گونجتی جا رہی تھی۔ لانچ کے مسافروں کے کان بج رہے تھے۔ وہ سب دم بخود تھے۔ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اٹھائیس کارتوس فوراً ہی ختم نہیں ہو جاتے۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ وہ گولیاں دہشت کی طرح دماغوں میں چیخ رہی تھیں، اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہمارے دیش میں رقص ہے، موسیقی ہے، گیت ہے، محبت ہے اور یہ سب کچھ انسانی رابطوں اور رشتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

تڑ تڑا تڑ، تڑ تڑا تڑ اور پھر راؤنڈ ختم ہو گیا۔ اسٹین گن خالی ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر تمام مسافروں کی طرف دیکھ اپنے دونوں ہاتھوں پر اسٹین گن رکھ کر اسے یوں آگے بڑھایا جیسے بھینٹ ہاتھ تھال میں رکھ کر پیش کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ خالی ہو چکی ہے۔ اس کی ایک ایک گولی تمہارے سینوں میں اتر سکتی تھی۔ میں نے تم سب کو نئی زندگی دی ہے۔ اب تم اس بچے کو معاف کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے اسٹین گن کو دور دریا میں لانچ کے باہر پھینک دیا۔ وہ اسٹین گن [illegible] ہوئی دریا کی لہروں میں [illegible] ہوئے تھے۔ بہت [illegible] کو دیکھ رہے تھے۔ اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا

اتنے سارے مسافروں کے درمیان وہ ننھا سا بچہ سہما [illegible]

انسان ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی [illegible]

لے کر آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔

عرشے کے آخری سرے پر مغرب کی اذان ہو رہی تھی ٹھیک اسی وقت کہیں سے ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

* * *

نین تارا، عظمیٰ اور بڑو دیدی جاگ رہی تھیں۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ نین تارا بے چینی سے کبھی اٹھتی تھی کبھی بیٹھتی تھی کبھی دروازے تک جاتی تھی اور مایوس ہو کر لوٹ آتی تھی۔ خسرو نے کہا تھا "وہ نو بجے آ جائے گا۔ رات کا کھانا کھا کر [illegible] تک ریلوے اسٹیشن چلا جائے گا پھر شاید صبح واپسی ہوگی۔ کیونکہ اس کے کام اناج کا دوسرا ویگن پہنچنے والا تھا۔

بڑو دیدی رو رہی تھیں۔ ان کی نند کشتی شام سے مندر گئی تھی پھر لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ ہر جگہ تلاش جاری تھی۔ [illegible] نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہی اسے ڈھونڈ نکالے گا لیکن رات گزرنے والی تھی۔ چنتا اس بات کی تھی کہ کشتی [illegible] کی بہن تھی۔ تلسی رام نے اپنی بہن کو اس کی پناہ میں رکھا تھا۔ اب وہ آ کر سختی سے پوچھ سکتا تھا کہ جب حالات اتنے خراب تھے تو بڑو دیدی نے کشتی کو تنہا مندر کیوں جانے دیا تھا؟

عظمیٰ چپ چاپ ان دونوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسے [illegible] دلاسا دینا نہیں آتا تھا۔ وہ کبھی اپنا ہاتھ نین تارا کی پشت پر رکھتی تھی، محبت سے سہلاتی تھی کبھی بڑو دیدی کا ہاتھ تھام کر تھپکنے لگتی تھی۔ ان تینوں نے دو [illegible] نیند اڑ گئی تھی۔ بڑو دیدی نے نین تارا سے کہا۔ "میں نے تمہارے [illegible] رہوں گی۔ یہاں غنڈے بدمعاش زیادہ [illegible]

[illegible]

نکل نہیں آئے۔ دیدی! میرا [illegible]

[illegible] سے اٹھ کر باہر آ گئے۔"

فرش تک لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے اندر نہیں لگتا تھا۔ جالی سے باہر والی سڑک دور دور تک نظر آتی تھی۔ آس پاس مارواڑیوں کے دو منزلہ اور تین منزلہ مکانات تھے۔ سڑک ویران تھی۔ مکانات بھی خاموش اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مغلی اس کے ساتھ آکر باہر دیکھ رہی تھی۔

بالکل سامنے ہی ایک گائے کھڑی ہوئی تھی۔ گائے کے ماتھے پر سیندور لگا ہوا تھا اور اس کی دونوں سینگوں پر گیندے کے پھول بندھے ہوئے تھے۔ [illegible] کتنی ہی گائیں مارواڑی پٹی میں چہل قدمی کرتی رہتی تھیں۔ ہندو انھیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے تھے پھر ان سے بچتے کترا کر گزر جاتے تھے۔ جب یہ علاقہ پاکستان تھا تو ہندوؤں کے محلے میں شاذ و نادر ہی گائے نظر آتی تھی۔ [illegible] انھیں قصائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ [illegible] مارواڑی ہندو وہاں [illegible] ہو گئے۔ ان کے ساتھ اب گائیں بھی [illegible] نظر آیا کرتی تھیں۔ اب کس کی مجال تھی کہ ان جانوروں کو ہاتھ لگاتا۔ [illegible] بنگلہ دیش بھی مسلمانوں کا تھا لیکن وہاں ہندوؤں کو سینگ مارنا آتا تھا۔

نین تارا لوہے کی جالیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے [illegible]

[illegible]

[illegible] جھکے ہوئے انداز میں فرش پر بیٹھ کر کہا۔

[illegible]

[illegible] وہ آتی ہے نہیں [illegible] وہ بھی [illegible] وہ خسرو کے معاملے میں [illegible]

[illegible]

ہاں جگنی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ میں بھی تمھارے جیجاجی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی تھی۔ بہت بڑے جھگڑے ہوئے۔ کیا بتاؤں اس عورت کو گھر سے نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آئیں۔ یہ کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔ آخر چھڑا کر ہی رہی۔ تب سے کان پکڑ لیے کہ پھر کسی عورت کو اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دوں گی۔ تمھاری بات اور ہے تم میری بھابی ہو لیکن اس گونگی کو دیکھ کر تمھارے جیجاجی کی حرکت یاد آجاتی ہے۔ میں بار بار تمھیں کہہ چکی ہوں، میرا کہا نہیں مانتے تو تمھیں نقصان اٹھاؤ گی۔ میں نے خسرو کو بھی دبی زبان سے کہا ہے کہ وہ اس گونگی کو کہیں ٹھکانے کرے لیکن وہ تو جواب ہی نہیں دیتے۔ ایک بات پوچھوں؟"

"کیا بات ہے ادیدی؟"

"تم خسرو کی دھرم پتنی ہو لیکن میں دیکھتی آتی ہوں، اس کے پاس جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھنے کے لیے کہتی ہوں تو تم بیٹھتی ہو ورنہ کھنچی کھنچی سی رہتی ہو۔ اس کے برعکس وہ گونگی سیدھی اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ برا نہ ماننا کوئی دیکھنے والا یہی کہے گا کہ تم ہاتھی کے دانت ہو، صرف دکھانے کے لیے۔ کھانے والا دانت کوئی اور ہے۔"

مغلی دروازے کے پاس کھڑی ہوئی سن رہی تھی۔ وہ بے زبان تھی۔ بے حس نہیں تھی۔ اس کے دل پر چوٹیں لگ رہی تھیں مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی، مجبور تھی۔ بڑو دیدی کے تیور کو سمجھتی تھی وہ صاف اپنے دل رکھ نہیں سکتی تھیں — وہ خود سوچتی تھی کہ خسرو اور نین تارا سے کیوں لگی ہوئی ہے کب تک ان پر بوجھ بنی رہے گی؟ وہ ایسا سوچتی تھی لیکن انھیں چھوڑ کر کہاں جا سکتی تھی؟ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

وہ بیٹھک میں آئی۔ بڑو دیدی اسے دیکھتے ہی چپ ہو گئیں۔ نین تارا سے اس کی نظریں ملیں۔ اس نے کہا: [illegible] بات یہ ہے دراصل [illegible] ہے، تم خسرو کی منکوحہ ہوتے ہوئے بھی اس کی بیوی نہیں ہو۔ [illegible] تم اس کے قریب جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میرے اور خسرو کے درمیان کوئی [illegible] رشتہ نہیں ہے۔ خسرو کی جو خدمت تمھیں کرنا چاہیے وہ میں کرتی ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اور اسی صورت کو بڑو دیدی نہیں سمجھ سکتیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر [illegible] لگی۔ اس کے جانے کے بعد بڑو دیدی نے حیرانی سے [illegible]

گیا کر رہی تھی۔ کیا تم اس کی ٹوٹی پھوٹی بولی کو سمجھ لیتی ہو؟"

مین تارا اور خسرو اس کی بولی کو بڑی حد تک سمجھنے لگے تھے۔ مین تارا نے سمجھ کر بھی انکار کیا "نہیں، میں سمجھ نہیں سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں، سب یہ کچھ بولنا چاہتی ہے اور بولے بغیر نہیں رہ سکتی تو پھر زبان ہلانے لگتی ہے خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔"

بڑو دیدی نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہمیں باتیں سنا کر لیتی ہے۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی، اسی وقت ہریا کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے بڑو دیدی کو پکار رہا تھا۔ وہ دونوں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھیں اور تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے تک آ گئیں۔ ان کے پیچھے منگلی بھی چلی آئی تھی۔ بڑو دیدی نے بے چینی سے پوچھا "جلدی بتاؤ ہریا کیا ششتی مل گئی ہے؟"

ہریا نے مین تارا اور منگلی کو گھورتے ہوئے کہا "ہاں مل گئی مگر میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بڑو دیدی نے مین تارا اور منگلی کو دیکھا۔ پھر حیرانی اور غصے سے پوچھا "کیا بکواس کر رہے ہو؟ پہلے ششتی کے متعلق بتاؤ۔ ان دونوں کو دھمکیاں کیوں دے رہے ہو؟"

"[illegible] بات ایسی ہے کہ سنو گی تو انھیں گولی مار دو گی۔"

"بات کیا ہے؟"

یہ پوچھتے ہوئے بڑو دیدی نے [illegible]

[illegible] ہوئے کہا "تم جیسے [illegible]

[illegible] کی قسمیں کھاتی ہو، وہی [illegible] ششتی کو لے گیا تھا۔"

بڑو دیدی نے [illegible] ہریا! میں [illegible] خسرو کے بارے میں ایسی بات [illegible]

[illegible]

کے ہوتے ہیں۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں، اسی میں چھید کرتے ہیں۔"

مین تارا نے بڑو دیدی کے بازو کو تھام کر کہا "نہیں دیدی! نہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ یہ ان پر بہتان ہے۔"

دیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلی بار سرد مہری کا اظہار کیا۔ ابھی وہ مین تارا وغیرہ سے ناراض نہیں تھیں، نہ ہی خوش تھیں۔ جو کچھ ہریا کہہ رہا تھا، اسے آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ ان کے درمیان ایک سائیکل رکشہ تھا جس پر ایک عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ رکشہ کے آگے آگے خسرو تھا اور وہ تمام لوگ باری باری اسے مار رہے تھے اور دھکا دیتے ہوئے اسی طرف لا رہے تھے۔

بڑو دیدی، مین تارا اور منگلی گم صم کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا سمجھ میں آ گیا کہ رکشہ میں بیٹھی ہوئی عورت ششتی ہے۔ وہ بھیڑ بڑو دیدی کے برآمدے کے سامنے آ کر رک گئی۔ تقریباً سو ڈیڑھ سو آدمیوں کا مجمع ہوگا۔ اس وقت چار بجنے والے تھے۔ ایسے وقت لوگ گہری نیند سوتے ہیں لیکن آئے دن یہ گاؤں کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ ذرا سی بات ہو تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ اسی لیے اتنی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس بھیڑ میں دھرم چند اور اس کے غنڈے بھی موجود تھے۔

دھرم چند کو دیکھتے ہی بڑو دیدی نے گھونگھٹ ڈال لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا "جی بی! [illegible] میں [illegible] تعلق رکھتا ہوں۔ جس دن سے یہ بہاری مسلمان آپ کے گھر میں آیا ہے، [illegible] کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ آج شام کو جب معلوم ہوا کہ ششتی غائب ہو گئی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اپنے تمام آدمیوں کو [illegible] کے چپے چپے پر پھیلا دیا۔ ششتی کو تلاش کرتا رہا۔ آخر ہم نے [illegible] میں ان دونوں کو ڈھونڈ نکالا۔"

ہریا رکشہ کے پاس پہنچ گیا تھا اور ششتی کو [illegible] اتار رہا تھا۔ خسرو کو اتنی مار پڑی تھی کہ اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس میں کھڑے [illegible]

[illegible]

ہیں، میں شمشی کو اپنی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔“

پیچھے سے کسی نے اسے لات ماری۔ پھر اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا: ”شرم نہیں آتی اسے بہن کہتے ہو۔ ہم تمہارا منہ توڑ دیں گے۔“

بھیڑ میں سے کسی نے کہا: ”اور نہیں تو کیا تمہیں زندہ چھوڑیں گے۔“

کسی اور نے کہا: ”ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہارے کرتوت دیکھے ہیں۔ ہم تو تمہاری بوٹی بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔“

دھرمیندر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: ”خاموش رہو۔ [illegible] آ پہنچا ہے۔ ابھی شمشی کے بیان سے اس کا کچا چٹھا سامنے آ جائے گا۔“

اسی وقت تھانے کا داروغہ چھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بڑو دیدی نے کہا: ”ہریا! انسپکٹر صاحب سے کہو اندر آ جائیں اور کوئی نہ آنے پائے۔ ان کے سپاہی خسرو کا خیال رکھیں، کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے۔“

تھوڑی دیر بعد بیٹھک میں بڑو دیدی شمشی کو لے کر لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ داروغہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نین تارا اور منظلی تخت سے لگی کھڑی ہوئی تھیں۔ ہریا بیٹھک میں نہیں آیا۔ اس کے اندر کا چور کہہ رہا تھا کہ پکڑا جا سکتا ہے۔ بظاہر پکڑے جانے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بیٹھک کے باہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

بڑو دیدی نے شمشی کا منہ اوپر اٹھا کر کہا: ”شمشی! تم پر جو قیامت گزری ہے اسے میں دل سے محسوس کر رہی ہوں۔ میری بہن! جو کچھ بھی ہو، دل پر پتھر رکھ لو۔ یہاں داروغہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ سچ سچ بتا دو۔ تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟“

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پلک نہیں جھپک رہی تھی۔ بڑو دیدی کو ڈر سا لگا۔ وہ زندہ لاش لگ رہی تھی۔ اس نے جھنجوڑ کر پوچھا: ”شمشی! تم ایسے خاموش کیوں ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن بڑو دیدی کو اطمینان ہو گیا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ داروغہ نے اپنی کرسی پر ذرا سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے کہا: ”دیوی جی! آپ خاموش نہ رہیں۔ اگر کسی نے دھمکی دی ہے۔ زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نام بتائیں۔ میں ابھی آپ کے سامنے اس کی پٹائی کروں گا۔ اسے حوالات میں بند کر دوں گا۔“

> ”مرنے کے بعد اگر تمہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے“ بیوی نے پوچھا۔ ”تو کیا تم وہ ہی غلطیاں کرو گے جو پچھلے جنم میں تم سے سرزد ہوئی تھیں؟“
>
> ”یقیناً“ جواب ملا ”لیکن پادری صاحب [illegible] [illegible] غلطیوں [illegible] سے کرا دوں گا۔“

وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی پھر دو زانو ہو گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی: ”میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر بنتا کرتی ہوں۔ خدا کے لیے زبان کھولو۔ نہیں تو ان پر الزام آئے گا۔ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

منظلی بھی شمشی کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بڑو دیدی نے بار بار پوچھا۔ پھر داروغہ نے کہا: ”دیوی جی! آپ خاموش رہیں گی تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ آپ اپنی بھابی کے کان میں صرف مجرم کا نام بتا دیجیے۔“

بڑو دیدی آگے کھسک کر شمشی کے قریب آ گئیں۔ آہستگی سے بولیں: ”میرے کان میں بتا دو۔“

بڑی دیر بعد شمشی کے جسم میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ وہ آگے پیچھے ڈول رہی تھی۔ جیسے جنون طاری ہو رہا ہو۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا جیسے سر چکرا رہا ہو۔ بڑو دیدی نے پوچھا: ”کیا ہوا شمشی؟ بولو، کیا ہوا؟“

اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ اپنی بھابی پر ڈال دیا۔ بڑو دیدی، نین تارا اور منظلی نے اسے سنبھالا۔ پھر لکڑی کے تخت پر لٹا دیا۔ اسے پنکھا جھلنے لگیں۔ منظلی نے اس کی نبض ٹٹولی۔ نین تارا نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دھڑکنیں جاری تھیں۔ وہ زندہ تھی لیکن بے ہوش ہو گئی تھی۔

باہر خسرو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ”ہریا! تم خاموش کیوں ہو؟ تم لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے کہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہم دونوں کو پکڑ لیا تھا۔ زبردستی ہم دونوں کو شراب پلائی تھی۔“

داروغہ اس کی باتیں سن کر بیٹھک کی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ وہیں ہریا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا: ”ہریا! کیا یہ سچ ہے؟“

ہریا نے کہا: "آپ خود دیکھ لیں۔ کیا میرے منہ سے شراب کی بُو آ رہی ہے یا۔۔۔"

اس نے انسپکٹر کے قریب منہ کھول کر سانس چھوڑی۔ پھر کہا: "یہ بکواس کرتا ہے۔ میں نے شام سے اسے دیکھا تک نہیں۔ وہ کہتا ہے، میں اس کے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا۔ داروغہ صاحب! یہ مار کھا کر آدھا پاگل ہو گیا ہے۔ میرے ہی گھر کی عورت کو لے گیا اور مجھے ہی اپنی حمایت میں گواہ بنا رہا ہے۔ سالا اُلو کا پٹھا۔"

داروغہ نے گھور کر خسرو کو دیکھتے ہوئے کہا: "اے ماوڑا! اپنا منہ بند رکھو۔ جب پوچھا جائے تو جواب دینا۔ اس سے پہلے کچھ بولو گے تو میرے سپاہی تمھاری پٹائی کریں گے۔"

پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا: "تم فوراً اس رکشہ میں جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ ششی دیوی بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

سپاہی رکشہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ خسرو چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی مار کھا چکا تھا کہ سپاہیوں کی مار کھانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ ایک ہاتھ بھی پڑتا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔

دھرم چند نے دبی آواز میں بڑو دیدی کو آواز دی۔ "شانتا دیدی۔ ہمارے گھر کی کچھ عورتیں آ چکی ہیں۔ دروازہ کھول دیجیے۔"

بڑو دیدی نے کہا: "داروغہ صاحب! آپ اپنی طرف سے انتظام کر دیں۔ ان سے کہہ دیں، جب تک قانونی کارروائی مکمل نہیں ہو گی، ششی کا بیان نہیں لیا جائے گا۔ اس وقت تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

داروغہ نے یہی بات دھرم چند سے کہہ دی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا۔ اس کے لیے دروازہ کھول کر پھر بند کر دیا گیا۔ اس وقت تک ششی کو دوسرے کمرے میں پہنچایا جا چکا تھا۔ وہاں [illegible] ــــ [illegible] دیجیے گا۔

اِدھر صبح کی ہلکی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ [illegible] اس بدمعاش کو لے جا کر حوالات میں بند [illegible] جب وہ [illegible] بیان دے گی تو۔۔۔"

بڑو دیدی نے ان کی بات کاٹ کر کہا: "آپ کس بدمعاش کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی جو باہر کھڑا ہے۔ لوگوں نے جسے پکڑ رکھا ہے۔"

"لیکن داروغہ صاحب! ششی نے ابھی کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ میں خسرو کو دس برس سے جانتی ہوں۔ یہ لڑکا میرے سامنے جوان ہوا ہے۔ بہت ہی شریف لڑکا ہے لیکن آدمی کب جانور بن جاتا ہے، یہ کہا نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ اس کے خلاف سیکڑوں گواہ ہیں۔ جب تک اس کی بے گناہی ثابت نہیں ہو گی، میں اسے اور اس کی ان دو عورتوں کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گی لیکن یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ دربدر ہو جائیں ـــــ کیا آپ ششی کا بیان لینے تک ان تینوں کو دشمنوں سے کہیں بچا کر نہیں رکھ سکتے؟"

داروغہ نے ذرا سوچ کر کہا: "میں ان عورتوں کو یہاں قریب ہی خیر بلڈنگ میں پہنچا دوں گا اور خسرو کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

نین تارا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا: "نہیں دیدی! نہیں! مجھے بھی ان کے ساتھ حوالات میں بھیج دیجیے۔ میں ان سے دور نہیں رہوں گی۔"

شانتی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بڑو دیدی نے ان دونوں کو دیکھ کر کچھ سوچا پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے وہ نوٹ انسپکٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: "میں چاہتی ہوں، آپ خسرو کو بھی ان عورتوں کے ساتھ اسی خیر بلڈنگ میں حفاظت سے پہنچا دیں۔ ہو سکے تو اپنے ایک سپاہی کو وہاں چھوڑ دیں۔"

داروغہ نے نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا: "آپ بے فکر رہیں۔ میں ان تینوں کو حفاظت سے وہاں پہنچا دوں گا۔ کوئی [illegible] ششی کا بیان [illegible] ہے۔ اس وقت تک ان تینوں کی حفاظت [illegible] ہو گی۔"

بڑو دیدی نے [illegible] سنجیدگی سے کہا: "اب جاؤ یہاں سے۔"

نین تارا دوسرے [illegible] لے آئی۔ [illegible] کہا: "آپ تلاشی لے لیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ یہاں سے۔"

[illegible] کا ہاتھ تھام کر داروغہ

کے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک سے باہر نکل آئی۔

⁂

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔ جب وہ تینوں عمارت کے دروازے پر پہنچے تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ شیر بلڈنگ کے بڑے ہال میں پناہ لینے والے مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے پولیس والوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ داروغہ نے کہا۔ ”یہ تینوں یہاں رہیں گے۔ ایک سپاہی کی ڈیوٹی یہاں رہے گی مگر تم لوگوں کو بھی تاکید کی جاتی ہے، اس شخص کو اچھی طرح پہچان لو۔ اس کا نام خسرو ہے۔ یہ اس بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے۔ اگر جانا چاہے تو پولیس کو خبر کر دینا۔“

داروغہ اپنی افسری دکھا کر چلا گیا جس پولیس والے کی ڈیوٹی تھی، وہ بھی باہر چلا گیا۔ وہ تینوں اس بڑے ہال کی ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس چادریں تنی ہوئی تھیں۔ سب لوگ چادروں کی چار دیواری میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ لوگ آ کر خسرو کے متعلق پوچھنے لگے۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیسے زخمی ہو گیا ہے؟

خسرو فرش پر لیٹ گیا تھا۔ نیمن تارا نے کہا۔ ”میرے بھائیو، میری بہنو! اگر ہمدردی کرنا ہے تو ان کے لیے کوئی دوا لاؤ۔ کچھ مرہم پٹی کرو۔ آپ یہ پوچھ کر کیا کریں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو آپ تمام لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔“

بھیڑ چھٹنے لگی۔ ایک بوڑھے نے آ کر اس کے زخموں کو صاف کرنا شروع کیا۔ پھر ان پر حکیمی دوا کا لیپ چڑھانے لگا۔ وہ مار کھا کھا کر ادھ موا ہو چکا تھا۔ ذرا آرام ملا تو آنکھ لگ گئی۔ اگرچہ ابھی اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ششی کے بیان دینے کے بعد اس کے ساتھ نیمن تارا اور عظمیٰ بھی ماری جاتیں لیکن موت کا یقین ہونے کے باوجود، وہ اذیتیں برداشت کرنے کے باوجود تھکن کے مارے بیدار نہ رہ سکا۔ جب نیند آتی ہے تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس لیے وہ سو گیا۔

نیمن تارا نے عظمیٰ سے پوچھا۔ ”کیا تم خسرو کو گنہگار سمجھتی ہو؟“

عظمیٰ نے انکار میں سر ہلایا پھر نیمن تارا کے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے تھپکنے لگی۔ ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔ اشارے سے کہہ رہی تھی۔ ”سو جاؤ، زیادہ نہ سوچو، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔“

بیشک [illegible] ہونی ہو کر رہتی ہے۔ [illegible] اس کے باوجود فکر کرنے والے مرنے سے پہلے مرتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ہونے والی بات کے متعلق نہیں سوچیں گے پھر بھی دماغ سوچتا چلا جاتا ہے۔ وہ لیٹی لیکن تارا کو اب [illegible] زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ خسرو واپس آگیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ پچھلی تمام رات اسی کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ دعا قبول ہو گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ موت بھی آئے تو پروا نہیں تھی۔

مشہور فلم ایکٹرس صوفیہ لارین
کا کہنا ہے کہ عام طور پر کوئی لڑکی اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ ایک شخص اس سے محبت کرے اور اسے چھوڑ جائے بشرطیکہ بہت کچھ چھوڑ کر جائے۔

وہ بھی خسرو کی قربت سے مطمئن ہو کر رفتہ رفتہ سو گئی۔ وقت گزرنے لگا۔ عظمیٰ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نیمن تارا اس کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ کتنے مان سے تلسی رام کے ہاں گئے تھے۔ بڑو دیدی نے ان کی بڑی عزت کی تھی اور بڑی بے عزتی سے نکالا تھا۔ عظمیٰ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ بعض حالات میں انسان نیند کے دوران بھی جاگتا رہتا ہے۔

اسے چاروں طرف سے فکر اور اندیشوں نے گھیر رکھا تھا۔ فکر اس بات کی تھی کہ اس کا گزارا کہاں ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ آخر وہ زندگی کا باقی حصہ کیسے گزارے گی؟ اس کی موجودگی سے خسرو اور نیمن تارا کی ازدواجی زندگی میں بے اعتمادی پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک بڑو دیدی کی بات ہی نہیں تھی۔ دنیا والے بھی اس کی موجودگی سے طرح طرح کی باتیں بنا سکتے تھے۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ بہت پہلے جب وہ اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتی تھی تو بہن اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اپنے شوہر سے لڑتی تھی کہ عظمیٰ سے ہنسی مذاق نہ کیا کرو۔ شوہر کہتا تھا۔ ”یہ میری سالی ہے ایک نہیں ہزار بار مذاق کروں گا۔“

اس کی خوبصورتی اس کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی رشتے دار اسے مستقل اپنے ہاں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جس گھر میں رہتی تھی اس گھر کی عورتیں سوچتی تھیں، یہ بلا کسی دوسرے رشتے دار کے ہاں چلی جائے۔

عظمیٰ کو وہ گزرے ہوئے تمام واقعات خواب کی [illegible] رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی [illegible] نیند میں ہے۔ اس آسیب زدہ عمارت [illegible] اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ [illegible]

ہوں سامنے بول رہے ہوں کسی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔

[illegible] اس کی آنکھ ذرا سی کھلی۔ کچھ نیند کا خمار [illegible] بیداری سی تھی۔ اسے عمارت کا ماحول خواب سا [illegible] لوگوں کے سامنے دھندلا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے سامنے والی دیوار کو دیکھا۔ تب اسے وہ آسیب نظر آیا جو کسی کسی کو نظر آتا تھا اور [illegible] انھیں جنون میں مبتلا کر دیتا تھا۔

اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے دیوار پر بڑے بڑے دانت [illegible] گئے۔ دانت بہت نوکیلے اور تیز تھے۔ [illegible] نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ [illegible] ایک قطار تھی نیچے دانتوں کی دوسری قطار تھی پھر ایک گاجر اس کے منہ میں آئی۔ اس نے کچکچا کر گاجر کو کاٹا۔ کچ کی آواز کے ساتھ [illegible] کا تھوڑا حصہ کٹ کر دانتوں کے اندر منہ میں رہ گیا، باقی حصہ باہر تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی عظمٰی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر وحشیانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس ہال میں جتنے پناہ گزین تھے سب دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں: "دیکھو اب۔ پھر دورہ پڑا ہے اس پر پھر آسیب سوار ہے۔"

یمن تارا اور خسرو بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں عظمٰی کو دونوں طرف سے جھنجوڑ کر پوچھ رہے تھے: "کیا ہو گیا؟ کیا ہوا تمھیں؟"

عظمٰی نے دوسری بار ایک چیخ ماری۔ پھر ساکت ہو کر سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگی۔ دراصل وہ عمارت بہت پرانی بوسیدہ تھی۔ اس کی دیواریں کہیں کہیں سے ٹوٹ گئی تھیں۔ کہیں ان پر کائیاں سی جم گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پلاستر ادھڑا ہوا تھا۔ جب دیواروں کے پلاستر جگہ جگہ سے ادھڑ جاتے ہیں تو وہاں عجیب و غریب نقشے سے بن جاتے ہیں۔ انھیں غور سے دیکھا جائے تو کہیں [illegible] کی شکل نظر آتی ہے، کہیں کوئی بے ڈھنگا سا آدمی تلوار یا نیزے سے حملہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ کسی بھی چیز کو سرسری طور پر دیکھ کر گزر جاتے ہیں، ان کی بات الگ ہے لیکن وہ لوگ جو ہر چیز کو توجہ سے دیکھتے ہیں، ان کا دماغ [illegible] اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے حالات کی تصویریں [illegible] اور وہ تصویریں پھر زندہ ہو کر انھیں ڈرانے [illegible]۔

اس عمارت میں آ کر پناہ لینے والوں میں جو بہت زیادہ [illegible] تھے [illegible] کے [illegible] ہونے پر [illegible] سے [illegible] سے جدا ہو گئے۔ کہیں ماں اور وحشت و جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کہیں دیوار کا پلاستر یوں ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی کا لخت جگر نیزے کی انی پر چھٹپٹا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر کتنی ہی حساس مائیں چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ نوشتہ دیوار آنے والے وقت کا آئینہ ہوتا ہے لیکن بوسیدہ شکستہ دیواریں گزرے ہوئے وقت کا فسانہ سناتی ہیں۔ اس عمارت کی دیواروں پر ادھڑے ہوئے پلاستر پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک کی تاریخ مرتب کر چکے تھے۔ انھیں صرف پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جو نہیں پڑھ سکتے تھے، وہ اسے آثار قدیمہ سمجھ کر گزر جاتے تھے۔

لیکن عظمٰی نے اس دیوار پر کیا دیکھا؟ اور جو دیکھا تھا اس کی زندگی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ بول عظمٰی! بول تو بے زبان سہی۔ دیوار کے ادھڑے ہوئے پلاستر بھی بے زبان ہوتے ہیں مگر بولتے ہیں۔ تو بھی زبان بے زبانی سے بول...

دوسرے ہی لمحے وہ بولنے والی مینا بن گئی۔ وہ خوب بولتی تھی۔ اگرچہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ رشتے داروں نے اسے لکھانا پڑھانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ چڑیل اپنے حسن و شباب کے بل بوتے پر کسی کے ہاں جا بسے گی۔

اکثر پیشگوئی درست ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اس کے متعلق پیشگوئی کی تھی وہ ایک ایک کر کے مکتی باہنی والوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے کمانڈر نے پہلے عظمٰی کی بہن سے پوچھا۔ "کیا تم بنگالی بھاشا بول سکتی ہو؟"

[illegible] نے جواب دیا: "اسے گے ہاں۔ آمی بولتے پاری (جی ہاں۔ میں بول سکتی ہوں)۔"

پھر اس کمانڈر نے عظمٰی کے بہنوئی سے یہی سوال کیا۔ اس کے بہنوئی نے بھی بنگالی زبان میں جواب دیا اور کہا: "ہمارا پورا خاندان [illegible] ہے۔ ہم سب بنگالی بول سکتے ہیں۔"

کمانڈر نے حقارت سے کہا: "تم لوگ تھالی کے بینگن ہو۔ جب تک پاکستان رہا، اردو زبان کی حمایت کرتے رہے۔ دن رات اردو بولتے رہے۔ تمھارے گھروں میں کوئی ہماری بھاشا بولنے والا نہیں تھا۔ اب اپنی موت کو سامنے دیکھ کر ہمارے سامنے ہماری بھاشا سنا رہے ہو۔"

اس نے فائر کا حکم دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے تڑاتڑ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس کی بہن اور بہنوئی کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔ ان کی موت کا تماشا نہ دیکھ سکی پھر دوسرے جوان اسے پکڑ کر آنگن میں لے آئے۔ مکتی باہنی کے کمانڈر نے اسے دیکھا تو چند لمحوں تک دیکھتا ہی

رو پڑا۔ [illegible] سے محبت [illegible] بیٹھے میں کہا: "[illegible] منعم [illegible] توں کے؟ (میں منعم باللہ ہوں، [illegible]"

عظمیٰ کے سامنے بہن اور بہنوئی کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی: "عظمیٰ۔"

اس نے پوچھا: "[illegible] بھاشا؟ تمہاری [illegible] کیا ہے؟"

عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے بنگالی زبان میں کہا: "مجھ سے [illegible] اور چھوٹی نے بنگلہ زبان میں باتیں کیں۔ انہیں [illegible] میری سمجھ میں نہیں آتا، میں کون سی زبان بولوں؟"

"[illegible] کوئی سی زبان بولو گی تو زندہ رہو گی۔ بنگلہ بھاشا بولو [illegible] پیار سے اٹھا کر لے جاؤں گا لیکن بہاریوں کی [illegible] تمہارے حسن سے آنکھیں چرا کر تمہاری موت کا [illegible]"

[illegible] میں اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

[illegible] آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے پہنچا پھر اس [illegible] اس کی طرف بڑھایا۔ عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے [illegible] ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے [illegible] اپنے کاندھے پر ڈال دیا۔ اس کے [illegible] ہنستے تھے۔ طنزیہ پوچھتے رہتے تھے [illegible] تمہیں اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟ آج [illegible] اٹھا کر لے جانے والا آ گیا تھا۔

وہ عظمیٰ کو دیناج پور کے ریلوے کوارٹر میں لے آیا۔

[illegible] کا [illegible] لیکن کچھ یاد نہیں [illegible] رعب [illegible] میں [illegible] تھی۔ [illegible] کے [illegible] پڑھنے [illegible] کے [illegible] متعلق سوچ سکتی نہیں تھا اس سے [illegible] نہیں سوچتی تھی۔ [illegible] منعم باللہ کی محبت مل گئی تھی اور وہ اس سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف منعم باللہ بھی اس سے متاثر تھا۔ وہ کہتا [illegible] تمہارے قدموں میں رکھ دوں [illegible] جو چھوٹی چھوٹی [illegible] کا خیال رکھنا [illegible] ایک لفظ بھی [illegible] کرنا۔ میرے کان گالی سن سکتے ہیں مگر یہ زبان نہیں سن سکتے۔"

وہ بھول کر بھی اس کے سامنے اردو نہیں بولتی تھی۔

عورت اپنے مرد کے لیے دنیا چھوڑ دیتی ہے۔ ایک زبان چھوڑنے میں [illegible] ہو سکتا تھا۔ وہ اردو نہیں بولتی تھی مگر کب تک نہ بولتی۔ یہ زبان اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے دن رات [illegible] اس زبان کے [illegible] میں، وہ روح کی گہرائیوں میں جذب کیا تھا [illegible] وہ شعوری [illegible] نہ بولے۔ غیر شعوری طور پر ایک بے چینی سی رہتی تھی [illegible] نہیں [illegible] تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ گھٹن سی ہوتی ہے جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ [illegible] اور [illegible] چلا جاتا تھا اور وہ [illegible] تنہا رہ جاتی تھی تو [illegible] سے [illegible] کوئی [illegible] کرتی تھی [illegible] دیکھتی تھی۔ [illegible] بند ہوتا تھا۔ وہ [illegible] کرتی تھی۔ [illegible] کی تصویر کے پاس جاتی تھی اسے سینے سے لگاتی تھی۔ پھر تصویر کے کان کے پاس [illegible] سرگوشی [illegible] کرتی تھی: "دیکھو، میں [illegible] بول [illegible] آئے [illegible] بات [illegible] کھل [illegible]"

[illegible] محبت سے پوچھا: "تم اس زبان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟"

وہ بنگالی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اردو زبان میں اس سے باتیں کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ اس کے [illegible] رہی تھی۔ اس نے کہا: "[illegible] جب یہ فیصلہ کیا گیا [illegible] قومی زبان ہوگی [illegible] ان دنوں میں چار برس کا تھا [illegible] یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ میری ماں میری پرورش کرتی تھی [illegible] ماں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتی تھی۔ وہ ایک ذہین طالبہ تھی [illegible] تو [illegible] تحریک بھی چلتی رہی تھی۔ جب یہ تحریک [illegible]

ایک روز شیطان سے کسی نے پوچھا۔ "تم انسانوں پر طرح طرح کی مصیبتیں ڈالتے رہتے ہو۔ اب تک تم نے سب سے بڑی بلا کس پر ڈالی ہے؟"

جواب ملا۔

"ایک عورت پر۔ میں نے اسے سو جوڑے لباس، سو جوڑے جوتے اور میک اپ کی بے شمار اشیا دے کر ایسے گھر میں بھیج دیا جہاں آئینہ نہیں تھا۔ یہ چیز اس کے لیے عذاب دوزخ سے زیادہ وحشتناک تھی۔"

[illegible] کا حق رکھنے والوں کو گونگوں کا شہر بنا دیا [illegible] اپنے شہر پر [illegible] لگائی۔ ڈھاکہ کے [illegible] ہوا ہے۔ جب بھی [illegible] رگوں میں خون کے بجائے [illegible] سامنے [illegible] اسے کہا [illegible] تو میری ماں شہید ہوئی [illegible] میری ماں کا عزم تھا [illegible] قومی زبان [illegible] پر موجود ہے۔ میں اپنے [illegible] جب تک زندہ رہوں گا [illegible] اردو بولنے والے کو زندہ نہیں [illegible] گا۔"

وہ [illegible] سنانے لگا۔ عظمیٰ نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

[illegible] ہوئے کہا۔ "کوئی [illegible]"

[illegible] مجھے تو [illegible] لیے آئے گا۔"

[illegible] بول [illegible]

[illegible] نہیں ہے، کوئی نہیں بول رہا ہے۔"

[illegible] حالات سازگار نہیں تھے۔ کوارٹر کے سامنے [illegible] بلب کی روشنی میں ایک کتا بھونکتا ہوا نظر آیا۔ عظمیٰ اور منعم باللہ کی آہٹ سنتے ہی وہ ان کی طرف پلٹ کر بھونکنے لگا۔ منعم باللہ نے کہا: "دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ بول رہا ہے کوئی اپنی خبیث زبان بول رہا ہے!"

یہ کہتے ہی اس نے بندوق سے گولی مار دی۔ عظمیٰ نے اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ لیے، آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ کتا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے عظمیٰ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "طوطا پالنے والے اپنی ہی زبان سے سکھاتے ہیں۔ تم میری مینا ہو، میں تمھیں اپنی زبان سکھا رہا ہوں جس دن تم کتوں کی زبان میں بولو گی وہ تمھاری زندگی کا آخری دن ہو گا!"

وہ اس کی گرفت میں سہمی رہی۔ گرچہ اس نے محبت سے گرفت میں لیا تھا۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ اس کی [illegible] کا تجزیہ کرتی رہی۔ پتا چلا کہ اس نے منعم باللہ کو قبول کیا تھا۔ لیکن یہ قبولیت ایسی ہی تھی، جیسے [illegible] قتل کرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوچھی ہو، بتاؤ، تم تلوار سے [illegible] ایک وار سے زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ [illegible] مرے گی [illegible] زندہ تو رہے گی۔

اور وہ زندہ تھی۔ [illegible] والے شوہروں کے ساتھ [illegible] لیکن ان کے سامنے [illegible]

[illegible] باندھتی رہتی تھی۔

لیکن کوئی کب تک بند سے کسی سیلاب کا راستہ روک سکتا ہے۔ راستہ روک بھی لے تو پانی اپنے [illegible] دوسرا راستہ بنا لیتا ہے۔ [illegible]

زبان میں اپنی ماں کو پکارتا ہے۔ آدمی خواب کی حالت میں یا نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنی ہی زبان میں بڑبڑاتا ہے۔ یہ بنگالیوں اور بہاریوں کی دو مختلف نفسیاتی اور لسانی حقیقتیں ہیں۔ بنگالی کسی حیرت کے مقام پر یا کسی دہشت کے زیر اثر ماں کو پکارتے ہیں "او ماگو" اور بہاری باپ کو آواز دیتے ہیں۔ ایسے کسی موقع پر بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا ہے: "باپ رے!"

یہ اپنی اپنی مادری زبان کی ایسی اٹل سچائیاں ہیں جنہیں بے اختیار زبان پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک رات منعم باللہ کوارٹر میں نہیں آیا۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب آیا۔ کہنے لگا: "اپنی اٹیچی اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ ہم رنگ پور جا رہے ہیں۔"

مغلی نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھلا انکار کب سننے والا تھا اگر اسے چھوڑ بھی دیتا تو وہ کس کے رحم و کرم پر رہتی۔ اس نے اٹیچی میں زیورات، نقد روپے اور اپنے کپڑے رکھ لیے۔ وہ لوٹ کا مال اس کے ہاتھوں میں لا کر یوں رکھتا تھا جیسے شوہر اپنی بیوی کے ہاتھوں میں اپنی کمائی لا کر دیتا ہے۔

وہ شام کو پاربتی پور پہنچ گئے۔ ادھر مکتی باہنی کے جوانوں نے بتایا کہ ایک ریلوے ٹرالی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس ٹرالی میں وہ رنگ پور جائیں گے۔ اس سے پہلے وہ پاربتی پور کی ایک مالدار آسامی کو لوٹنے کے لیے گئے۔ اس نے مغلی کو ریلوے کے ایک خالی بنگلے میں چھوڑ دیا۔ اسے تاکید کی 'دروازے اور کھڑکیاں باہر سے بند رکھے جب تک وہ آواز نہ دے دروازہ نہ کھولے۔

ایک گھنٹے بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اس کے ساتھی لوٹ کا بہت سا مال اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے کہا: "یہ اٹیچی دروازے پر رکھ دو اور تم لوگ چلے جاؤ۔"

ایک نے کہا: "منعم دادا! جب تک ٹرالی نہیں آئے گی ہم سب اسی بنگلے میں جشن منائیں گے۔"

اس نے سختی سے کہا۔ "نہیں! میں یہاں گھر والی کے ساتھ ہوں جہاں کوئی شراب نہیں پیئے گا۔ کوئی شور نہیں مچائے گا۔ تم لوگ دوسرے بنگلے میں چلے جاؤ۔"

وہ بند دروازے کے پیچھے سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے اپنی گھر والی کہا ہے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چرمی بیگ تھا دوسرے میں شراب کی بوتل تھی۔ اس نے بیگ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "اسے کھول کر دیکھو۔ کچھ زیورات اور نقد روپے ہیں۔"

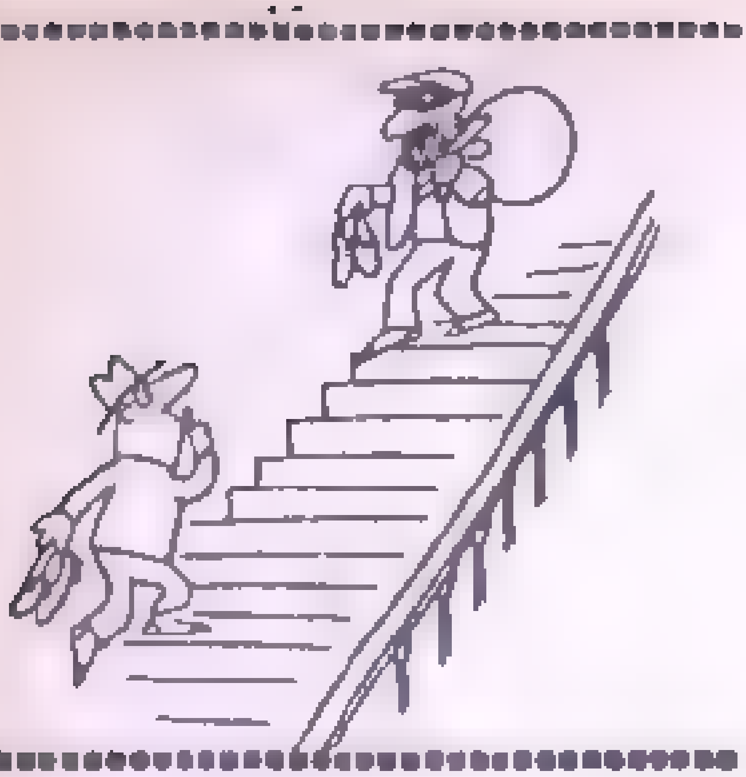

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پہلے اس کے لیے ایک جگ پانی اور گلاس لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ بیٹھ کر شراب پیئے گا اور خوب ہنستا بولتا رہے گا۔ جب نشہ بڑھے گا تو اس کی محبت کی قسمیں کھاتا رہے گا جب اور زیادہ مدہوش ہو جائے گا تو اس کے قدموں میں سر رکھ کر اسے اپنی جان اور ایمان کہتا رہے گا۔

وہ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ مغلی نے چرمی بیگ کو کھول کر دیکھا پھر بے دلی سے زیورات اٹھا کر اٹیچی میں رکھ دیے۔ اب سے اتنے زیورات پہننے کو ملتے تھے کہ پہننے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ منعم باللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا پھر پی کر خمار چڑھنے لگا۔ خوب ہنسنے بولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب نشہ ہونے لگا تو اس نے کہا: "چلو، اٹھو جو بہترین ساڑی اور زیورات ہیں انہیں پہن کر میرے سامنے آؤ۔ میں تمہیں سندر، ایک سندر، دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر اٹیچی کے پاس گئی پھر لباس بدلنے لگی۔ اس نے زیورات پہنے۔ کنگھی چوٹی کی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ خوب بن سنور کر جب اس کے سامنے آئی تو وہ نشے میں جھوم سا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔ مگر ڈگمگا گیا۔ میز اور کرسی کو تھام کر سنبھل گیا۔ پھر وہ آگے بڑھا تو مغلی نے اسے سہارا دیا۔ وہ اسے تھام کر رقص کرنے لگا اپنی بے سُری آواز میں گنگنانے لگا۔ مغلی ہنس رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا ایسے وقت وہ اس کی مرضی کے مطابق اسے خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

رقص، جو نغمہ ہو مترنم ہنسی کانوں میں پائل کی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہو تو نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ پیتا

جا رہا تھا اور اس کے ساتھ مستی میں جھومتا جا رہا تھا جو کہ وہ مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مسرتوں کے یا جذبوں کے ہجوم میں عظمیٰ کی زبان سے اپنی مادری زبان کے الفاظ ادا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ضبط کر لیتی تھی۔ اپنے اندر سے اٹھنے والے طوفان کو روکنے کی مشق ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ مدہوش ہو کر گر پڑا تو اس نے آواز دی: "منعم! کیا باہر نہیں جاؤ گے؟ کچھ کھانے کے لیے نہیں لاؤ گے؟"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ چپ چاپ پڑا رہا۔ عظمیٰ نے اسے جھنجھوڑا تو اس کے حلق سے آواز نکلی۔ وہ نشے کی حالت میں ذرا سا ابھر آیا۔ پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی باچھوں سے بل بل سی رال اور شراب بہہ رہی تھی۔ عظمیٰ نے اطمینان کی سانس لی ـــ اور اپنے زیورات ایک ایک کر کے اتار کر انھیں بستر پر پھینکتی گئی۔ جب زیورات کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

سویا ہوا آدمی نصف مردہ ہوتا ہے۔ اگر وہ مدہوش ہو تو نصف سے زیادہ مردہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ جب وہ موجود نہیں رہتا تھا تو وہ اس کی تصویر کے پاس جاتی تھی ـــ کانوں میں آہستہ سے اردو میں کہتی تھی: "مجھے تم سے محبت ہے۔"

اس وقت وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی: "بنگلہ بھاشا میں بڑی وسعت ہے۔ ہر جذبے کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ موجود ہیں لیکن مجھے بنگلہ زبان پر عبور حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی بے چین ہو جاتی ہوں۔ جو کہنا چاہتی ہوں، وہ کہہ نہیں پاتی۔ خدا کا شکر ہے! اس وقت تم مدہوش ہو۔ تم سن نہیں سکتے لیکن میں بول کر اپنے جذبوں کی تسکین تو کر سکتی ہوں۔ اردو میں بول رہی ہوں۔ تمھارے کانوں میں میری آواز اتر رہی ہے تم سمجھو یا نہ سمجھو میرے محبوب!"

وہ پھر [illegible] ہی تھی لیکن [illegible] وقت [illegible] کی [illegible] کے ساتھ وہ ذرا سا کسمسایا پھر اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ عظمیٰ نے سر اٹھایا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

تصور کے سامنے کچھ [illegible] جانا دوسری بات ہے مگر وہ [illegible] تھا مدہوش تھا [illegible] کے دماغ میں [illegible] تھے [illegible] تھے [illegible] عظمیٰ [illegible] چاروں شانے چت [illegible] اس کے تیور دیکھ کر پہلے تو سہم گئی۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ وہ بھی جبراً ہنسنے لگی۔ اس نے کہا: "تم نے کتنی میٹھی زبان میں کچھ کہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا کبھی جھومنے والوں کی بات سمجھ میں آتی ہے؟"

وہ دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ منعم باللہ نے محبت سے اس کے سر کو سہلا کر کہا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تمھاری زبان میں بڑی مٹھاس ہے۔ تومی روشوگلا موتن مشتی۔ تم رس گلے کی طرح میٹھی ہو ـــــــ ذرا اپنی زبان دکھاؤ۔"

جیسے مریض ڈاکٹر کو اپنی زبان نکال کر دکھاتا ہے۔ اسی طرح اس نے دکھائی۔ وہ اس پر جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس آسیب زدہ عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے دانت نظر آئے۔ دانتوں کی ایک قطار اوپر تھی دوسری قطار نیچے۔ پھر ایک گاجر ان دانتوں کے درمیان آئی۔ ان دانتوں نے کچکچا کر اسے کاٹ لیا۔ کچ کی آواز کے ساتھ گاجر کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا ایک ننھا سا ٹکڑا منہ میں رہا ہوگا۔ باقی گاجر باہر رہ گئی۔

عظمیٰ کے حلق سے پھر ایک چیخ نکلی۔ گڑبڑ گڑبڑ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا: "ہائے اڈا امیں مرگئی (ہائے اللہ میں مر گئی)!"

انقلاب کے دنوں میں تہذیب ہر لمحہ مرتی ہے مگر بے شرم کی طرح زندہ رہتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، نسانی زبان، انسانی ثقافت گڑبڑ گڑبڑ۔

تہذیب کی کھوکھلی ہانڈی میں نفرت کے کنکر ڈال کر ہلایا جائے تو ہانڈی سے ایسی ہی آواز نکلتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ۔

منعم باللہ نے نشے میں مدہوش ہونے کے باوجود محسوس کیا کہ اس کے منہ کے اندر کوئی ننھی سی چیز تڑپ رہی ہے۔ اس نے تھوک کے اسے تھوک دیا۔ ننھی سی کٹی ہوئی زبان فرش پر گر کر ادھر ادھر تڑپنے اور پھدکنے لگی۔ جیسے زندہ جسم کا کوئی حصہ کٹنے کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے مردہ نہیں ہوتا۔ مچھلی کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ زبان تڑپ رہی تھی۔ اپنے مالک کو تلاش کر رہی تھی جیسے پوچھ رہی تھی۔ کہاں جاؤں؟

[illegible]
[illegible]
[illegible]

اتان [illegible] سے ملا ہوا [illegible] سے [illegible] پہنچنے والی تیز میل [illegible] ان دنوں گاڑیاں عموماً ساڑھے تین گھنٹے [illegible] لیٹ ہو جایا کرتی تھیں [illegible] گاڑی [illegible] سیٹھ دھرم [illegible] تھی۔ [illegible] پلیٹ فارم پر [illegible] ہوئے تھے۔ ایک بدمعاش نے دوڑتے ہوئے آ کر کہا "سیٹھ جی! آپ کا وہ ہیرا آ گیا ہے میں نے ابھی [illegible] سامنے آتے دیکھا ہے۔"

سیٹھ دھرم چند تیزی سے چلتا ہوا اسٹیشن کے پیچھے آیا۔ ہیرا [illegible] کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اسی کی طرف آ رہا تھا۔ سیٹھ نے پوچھا "کیا ہوا؟ وہ ناچ والا ویلن تمہارے ہی ہاتھوں میں رہے گا نا؟"

"ہاں اب تو وہ اپنا ہی ہے لیکن وہ [illegible] ابھی تک بے ہوش ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے دھرم چند نے آہستگی سے کہا [illegible] ہوش [illegible] میں تمہیں نہیں خسرو کو دیکھا ہے اس کا [illegible] کے مطابق ہو گا۔"

وہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ہیرا نے دیکھا [illegible] ڈاؤن

ہو جاتی تھی، نہ جانے کس وقت بھی پہنچنے والی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر کہا: "پتا نہیں کیوں بشش کے سامنے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے اس نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی۔ مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" دھرم چند نے پوچھا۔

ہریا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں پر پھیرا، پھر [illegible] ہاتھوں کو پیچھے [illegible] ہوئے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "میں نے سنا ہے، عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔"

دھرم چند نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا: "تم تو بہت ہی بزدل نکلے۔ بشش وہ عورت ہے [illegible] کہ اندھیرے میں دیکھے بغیر چھو کر پہچان سکے؟"

ہریا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا: "اندھے بھی چھو کر پہچان لیتے ہیں۔"

"اندھے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں زندگی [illegible] ساری [illegible] میں گزری ہے [illegible] روشنی میں [illegible]"

"تم یہ مال گونا بنا رہا تھا، جیسے منہ سے ایک ذرا [illegible] نہیں نکل رہی تھی۔"

[illegible] ابھی وہ مال ہمارے ہاتھ میں آئے گا اور ہماری چاندی ہی چاندی ہوگی۔"

"جب مال ہمارے ہاتھ میں آ رہا ہے تو ضرور چاندی ہوگی [illegible] میں آ جائے گی۔ میں تو بھی تک وہاں انتظار کرتا [illegible] پتا نہیں چلتا کب بے ہوش ہو [illegible]"

اس کی باتوں کے دوران گاڑی آ گئی۔ وہ لوگ فرسٹ [illegible] کے جانے سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے پھر [illegible] نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ پہنچ جائیں گے۔"

[illegible] ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے ہریا سے کہا: ساری قیمت ادا کرتی تھی۔ تمہارے تو مزے ہی رہے۔ تمہارے جیب بھی تمہارے ہاتھوں سے زیادہ فروخت کرائیں گے۔ تم کچھ الٹ پھیر کر کے بڑی رقم بنا لو گے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا!"

ہریا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ تم رہو گے تو مجھے سہارا رہے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں آخری وقت تک اپنے لوگوں کا ساتھ دیتا ہوں۔ اب معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔"

اس وقت تک تلسی رام اپنے آدمیوں کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے اتر کر ان کے قریب چلا آیا۔ ہریا نے آگے بڑھ کر اس کے سامنے جھکتے ہوئے پرنام کیا۔ دھرم چند نے [illegible] مسکراتے ہوئے کہا: "آپ بڑے اچھے موقع پر آئے۔ اگر نہ آتے تو ہم آدمی بھیج کر آپ کو بلاتے۔"

تلسی رام انھیں نظر انداز کر کے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا: "خسرو کہاں ہے؟"

[illegible]

"[illegible] ہو گئے۔"

دھرم چند نے حیرانی سے پوچھا: "کیا کہہ رہے ہو؟ خسرو کہاں ہے؟"

[illegible]

"[illegible] میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں، مجھے زیادہ نہ الجھاؤ۔ [illegible]"

[illegible]

کے ساتھ ہو گئی تھی یعنی خسرو کے ساتھ دو راتیں تھیں۔ وہ اپنے محسن کے گھر میں ڈاکہ کیسے ڈال سکتا تھا۔ اسے سب کچھ سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

تمام باتیں سن لینے کے بعد اس نے پوچھا: "کیا ششی اب تک ہوش میں نہیں آئی ہے؟"

"نہیں، داروغہ اس کا بیان لینے کے انتظار میں ہے۔ وہ بیان دے گی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

دھرم چند نے کہا: "ارے کیا دودھ اور کیا پانی۔ کیا اتنے سارے ثبوت کافی نہیں ہیں۔ خسرو نے جس مائی کے مکان پر اپنے غنڈوں کے ساتھ قبضہ کیا تھا۔ وہ مائی اس بات کی گواہ ہے کہ وہاں کیا ہوتا رہا۔ اس نے ششی کو وہاں باندھ کر رکھا تھا۔ اس کے غنڈے پہرہ دے رہے تھے۔"

"یہ کیسے پتا چلا کہ خسرو ششی کو مائی پاڑے لے گیا ہے؟"

"جس کے مکان میں لے گیا تھا۔ وہی مائی میرے نوکر کی جاننے والی ہے۔ اس نے میرے نوکر کو بتایا اور اس نوکر نے مجھے بتایا۔ پھر میں نے اور ہریا نے اپنے غنڈوں کو جمع کیا تاکہ کوئی لڑائی جھگڑے والی بات ہو تو ہمارے علاوہ کچھ معزز لوگ گواہی دے سکیں۔ ہمارے علاقے کے بہت سے ہندو مسلمان اس بات کے گواہ ہیں۔ سب نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو مائی پاڑہ کے اس مکان میں دیکھا ہے۔ وہیں سے ہم انہیں پکڑ کر تمہارے گھر پہنچے تھے۔ ششی تو تمہارے گھر میں ہے۔ خسرو اور اس کے ساتھیوں کو شیر بلڈنگ میں رکھا گیا ہے۔ جب تک ششی بیان نہیں دے گی۔ پولیس ان کی نگرانی کرتی رہے گی۔"

تلسی رام وہاں سے اٹھ کر باہر آیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ماتحت سے کہا: "تم ویگن کا خیال رکھو۔ آج شام تک اس کا سارا مال گودام میں پہنچا دو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

وہ تیز تیز چلتا ہوا اسٹیشن کے باہر آیا۔ ہریا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کبھی دوڑ رہا تھا۔ دھرم چند کب پیچھے رہنے والا تھا۔ وہ تو خسرو کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ یا پھر ذلیل کر کے شہر سے نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ سب مختلف سائیکل رکشا میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

تلسی رام کی عجیب حالت تھی۔ وہ کبھی رکشا کی سیٹ پر پہلو بدلتا تھا۔ کبھی رکشا والے کو ڈانٹ کر کہتا تھا: "تیز چلاؤ اور تیز چلاؤ۔" وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ ششی کی زبان سے سچی باتیں سننا چاہتا تھا۔ ویسے دھرم چند اور ہریا نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ خسرو نے غداری کی ہے۔ اپنے لوگ (ہندو) ٹھیک کہتے ہیں کہ مسلمان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے ہر مذہب کے اپنے لوگ یہی کہتے ہیں۔ پرائے مذہب والوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور جب کسی کا داؤ چل جاتا ہے تو سبھی غداری کرتے ہیں یعنی اعتماد کو دھوکا دیتے ہیں۔

اس لمحہ غصے کی آگ میں جلنے والا تلسی رام اگروال بھول گیا کہ کلکتے سے آتے وقت ایک مسلمان نے اس پر اعتماد کیا تھا۔ لیکن اس نے نین تارا کو جن نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے بھی غداری ہی کہا جائے گا۔ اس نے بھی خسرو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس وقت تلسی رام یہ سب کچھ بھول رہا تھا۔ اپنی آگ میں جلتے وقت سبھی بھول جاتے ہیں کہ چور، ڈاکو اور لٹیرے ہم مذہب بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مذہب کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ششی کا مجرم ہریا تھا تو اس سے صرف تلسی رام کے گھر والوں کی ناک کٹے گی اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ گناہ خسرو نے کیا ہے تو محض ایک گھرانے کی نہیں بلکہ پورے دھرم کی ناک کٹ جائے گی۔ پتا نہیں، اپنے گناہ کے وقت دھرم اور ایمان کی ناک کیسے سلامت رہ جاتی ہے؟

جب اس کا رکشا مارواڑی پٹی سے گزر رہا تھا تو دونوں طرف کے مکانوں اور دکانوں سے تلسی رام کی ذات برادری والے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں کہ مسلمان کو اور اپنے ہاں پناہ دو۔ اب تم کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہے۔

وہ بیچارہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ کسی سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ رکشے پر بیٹھا ہوا گھر پہنچا تو گھر کے سامنے بھی رکشے پر ہی بیٹھا رہ گیا۔ اتر کر اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ اپنی بیوی بیٹی سے کیسے نظریں ملائے گا یا وہ بیچاری نظریں نہیں ملا سکے گی۔

شانتا نے سر پر آنچل رکھتے ہوئے برآمدے میں آ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر سر جھکاتے ہوئے کہا: "اندر آ جائیے نا۔"

وہ رکشا میں بیٹھا گھور کر اپنی دھرم پتنی کو دیکھتا رہا۔ شانتا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہا: "یہ گھر پہلے ہی تماشا بن گیا ہے۔ آپ وہاں بیٹھ کر غصہ دکھائیں گے تو ہم اور زیادہ تماشا بن جائیں گے۔"

تلسی رام نے سخت لہجے میں پوچھا: "ششی کیسی ہے؟"

"ابھی ابھی اس نے آنکھ کھولی ہے۔ مگر کچھ بولتی نہیں ہے۔"

"اسے بولنے کے لیے کہو۔ کمزور ہو گی۔ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ہریا! تم ڈاکٹر کو بلا کر لے آؤ۔ داروغہ کو خبر دو۔ وہ ابھی آ کر اس کا بیان لے گا۔"

ششی کے ہوش میں آنے کی خبر ذرا سی دیر میں دور دور

تک پہنچ گئی۔ تلسی رام کے مکان کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی لیکن کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بیٹھک میں داروغہ کے ساتھ چار سپاہی تھے۔ ان کے علاوہ دھرم چند اور مارواڑی پنچ کے چند معمر رسیدہ معتبر لوگ بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر ششی کی نبض دیکھ کر وجے چند نے بیٹھک میں آکر کہا: انسپکٹر صاحب! آپ ششی کا بیان لے سکتے ہیں۔

ایک بزرگ نے کہا: بیان اس طرح لیا جائے کہ ہم سب سن سکیں۔

اس بزرگ کی تائید سب نے کی۔ ڈاکٹر نے کہا: وہ ابھی کمزور ہے۔ اس کا بستر سے اٹھنا مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی وہ اندر سے دل شکستہ ہے۔ اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا آپ یوں کریں کہ جہاں اس کا بستر ہے وہاں ایک کھڑکی ہے۔ آپ لوگ کھڑکی کے باہر چپ چاپ جا کر کھڑے ہو جائیں مگر اسے کسی کی موجودگی کا علم نہ ہو ورنہ وہ شرم کے مارے کچھ بول نہیں سکے گی۔

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور دبے قدموں جا کر اس کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ داروغہ اجازت لے کر ششی کے کمرے میں آیا۔ شانتا اس کے سرہانے بیٹھی اس کے سر کو سہلا رہی تھی۔ داروغہ نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا: بہن! ہم جانتے ہیں آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ اپنا بیان لکھوائیں۔ ہم اس بدمعاش کو ایسی سزا دیں گے کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہوگی۔

ششی نے لیٹے ہی لیٹے کروٹ بدلی۔ پھر شانتا بھابی کی گود میں منہ چھپا کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی: نہیں نہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔

شانتا نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا: اگر تم بدمعاش کا نام نہیں بتاؤ گی تو اسے سزا کیسے ملے گی؟

وہ روتے ہوئے بولی: کیا اسے سزا دینے سے میں [illegible] عزت ہو جاؤں گی۔

شانتا نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا: [illegible] سے نکلی ہوئی بات اور گھر سے نکلی ہوئی عورت کبھی [illegible]

[illegible]

وہ چپ رہی اور انکار میں سر ہلاتی رہی۔ [illegible]

[illegible]

آپ باہر چلے جائیں۔ ہماری ششی کسی کے سامنے کچھ نہیں بولے گی۔ یہ صرف اپنی بھابی کو بتائے گی۔

داروغہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا پھر کھڑکی کے باہر آکر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ شانتا بڑے پیار سے ششی کو بہلانے لگی۔ اسے بیان دینے پر مجبور کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ششی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: بھابی! میں مندر گئی تھی پوجا کر رہی تھی کہ کسی نے اچانک پیچھے سے آکر میرے منہ اور ناک پر کپڑا رکھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر چھڑا نہ سکی پتا نہیں اس میں کیسی بو آرہی تھی۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک خالی کمرے میں بندھی پڑی تھی۔

شانتا نے پوچھا: وہاں تم نے کس کو دیکھا؟

پہلے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ دوسرے کمرے سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ جب تک خسرو یہاں نہیں آئے گا۔ ہم پہرہ دیتے رہیں گے۔

دوسرے نے کہا: پہرہ دینا ہی ہوگا۔ وہ ہمیں منہ مانگی رقم دے رہا ہے۔

تیسرے نے کہا: رقم تو وہ دے گا لیکن ششی کو اغوا کرانے سے پہلے اس نے ہم سب کو چاول کی دو دو بوریاں دی ہیں یہاں پیسے سے زیادہ چاول ملتا ہے۔

ایک اور نے ہنستے ہوئے کہا: یہ خسرو بھی کمال کا آدمی ہے تلسی رام کا چاول لا کر بیچ رہا ہے اور اسی کے عوض اس کی عزت کو پامال کر رہا ہے۔

ایسا کہتے ہوئے ششی رونے لگی۔ شانتا نے اسے تھپکتے ہوئے کہا: صبر کرو ششی۔ مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا۔ کیا تم نے خسرو کو وہاں دیکھا۔

ہاں دیکھا۔ جانے کتنی رات ہو گئی تھی۔ [illegible] آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا [illegible] رات کو خسرو کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی [illegible] پھر معلوم ہوا کہ میرے کمرے کا دروازہ اندھیرے میں کھلا [illegible] کسی نے ٹارچ روشن کی تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں [illegible] دیکھا۔ وہ نشے میں چور تھا دروازے کا سہارا لیے ہوئے [illegible]

[illegible]

نے محسوس کیا کہ وہ خسرو نہیں ہے۔"

شانتا اور دوسرے تمام سننے والے چونک گئے۔ شانتا نے پوچھا: "تم نے کیسے سمجھا کہ وہ خسرو نہیں ہے؟"

"بھابی! جب میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اس سے کھڑا نہیں ہو جا رہا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ کے سہارے کھڑا ہوا تھا لیکن وہ بدمعاش نشے میں نہیں تھا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سننے والوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ کچھ بزرگوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ششی کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ ہریا گھبرا کر ان کے بیچ سے نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ادھر شانتا نے کہا: "دیکھو ششی! خوب سوچ سمجھ کر بتاؤ وہ کون ہو سکتا ہے؟"

وہ رو رہی تھی۔ شانتا نے کہا: "میں مانتی ہوں۔ وہاں بہت اندھیرا ہوگا۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہوگا لیکن جہاں تم نے اتنی بات سمجھ لی کہ وہ خسرو نہیں کوئی اور ظالم تھا تو اس ظالم کا کچھ نام نشان بتائیے۔

اچانک ششی نے چیخ کر کہا: "ہاں! میں اس کا نام لے سکتی ہوں۔ میں نے اچھی طرح پہچان لی تھی۔ یہ سچ ہے کہ پاپ اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں مگر کچھ پاپی ایسے ہوتے ہیں جو اندھیرے میں بھی چھپنے نہیں پاتے۔ میں نے گھور اندھیرے کے باوجود اس کے انگوٹھے سے ملی ہوئی ایک انگلی کو محسوس کیا اور سمجھ گئی کہ اس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں۔"

یہ سنتے ہی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے سب کے سب ہریا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ انہیں دیکھ کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے دیوار سے جا کر لگ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ یوں اوپر اٹھے تھے جیسے کوئی اس کے سامنے ریوالور تان کر ہینڈز اپ کرنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ اس کے اٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ سب انہیں پھٹ پھٹ کر دیکھ رہے تھے چھ انگلیاں تھیں۔

لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انگوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹی سی انگلی جڑی ہوئی تھی جو پیدائش کے وقت سے اس انگوٹھے کے ساتھ تھی۔ وہ چھٹی انگلی بے جان تھی۔ کسی کام میں نہیں آتی تھی۔ ایسے کئی لوگ ہیں جن کے زندہ جسموں پر کہیں کہیں فاضل گوشت ہوتا ہے جو بے حس ہوتا ہے۔ بالکل مردہ ہوتا ہے۔ وہ مردہ گوشت زندہ جسم کے کسی کام نہیں آتا۔ اسی طرح وہ چھٹی انگلی ہریا کے کسی کام نہیں آتی لیکن یہ خدا کی قدرت ہے کہ وہی انگلی خسرو کے کام آ گئی۔

ششی کا بیان سنتے ہی شانتا نفرت اور غصے کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، ابھی اپنے بھائی کا گلا دبوچ لے۔ وہ ششی کے پاس سے اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے سے گزرتے ہوئے تلسی رام کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے پتی کے پاس ایک پستول اور ایک رائفل کا لائسنس تھا۔ وہ پستول کو اپنے پاس میں چھپا کر رکھتا تھا۔ رائفل بستر کے سرہانے والی دیوار سے لٹکی رہتی تھی۔ شانتا نے بستر پر چڑھ کر رائفل کو اتار لیا۔ پیٹی سے دو کارتوس نکال کر اس میں لوڈ کیے پھر اسے لے کر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے کے باہر آ گئی۔

بیٹھک میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ سمجھا رہا تھا۔ تلسی رام غصے کی حالت میں ہریا کی پٹائی کر رہا تھا کچھ لوگ اسے چھڑا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "مارنے سے بات نہیں بنے گی پہلے معلوم تو ہو کہ یہ سب کیوں ہوا؟"

ایک نے کہا: "بات صاف ہے۔ یہ اپنے گھر میں خسرو کی برتری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے جیجا جی نے سارا کاروبار خسرو کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس لیے یہ اس کا پتا کاٹنا چاہتا تھا۔"

ایک بوڑھے نے غصے سے کہا: "ایک مسلمان کا پتا کاٹنے کے لیے کیا اپنے ہی دھرم کو بے عزت کرنا ضروری تھا؟"

تلسی رام نے ہریا کو چھڑی سے مارتے ہوئے کہا: "میں اسے اور اس کی بہن کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں کو جان سے مار ڈالوں گا یا لات جوتے مار کر گھر سے نکال دوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فضا میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ آواز ایسی تھی کہ سب کو اپنی موت نظر آئی۔ سب سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے مختلف دیواروں کی طرف سمٹنے لگے۔ کوئی کرسی کی آڑ میں بیٹھ گیا کوئی لکڑی کے تخت کے نیچے چھپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ شانتا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دروازے پر کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس کا رخ ہریا اور تلسی رام کی طرف تھا۔ وہ غصے اور جنون کی حالت میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ [illegible] میں کہہ رہی تھی: "آپ نہ تو مجھے ذلیل کر کے گھر سے [illegible] گے اور نہ مار سکیں گے۔ میرا بھائی آپ کا مجرم ہے [illegible] مجرم ہے۔ جہاں میرا سہاگ آخری سانس تک [illegible] ایک گھر میں اس سے گندا [illegible] یہاں [illegible] تو محفوظ نہیں

میں مل سکوں [illegible] مجھ سے نکل کر خسرو کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔ بات یہ ہے کہ وہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ وہ مجھے بڑی بہن کہتا ہے [illegible] سمجھ کر میرے سامنے جھکتا رہا۔ آج وہ زخموں سے چور ہو کر [illegible] دروازے کے پاس آیا لیکن میں نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔ [illegible] بیٹے کے مقدس رشتوں کے درمیان [illegible] عدالت [illegible] شک و شبے کی دیوار کھڑی کی۔ [illegible] کمینے نے جو میرا ماں جایا ہے۔

داروغہ رائفل سے دور سہما کھڑا تھا۔ وہیں سے ہاتھ اٹھا کر بولا: دیوی جی! آپ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ رائفل مجھے دے دیں۔ ہم ہریا کو بہت سخت سزا دلا کے جیل بھجوا دیں گے۔

"آپ اسے کتنی سزا دلا سکتے ہیں۔ عورت کی عزت واپس نہیں آتی۔ مگر یہ جیل جا کر واپس آ جائے گا۔"

"لیکن [illegible] عزت لوٹنے والے کو موت کی سزا تو نہیں دی جا سکتی۔"

"اور اگر خسرو مجرم ثابت ہوتا تو ابھی تم سب مل کر اسے جان سے مار ڈالتے۔ اسے موت کی سزا ہو جاتی۔"

"یہ لوگ ایسا کرتے لیکن قانون ایسا نہ کرتا۔"

"تو میں قانون سے التجا کرتی ہوں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ میں اپنے مجرم سے نمٹ لوں گی۔ جو سزا خسرو کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ اب وہی ہریا کو ملے گی۔"

کچھ لوگ ہریا کے سامنے ڈھال بن گئے۔ ایک نے کہا۔ "معاف [illegible] آپ [illegible] پر گولی چلائیں گی تو پہلے ہم لوگوں [illegible] ہم بے قصور مارے جائیں گے۔"

شانتا نے رائفل کے کندے کو زمین پر ٹیک دیا۔ اس کی نال اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اس نال کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے لگایا۔ ٹریگر پر انگوٹھا رکھ کر کہا [illegible] میری طرف کوئی نہ آئے۔ [illegible] سامنے نہ آیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔

تلسی [illegible] پھینک دو۔"

وہ بولی: "آپ میرے پتی دیو ہیں۔ آپ کی خواہش ہے [illegible] آپ سے کبھی نہیں مل سکوں [illegible] عیب شبہ ہے۔"

"نہیں شانتا! [illegible] وہ بولی۔ ہم دونوں خسرو کے پاس جائیں گے۔ [illegible] معافی مانگیں گے۔ [illegible]

[illegible] مجھ سے [illegible] اب میں

ہریا کو سزا دوں گا۔ تمہیں اسے قتل کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔ میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ میری پتنی قتل کے الزام میں عدالت تک جائے۔ رائفل پھینک دو۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

وہ چیخ کر بولی: "نہیں! آپ ایک قدم بھی میری طرف بڑھائیں گے تو میں جان دے دوں گی۔"

"یہ کیا حماقت ہے؟"

شانتا نے [illegible] کیا: "ایک"

سب لوگ دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ ان سے صرف دو قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی بھی اس کی طرف جھپٹ [illegible] سکتا تھا [illegible] سے پہلے اس کا انگوٹھا ٹریگر پر دب جاتا۔

تلسی رام نے کہا: "خودکشی نہ کرو۔ اپنے بھائی کے گناہ کی سزا اپنے آپ کو نہ دو۔ شانتی کے معاملے میں تم اکیلی قصور وار نہیں ہو۔ جس کا قصور ہے، میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

شانتا نے اس کی بات ان سنی کر دی پھر اونچی آواز میں کہا: "دو۔۔۔"

اب وہ کسی لمحے بھی تین کہہ سکتی تھی اور وہ اس کی زندگی کی آخری گھڑی ہوتی۔ اس سے پہلے ہی باہر سے خسرو کی آواز سنائی دی: "دیدی! بڑی دیدی! میں آ گیا ہوں۔ آپ آتم ہتھیا کر رہی ہیں [illegible] دیدی! نہیں۔ خودکشی بہت بڑا پاپ ہے۔ آپ اپنی جان کی دشمن نہیں بن سکتیں۔"

شانتا نے کہا: "آہ خسرو! میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"دیدی! آپ نے مجھے زخموں سے چور دیکھا لیکن میرے [illegible] ہاتھ رکھا [illegible] میرے زخموں کی پروا کی۔ مجھے گھر کے دروازے سے لوٹا دیا۔ اب میں اس بات کا حق [illegible] اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر میں کیا؟ آپ [illegible] معاف نہیں کروں گا۔"

تلسی رام نے کہا: "اگر تم [illegible] تو میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ تمہاری آتما بھٹکتی رہے گی۔"

شانتی کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے [illegible] سے کہہ رہی تھی: "بھابی! آپ [illegible] پھینک دیں [illegible] آپ نے اپنی جان دی تو میں بھی آپ کو معاف نہیں کروں گی۔"

رائفل پر شانتا کا انگوٹھا رکھا ہوا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے رائفل کی نال تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر کی آوازیں سن رہی تھی اور اس حقیقت کو سمجھ رہی تھی کہ زمین کے

لیے جان دے رہی ہے دیدی اگر اس دنیا میں اسے معاف نہیں کریں گے تو دوسری دنیا میں بھگوان بھی اسے معاف نہیں کریں گے۔

ان باتوں کے دوران خسرو اندر چلا آیا۔ دیدی سے اس کی نظریں ملیں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "ٹھہر جائیے دیدی! جان دینے سے پہلے میری ایک بات کا جواب دیجیے جب انسان کو خوشی ملتی ہے تو وہ جشن مناتا ہے یا جان دیتا ہے؟"

"تمہاری بکواس کا کیا جواب دوں؟ کیسی خوشی ملی ہے؟ کیا مجھے؟"

"ہاں آپ کو، ذرا سوچیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کا یہ مظلوم بھائی بہت بڑے الزام سے بری ہو گیا ہے۔"

"میں تم پر فخر کرتی ہوں مگر تمہاری یہ بدنصیب بہن دو بھائیوں کے بیچ کھڑی ہے۔ منہ بولے بھائی نے بہن کا مان توڑ دیا اور ماں جائے نے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔"

"دیدی! آج آپ کی محبت کا امتحان ہے۔ آپ اپنے ماں جائے کے جھوٹ پر مرنا چاہتی ہیں یا منہ بولے بھائی کی سچائی پر فخر سے زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اس امتحان سے گزرتے ہوئے یہ یاد رکھیے۔ آپ کی موت سچائی سے انکار ہوگی۔"

وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ خسرو اسے باتوں اور نصیحتوں میں الجھاتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا جب دونوں کے درمیان گز بھر کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے اچانک ہی ایک قدم آگے بڑھ کر ریوالور کی نال پر زور کا ہاتھ مارا۔ وہ نال بڑھ دیدی کی ٹھوڑی سے ہٹ گئی لیکن جھٹکا کھاتے ہی انگوٹھا ٹریگر پر دب گیا تھا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی نکلی اور [illegible] دھواں سا [illegible] پڑ گئی۔ شائستہ کو یوں لگا جیسے گولی اس کے جسم کے آر پار ہو گئی ہو۔ وہ چکرا کر گرنے والی تھی خسرو نے فوراً ہی سنبھال لیا۔

* * *

۱۶ دسمبر کی رات سید پور کے [illegible] قیامت کی رات تھی [illegible] مضبوط قلعہ تھا۔ انتہا پسند [illegible] پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے [illegible] محفوظ تھا کہ وہاں فوجی چھاؤنی بھی [illegible] بہاری [illegible] خاموش تھے [illegible] انڈین آرمی [illegible] داخل ہو [illegible] بات [illegible] پہلی [illegible]

کے جوان ہوں گے۔ اب ان کے سامنے سید پور ایک کاغذی قلعہ ہوگا۔ وہ جس گلی میں جس گھر میں گھسنا چاہیں گے کوئی انہیں روک نہیں سکے گا۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے جہاں دولت ہوگی دولت سمیٹ کر لے جائیں گے اور جہاں عزت ہوگی عزت چھین کر لے جائیں گے اگر انڈین آرمی نے اس پر اعتراض کیا تو وہ بہاریوں کو مجرم ثابت کریں گے۔ ایسے لوگوں کی نشاندہی کریں گے جو کٹر پاکستانی ہیں ان پر الزام لگایا جائے گا کہ انہوں نے ہندوؤں کو اس شہر میں قتل کیا۔ ان کا مال و اسباب لوٹا۔ ان کی جائیداد پر قبضہ کیا اور بنگالیوں کو اس شہر سے جانے پر مجبور کر دیا۔

اور ان کے یہ الزامات غلط نہیں ہوں گے۔ سید پور کے بہاریوں میں ایک مجموعی خرابی تھی اور کئی انفرادی بدمعاشیاں تھیں۔ انفرادی بدمعاشیاں ہر قوم میں، ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ مثلاً غنڈے بدمعاش اپنے مفاد کی خاطر لوٹ مار کرتے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سید پور میں ہندوؤں اور بنگالیوں کا جو قتل عام ہوا۔ اس میں کسی بھی شریف اور پرامن بہاری کا ہاتھ نہیں تھا لیکن ان بہاریوں میں غنڈے اور بدمعاش بھی تھے جنہوں نے یہ خونی ناٹک کھیلا تھا یہ ان کی انفرادی بدمعاشیاں تھیں لیکن ان میں جو مجموعی خرابی تھی۔ وہ یہ کہ قیام پاکستان کے بعد سے انہوں نے ہمیشہ بنگالیوں کو

عورت

○ ایک پاک دامن اور حسین عورت اللہ تعالیٰ کی مکمل ترین صنعت ہے اس سے اس کی ملکوتی شان نمایاں ہوتی ہے وہ قدرت کا ایک معجزہ ہے اُسے عجائبات میں شمار کرنا چاہیے۔ عورت کی نگاہ میں ہمارے قانون سے زیادہ قوت ہے اور اس کے آنسوؤں میں ہماری دلیلوں سے زیادہ اثر ہے۔

(سیوین)

○ جب عورت کے دل میں رحم سما جاتا ہے تو پھر آسمان یا زمین میں عورت کے دل سے زیادہ اور کوئی چیز شفیق یا نرم نہیں ہوتی۔

(لوتھر)

○ عورت وہ روح ہے جس کا قالب اسرار سے بھرا ہوا ہے اور کوئی زبان اس کی [illegible]

○ عورت [illegible]

○ عورت [illegible]

(بالزاک)

○ [illegible]

اپنے سے کمتر سمجھا ہے۔ یہ حقیقت صرف سید پور کے بہاریوں سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے نہ تو کبھی اپنے بچوں کو بنگالی میڈیم سے تعلیم دلائی، نہ ہی بنگالی تہذیب کو برادرانہ جذبوں کے تحت رسمی طور پر ہی اپنانے کی ضرورت سمجھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج اورنگی کراچی کے لاکھوں بہاریوں میں بنگالی بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ضرور ملیں گے لیکن بنگالی پڑھنے اور لکھنے والے شاید دو یا چار فی صد ہوں۔ کسی کو بھی اس کی زبان اور تہذیب سے دور رہ کر کبھی دوست نہیں بنایا جاسکتا۔

۱۵ دسمبر کی وہ رات سید پور کے بہاریوں کو یہ عبرت ناک درس دے رہی تھی کہ چوبیس برس تک بنگالی زبان اور تہذیب سے دور رہ کر وہ کل صبح آنے والی انڈین آرمی کو اور خون کے پیاسے مکتی باہنی کے جوانوں کو کسی قیمت پر دوست نہیں بنا سکیں گے۔ اس رات لیڈر قسم کے لوگ سر جوڑ کر حالات پر غور کر رہے تھے۔ مذہبی رہنما اور سیاسی ورکر وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مشورے کرتے پھر رہے تھے۔ کسی نے کہا: "انڈین آرمی نیلفاماری کی طرف سے آئے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ سید پور میں داخل ہو، ہم نمائندہ قسم کے لوگ ان کا استقبال کرنے کے لیے شہر سے باہر چلیں اور انھیں خوش آمدید کہیں۔"

دوسرے نے کہا: "خوش آمدید کہنا گویا خوشامد کرنا ہے۔ وہ لوگ نادان نہیں ہو سکتے۔ خوشامدیوں کو خوب پہچانیں گے۔ ذرا عقل سے سوچو۔ مکتی باہنی کے جوان ان کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ ان کے سامنے ہم جیسے خوشامدی پھیکے ہیں۔ وہ ہماری ایک نہیں سنیں گے۔"

ایک نے کہا: "آج ہم ہر طرف سے نہتے ہیں۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ جن کے پاس ہتھیار تھے، انھوں نے بھی ایک طرف رکھ دیے۔"

ایک نے کہا: "آنے والے ہندو ہیں۔ ہم انھیں خدا رسول کا واسطہ نہیں دے سکتے۔"

"انسانیت کا واسطہ تو دے سکتے ہیں؟"

ایک نے جواب دیا: "مکتی باہنی کے جوان پوچھیں گے، ہمارا قتل عام کرتے وقت تمھاری انسانیت کہاں گئی تھی۔ جنگ، سیاست کا دستور ہے۔ جب کوئی کسی سے ڈرتا نہیں ہے تو اسے [illegible] دیا جاتا ہے لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

مختار گروپ کے ایک کارکن نے کہا: "ہمارے پاس ایسا ذریعہ ہے۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ [illegible] کہنے لگا: "ذرا [illegible]

دادا جان ہیں، جو کروڑوں کی جائداد کے مالک ہیں اور ان کے دم سے ہی کاروبار چلتا ہے۔ دادا کے کاروبار کو ان کا بیٹا چلاتا ہے اور بیٹے کا بیٹا اپنے باپ اور دادا کا محتاج ہے۔ جب بیٹے کو جیب خرچ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ باپ سے مانگتا ہے اور باپ اپنے باپ سے رقم طلب کرتا ہے۔ گویا کہ سب سے زیادہ اہمیت دادا کی ہوئی جس کے پاس دولت ہے۔ طاقت ہے اسی کی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش بنانے کے لیے بھارت سے مدد طلب کی گئی۔ بھارت نے روس کا تعاون حاصل کیا تو بتاؤ اہمیت کس کی ہوئی؟"

ایک مذہبی جماعت کے لیڈر نے اس کارکن کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا: "تم جیسے جوان چھوکرے روس کا دم بھرتے تھے۔ بڑے اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے تھے۔ دیکھو تمھارے روس نے کیا کیا؟"

اس نے کہا: "بڑے میاں! جل گئے مگر بل نہیں گئے۔ اب بھی سیاست کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ کون روس ہے اور کون امریکہ، کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ یہاں یہ سوچیے کہ پانچ لاکھ انسانوں کی جان کس طرح بچائی جائے؟"

ایک نے طنزیہ انداز میں کہا: "تم لوگ روس کے چمچے ہو۔ تمھی لوگ بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے مسکرا کر کہا: "ہاں، جب ہانڈی پک جاتی ہے تو چمچہ ہی کام آتا ہے۔ نہ کام آئے تو ہانڈی جل جاتی ہے۔ کچھ میں نہیں آتا۔ یہ لفظ چمچہ نفرت یا طنز کا سبب کیسے بن گیا؟ حالانکہ کسی چمچے سے بڑا اہم نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میلے ہوں یا چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکل آئی ہوں تو چمچہ ہی آپ کے حلق تک لقمہ پہنچاتا ہے۔"

کسی لیڈر نے کہا: "باتیں نہ بناؤ۔ کام کی بات کرو۔"

کارکن نے کہا: "ابھی کسی صاحب نے کہا تھا کہ مکتی باہنی کے جوان بھارتی فوج کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ یہ غلط ہے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے اس تاریخی اہم موڑ پر صرف بہاری کی بڑی اہمیت ہے۔"

بھاشانی گروپ کے ایک ممبر نے اٹھ کر کہا: "یہ مسلمانوں کے لیے بڑے ہی شرم کی بات ہے کہ مسلمان بہاری بھی ہیں اور بنگالی بھی۔ ان مسلمانوں نے مسجدوں میں گھس کر ایک دوسرے کو قتل کیا۔ کلام پاک کا واسطہ دیا گیا مگر کسی نے کسی کی نہیں سنی۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ بنگالی بھی ہیں، بہاری بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں۔ ایسے بدترین حالات میں بھی ہمارے درمیان کسی سے عداوت پیدا نہیں ہوئی۔ آج بھی یہاں کے بنگالی ہم بہاریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور ہم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا اور ان کا نظریہ ایک ہے۔ آپ کا نظریہ کئی حصوں سے [illegible] اس پر دوسرے نظریے کس طرح حاوی ہو گئے؟ یہ سوچنا [illegible] آپ کا کام ہے۔ ہم بھاشانی گروپ کے

لوگ بھی مسلمان ہیں لیکن ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے آج تک کسی بنگالی یا ہندو کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کوئی ہندو یا بنگالی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ مکتی باہنی کے جوان اپنے مقتول بنگالیوں کا خون معاف نہیں کریں گے۔ وہ یہاں آ کر انتقام لینے کے لیے بے چین ہوں گے لیکن انڈین آرمی کے افسران ہمیں نظر انداز نہیں کریں گے۔ مکتی باہنی کے جوانوں کو ہم قتل عام کا موقع نہیں دیں گے۔ ان کی انتقامی کارروائی محدود کر دیں گے۔ وہ لوگ یہاں چھپے ہوئے قاتلوں کو خوب پہچانتے ہوں گے اگر انھوں نے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کی تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن اس بات کا یقین ہے کہ ہم یہاں کے شریف اور پرامن شہریوں پر آنچ نہیں آنے دیں گے اگر کوئی ان پر کسی قسم کا الزام عائد کرے گا تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے اور جب ہم تسلیم نہیں کریں گے تو انڈین آرمی بھی ہمارا ساتھ دے گی آئندہ یہاں جو بنگالی اور ہندو آ کر آباد ہوں گے۔ وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔"

اس رات سب نے اتفاق کیا کہ بھاشانی گروپ کے جوانوں کی قیادت میں ہی اپنی جان بچائی جا سکتی ہے۔ دوسری صبح ہزاروں کی تعداد میں لوگ سفید جھنڈیاں لے کر امن اور سلامتی کے خاموش پرچم لہراتے ہوئے اس راستے پر چل پڑے۔ جدھر سے انڈین آرمی آنے والی تھی۔ نولا ہاٹ سے آگے جانے کے بعد دور سے ہی بھاری بھرکم ٹینک نظر آنے لگے۔ فوجی بوٹوں اور گاڑیوں سے اس قدر دھول اڑ رہی تھی کہ اس گرد و غبار میں بھارتی فوج کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آنے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ وہ سفید جھنڈیاں دیکھ کر رک گئے۔ دونوں کے درمیان تقریباً نصف میل کا فاصلہ تھا۔ دو جوان صلح کا پرچم لہراتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے آرمی افسران کے پاس پہنچے۔ اپنا تعارف کرایا مکتی باہنی کے جوان ان دونوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ سیدپور کیمپ سے ان کا تعلق ہے۔ آرمی کے افسران نے ان سے مصافحہ کیا پھر کہا: "ہم عوام کو جانی یا مالی نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں۔ سید پور سے گزرتے ہوئے پاکستان آرمی کی بیرکوں میں جائیں گے لیکن اگر راستے میں مزاحمت کی گئی تو ہم ایک ایک کو بھون کر رکھ دیں گے۔"

ایک جوان نے یقین دلایا: "سید پور کے باشندے امن پسند ہیں اور آپ لوگوں کا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔"

مکتی باہنی کے ایک نوجوان نے غصے سے کہا: "سید پور کے لوگ غنڈے، بدمعاش اور قاتل ہیں۔ ہم ایک ایک کو پہچانتے ہیں۔ ہم انھیں ضرور سزا دیں گے۔"

مظفر گروپ کے ایک ممبر نے کہا: "جو قاتل ہیں اور سزا کے مستحق ہیں، انھیں ضرور سزا ملے گی لیکن اندھے انتقام کے نتیجے میں امن پسند شہریوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے لہٰذا ہم آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ آپ غلط آدمیوں کا محاسبہ کریں۔ ہم پرامن شہریوں کی حفاظت کریں گے۔"

آرمی کے افسران نے تائید کی اور یقین دلایا کہ امن پسند شہریوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس رائفل، پستول، ریوالور یا دوسرے قسم کے ہتھیار ہیں۔ وہ شام ہونے سے پہلے تھانے میں جمع کر دیں۔

ان کے درمیان معاملات طے ہو گئے۔ یوں بھی انڈین آرمی کو اپنی نیک نامی مقصود تھی۔ سیاسی حکمت عمل کا تقاضا تھا کہ پانچ لاکھ انسانوں کو ٹینکوں سے روند کر گزرا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اتنی بڑی آبادی کو نذر آتش کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے بڑی آسانی سے سمجھوتہ ہو گیا۔ جب انڈین آرمی فاتح کی شان سے آگے بڑھی تو سید پور کے باشندے جے بنگلہ اور بھارتی سینا زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ بھارتی سینا جس راستے سے گزر رہی تھی۔ اس کے اطراف مکانوں اور دکانوں کی چھتوں پر بنگلہ دیش اور بھارت کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا، میمن سنگھ، بوگرہ اور دوسرے تمام شہروں کے بہاریوں نے نہ تو بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تھا اور نہ ہی بھارتی فوج کو خوش آمدید کہا تھا۔ بہاریوں کی ایک عادت ہے اول تو وہ کسی کو تسلیم نہیں کرتے اور جب تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے تمام شہروں کے بہاری آج بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستان آنے پر بضد ہیں۔ اس کے برعکس سید پور کے بہاریوں نے جب بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو تادم تحریر وہ خود کو بنگلہ دیشی ہی کہتے ہیں۔ سید پور میں بہاریوں کا کوئی کیمپ نہیں ہے وہاں بہاریوں کی طرف سے پاکستان آنے کی کوئی آواز سنائی نہیں جاتی۔ اب وہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بنگالی پڑھاتے لکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ بنگالی تہذیب کو اپناتے جا رہے ہیں جو کام چوبیس برس پہلے کرنا تھا وہ اب کر رہے ہیں اور راضی خوشی کر رہے ہیں۔

کچھ عرصے بعد بھارتی فوج کے واپس جانے کے بعد بھی نیپ کے بہاری اور بنگالی جوان مکتی باہنی کے ساتھ لگے رہے۔ انھیں اتنا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ بے قصور شہریوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کر سکیں۔ اگر وہ کسی بات پر بضد ہو گئے تو اس بات کو تھانے اور سرکاری کچہری تک پہنچایا جاتا تھا لیکن مکتی باہنی کے جوانوں کو من مانی کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ایک دن پارٹی کے دفتر میں اطلاع پہنچی کہ ناظم الدین خسرو جو پچھلے دنوں سستے اناج فروخت کر رہا تھا اس پر کوئی خطرناک الزام

حاضر کیا گیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کی پٹائی کی ہے۔ تھانیدار نے اسے ضمانت پر شیر بلڈنگ تک پہنچا دیا ہے اور اب اس کے خلاف سخت کارروائی کی جانے والی ہے۔

پارٹی کے چند نوجوان شیر بلڈنگ تک پہنچے۔ خسرو اس وقت تھمی رام گروال کی حویلی میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے گیا تھا۔ شیر بلڈنگ میں پناہ لینے والے ایک بوڑھے نے کہا: "خسرو تو نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ آنے والی عورتیں یہاں ہیں۔"

ایک نے کہا: "چلو، ان سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

بوڑھے نے انھیں ایک چادر کی چار دیواری میں پہنچا دیا۔ وہاں عظمیٰ دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا نے اجنبیوں کو دیکھا تو سر پر آنچل رکھ کر دوسری طرف منہ پھیرنے لگی۔ ایک نے کہا: "بہن! ہم آپ کی مصیبت میں کام آنا چاہتے ہیں۔ نعیم الحسن خسرو جیسا نیک دل انسان جو نمک کو سستا فروخت کرتا ہو، کوئی برائی نہیں کر سکتا۔ ہمیں بتائیے، اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم اس پر ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں سے عدالت تک دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیں گے۔"

وہ رونے لگی۔ شیر بلڈنگ میں پناہ لینے والے مردوں اور عورتوں نے نین تارا کو سمجھایا: "تمھاری خوش قسمتی ہے کہ یہ لوگ تمھارے پاس چل کر آئے ہیں اور تمھاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی پر زیادتی ہونے نہیں دیتے۔ تم انھیں سب کچھ بتا دو۔"

ایک عورت نے کہا: "یہ دونوں کیا بتائیں گی۔ ایک تو گونگی ہے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دوسری کا دل اتنا بھاری ہے کہ آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔ منہ سے بات نہیں نکلتی۔ چلو، میں ہی بتا دیتی ہوں۔ بھائی! میں نے جو سنا ہے، تم بھی سن لو۔"

وہ اس کا دکھڑا سنانے لگی۔ جہاں وہ بھولتی تھی، دوسری عورتیں لقمہ دیتی جاتی تھیں۔ اس بوڑھی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی عظمیٰ کچھ کہنے لگی۔ گوں گوں غوں غوں۔ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سب سوالیہ نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ ابھی تک دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کی باتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا: "یہ کہہ رہی ہے، خسرو کے معاملات [illegible]۔ جانے کیوں دنیا والے [illegible] بہت [illegible] رہے ہیں۔ یہ [illegible] وہی الزام دیتے ہیں۔ یہ کسی کے سامنے [illegible] نہیں جانا چاہتی۔ یہاں سے چلا جانا چاہتی ہے۔ یہ [illegible] کسی طرح [illegible] پہنچا دیا جائے۔ یہ اکیلی پاکستان چلی جائے گی۔"

ایک جوان نے عظمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیا اس عورت پر بھی الزامات تراشے جاتے ہیں؟"

نین تارا نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "عورت آئینے کی طرح صاف ہو تو اس کی شفاف صفت کو کوئی نہیں سمجھتا۔ سب اسے آئینہ سمجھ کر اس میں جھانکنے لگتے ہیں۔ یہ بہت ہی صاف دل کی لڑکی ہے۔ میرے سامنے میرے شوہر کی خدمت کرتی تھی تو ہماری میزبان خاتون نے اس کا بُرا مانا۔ اسے غلط سمجھا۔ جانے ہم سے پہلے یہ کہاں رہتی رہی ہے اور کتنی جگہ سے نکالی گئی ہے۔ یہ واقعی بیزار ہو گئی ہے۔"

نوجوان نے کہا: "بہن! اگر تم اس قدر پریشان ہو، تمھارا کوئی نہیں ہے اور تم پاکستان جانا چاہتی ہو تو ہم تمھارے لیے کچھ انتظام کر سکتے ہیں۔ ہماری پارٹی کے چند لوگ آج رات کی ٹرین سے چاٹگام جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ اگر چاٹگام کے راستے برما جانا چاہو تو بھی معاملات طے کیے جا سکتے ہیں۔"

عظمیٰ یہ سنتے ہی فوراً پلٹ گئی۔ وہ 'ہاں ہاں' کے انداز میں سر ہلا رہی تھی جیسے جانے کے لیے ایک پاؤں پر کھڑی ہو۔ کامریڈ نے اس کی صورت دیکھتے ہی حیرانی سے کہا: "ارے عظمیٰ! یہ تم ہو؟"

عظمیٰ اسے اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا: "تمھارا بہنوئی صابر حسین میرا بہت گہرا دوست تھا۔"

پھر اس نوجوان نے نین تارا سے کہا: "یہ عظمیٰ میرے دوست صابر حسین کی سالی ہے۔ اب میں سارا قصہ سمجھ گیا ہوں۔ صابر اکثر مجھے اپنے خاندانی حالات بتایا کرتا تھا۔ اس بے چاری کو کسی کے ہاں زیادہ عرصے تک پناہ نہیں ملتی تھی۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہتی تھی۔"

نین تارا نے کہا: "کچھ بھی ہو، اب نہیں بھٹکے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔"

عظمیٰ 'نہیں نہیں' کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنی گونگی زبان میں بولنے لگی۔ نین تارا نے جواباً کہا: "بڑی دیدی کو شبہ کرنے دو۔ ہم ان کے پاس نہیں رہیں گے جب تک پاکستان جانے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ ہم اسی جگہ رہیں گے لیکن تمھیں چاٹگام کے راستے برما نہیں جانے دوں گی۔ سنا ہے بہت ہی خطرناک راستہ ہے۔"

نوجوان نے کہا: "ابھی کہیں جانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے ہمیں خسرو کی خیریت چاہیے۔ ہم تھمی رام کی حویلی کی طرف جا رہے ہیں۔"

نین تارا نے کہا: "میں بھی خسرو کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن انھوں نے اپنے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا۔ مجھے یہاں رہنے پر مجبور کر دیا۔ اگر آپ جا ہی رہے ہیں تو کسی طرح جلدی ان کی خبر بھیجیے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی خسرو کی آواز سنائی دی۔ وہ خوشی سے نین تارا کو آوازیں دیتا ہوا، ڈگمگاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ وہ دونوں فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ عظمیٰ اپنی گڑبڑ زبان میں کچھ پوچھ رہی تھی۔ اسی بات کو نین تارا نے پوچھا: "کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟"

"بالکل خیریت ہے بھائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ اصل گنہگار سہریا تھا۔ بخشی نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ اسے حوالات میں بھیج دیا گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی یوں لگا جیسے نین تارا خوشی سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی ہو۔ لیکن وہ سجدے میں گری ہوئی تھی اور اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔ وہاں سب کو چپ لگ گئی۔ پوری بلڈنگ میں سناٹا چھا گیا۔ وہ سجدے میں کچھ کہہ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ عظمیٰ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر خاموشی سے ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑو دیدی کی آواز سنائی دی: "نین تارا! ہم بہت شرمندہ ہیں اگر کوئی دوسروں کے فریب میں آکر غلطی کر بیٹھے اور پھر اسے غلطی کا احساس ہو جائے تو معاف کر دینا چاہیے۔ میں تم سے بڑی ہو کر بھی معافی مانگنے آئی ہوں۔"

خسرو نے کہا: "بڑو دیدی جو کہہ رہی ہیں، دل کی گہرائی سے کہہ رہی ہیں۔ یہ اس قدر نادم تھیں کہ اپنی جان دے رہی تھیں اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آج بہن سے محروم ہو جاتا۔ سر اٹھا کر دیکھو۔ دیدی کے ساتھ جیجا جی بھی یہیں پہنچ گئے ہیں۔"

اس نے سجدے سے سر اٹھایا، پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بڑو دیدی سے ذرا دور پیچھے ہٹ کر خسرو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں لیکن حویلی میں واپس نہیں جاؤں گی۔ ہم یہاں سے کہیں جائیں گے تو پاکستان جائیں گے ورنہ یہیں مر جائیں گے۔"

تلسی رام نے آگے بڑھ کر کہا: "معلوم ہوتا ہے تم نے ہمیں معاف نہیں کیا ہے؟"

نین تارا نے کہا "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب خسرو آپ کے گلے لگ گئے ہیں تو کوئی گلہ نہیں رہا لیکن ایک ٹھوکر کھانے کے بعد بار بار ٹھوکر کھانا دانشمندی نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کو برا نہیں سمجھتی لیکن آپ ہمیں سمجھنے کی کوشش کریں حالات ہمارے خلاف ہیں۔ آج سہریا نے ہمارے خلاف سازش کی، کل کوئی دوسرا سازش کرے گا، آپ یقیناً ہم پر اعتماد کریں گے لیکن ہم کتنے دشمنوں سے بچتے رہیں گے۔ اگر واقعی آپ کو ہم سے ہمدردی اور محبت ہے اور آپ ہمارے کام آنا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے ہمیں سرحد پار بھیج دیجیے کسی طرح ڈھاکہ پہنچا دیجیے اس کے بعد ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

تلسی رام کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شانتا نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ٹھہریے! یہ درست کہہ رہی ہے۔ کانٹے سب کو چبھتے ہیں لیکن اپنے پھول کو کبھی نہیں چبھتے۔ میں اب غلطی سے بھی اپنے بھائی اور بھاوج کو چبھنا نہیں چاہتی۔ نین تارا! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ ہم ایک ہفتے کے اندر یہاں سے ہندوستان جائیں گے پھر وہاں سے میں تم لوگوں کو پاکستان پہنچا دوں گی۔ جب تک میرا یہ مقدمہ چلتا رہے گا، میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ پڑوسنوں اور محلے کی عورتوں سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔ ان حالات میں جب میں نہیں رہ سکتی تو تم لوگوں کو کیسے چھوڑ دوں گی۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ تم مجھ پر بھروسہ کرتی ہو؟"

نین تارا نے خسرو کو دیکھا۔ خسرو نے کہا: "دیدی کی بات مان لو۔"

وہ آگے بڑھ کر بڑو دیدی کے پاس آئی اور ان کے سامنے سر کو جھکا لیا۔ عظمیٰ گڑبڑ گڑبڑ بولنے لگی۔ نین تارا نے کہا۔ "بڑو دیدی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن عظمیٰ نہیں جائے گی۔ یہ اب کسی کا سہارا لینا نہیں چاہتی۔ اسے کس طرح سمجھاؤں، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تنہا ہے، بے یار و مددگار ہے۔ میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتی۔"

دیدی نے آگے بڑھ کر عظمیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا، پھر کہا: "میں تمہاری بھی بڑی بہن ہوں۔ میری بات مان کر چلو۔ تم بھی پاکستان جانا چاہتی ہو۔ ان کے ساتھ چلی جانا۔"

عظمیٰ اس نوجوان کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی جو اس کے بہنوئی کا دوست تھا پھر وہاں سے گڑبڑ زبان میں بولنے لگی۔ نین تارا نے کہا: "یہ ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہے اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان لوگوں کے ذریعے چاٹگام سے برما جائے گی۔"

تلسی رام نے کہا: "یہ اس کی بہت بڑی حماقت ہوگی سیدھا راستہ چھوڑ کر بھیانک راستوں سے گزرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

نین تارا نے عظمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی پھر عاجزی سے بولی: "یہ کیسی نادانی ہے۔ آخر ہم سے الگ کیوں ہونا چاہتی ہو تمہارا مقصد پاکستان پہنچنا ہے۔ ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

وہ دور کھڑے ہوئے لوگ اس کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔ لیکن نین تارا سمجھ رہی تھی۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی: "میں کسی ایسی عورت کا سہارا نہیں لوں گی جس کے ساتھ ایک مرد ہو۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ اب مجھ سے طعنے نہیں سنے جاتے۔ اب تک جو پرایوں سے اور غیروں نے بے شرمی اور بد چلنی کے الزامات لگائے۔ میں چپ رہ نہیں سکتی۔ اب چپ رہوں گی جو مجھے بدمعاش لگا اس کو دھوکا

دوں گی۔ اگر تمہارے ساتھ یہاں سے پاکستان تک سفر کروں اور سفر کے دوران تمہارے خسرو کو جیت لوں تو کیا تم ہارنا پسند کرو گی؟“

مین تارا شدید حیرت سے اسے ایک ٹک دیکھنے لگی۔ اس نے کہا: ”اسے مذاق نہ سمجھنا۔ یہ میرا چیلنج ہے اور تم خوب سمجھتی ہو حوا کی بیٹی خسرو جیسے سیدھے سادے لوگوں کو بھی تہذیب کی جنت سے نکال سکتی ہے۔“

مین تارا شکست خوردہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اپنی زندگی ہار سکتی تھی لیکن خسرو کو کسی قیمت پر بھی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ عظمیٰ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے اندر چھپی ہوئی کسی بدکردار عورت کو تلاش کرنا چاہتی ہو لیکن وہ گونگی کسی پہلو سے بدکردار نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر کہہ رہی تھی۔ اس حقیقت کو خوب سمجھتی تھی کہ محبت سے جدا ہونا چاہے گی تو مین تارا اور خسرو اسے کبھی الگ نہیں کریں گے۔ اسی لیے اس نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔

خسرو نے ان کے قریب آکر پوچھا: ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

عظمیٰ خسرو سے منہ پھیر کر اس نوجوان کے پاس چلی گئی۔ خسرو نے مین تارا سے پوچھا: ”آخر کیا بات ہے یہ کہتی کیا ہے؟“

مین تارا نے نظریں اٹھا کر خسرو کو دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے۔ یہ گونگی دنیا والوں کی گالیاں سنتے سنتے خود ایک گالی بن گئی ہے۔ لیکن وہ خسرو سے یہ بات نہ کہہ سکی۔ وہ دیکھنے میں بہت ہی سیدھا سادا سا لگتا تھا مگر بعض حالات میں بھولے بھالے مرد بھی کسی خوبصورت گالی کو کھانا پسند کر لیتے ہیں۔

خسرو نے پوچھا: ”تم چپ کیوں ہو۔ بولتی کیوں نہیں ہو؟“

”آں۔“ وہ چونک گئی پھر سنبھل کر بولی: ”یہ کوئی نادان بچی تو نہیں ہے۔ سمجھدار ہے۔ اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ جب ان لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ہم اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں؟“

”لیکن تارا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔“

”اس کے ہم بھی نہیں ہیں۔ ہم سے کون سا خون کا رشتہ ہے۔ ہم نے اب تک یہاں سے ہمدردی اور محبت کی۔ کیا آپ ایک لڑکی سے نہیں سمجھتے کہ زبان کے رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں۔ میں تمہارے آس پاس کسی عورت کا وجود برداشت نہیں کروں گی۔ تمہیں کس حد تک الزام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ گونگی کے ساتھ بھی تمہیں بدنام کیا جا سکتا ہے۔“

خسرو نے چونک کر عظمیٰ کو دیکھا۔ عظمیٰ اس نوجوان سے پیچھے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کھا رنگ [illegible] سے ایوں لگا جیسے دوری کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا ہو لوگ سے ٹھیک ہی کہتے ہیں

لاتوں اور ڈنڈوں سے مار رہے ہوں۔ اس نے سر کو جھکاتے ہوئے مین تارا کو دیکھا۔ پھر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا: ”میں صرف تمہارے ساتھ ہی نیک نام رہ سکتا ہوں۔ آؤ چلیں۔“

◆

چاٹگام کو انگریزی میں چٹاگانگ کہتے ہیں۔ بعض بنگالی اسے چٹوگرام اور بعض بہاری چٹاگاؤں یا چاٹگاؤں کہتے ہیں۔ بہرحال جس طرح بھی اس شہر کا نام ادا کیا جائے اس میں چاٹنے کا لفظ ضرور آتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد بہاریوں نے بنگالیوں کی جان و مال کو چاٹنا شروع کیا تو بنگالی اپنی اپنی رہائش گاہیں چھوڑ کر سدرگھاٹ، دام پاڑہ، قاضی ڈیوڑھی، لولائن اور چوک بازار کے علاقوں میں جا کر پناہ لینے لگے۔ جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگالیوں نے انتقاماً بہاریوں کو چاٹنا شروع کیا تو وہ اپنی اپنی رہائش گاہیں چھوڑ کر سردار بہادر کالونی، حالی شہر کالونی اور فیروز شاہ کالونی میں جا کر پناہ لینے لگے تھے۔

عبدالمعبود خان عابد بنگالی تھے مگر اردو زبان میں شاعری کرتے تھے کٹر مسلم لیگی تھے۔ اسد گنج میں چیٹری پن کی جامع مسجد کے قریب ہی ان کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ جب بنگالیوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور وہ اپنے مکانات اور اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگے آرہے تھے تب عبدالمعبود خان نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ مسلم لیگ کے ممبران اور لیڈروں سے التجا کی تھی کہ بنگالیوں کو تحفظ دیا جائے۔ ان دنوں مفرور بنگالیوں کو پناہ دینا بہت بڑا جرم تھا۔ پاکستانی فوج کے جوان ایسے بنگالیوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے جو غدار سمجھے جاتے تھے اور جو حکومتِ وقت کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہتے تھے۔ بہرحال وہ وقت گزر چکا تھا۔ اب بنگالیوں کی حکومت تھی۔ اب عبدالمعبود خان عابد کا شمار ان بنگالیوں میں ہوتا تھا جو بنگلہ دیش کی مخالفت کرتے تھے اور حکومتِ پاکستان کے وفادار تھے۔ عبدالمعبود خان عابد کا بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلم لیگی تھے اور اردو زبان میں شاعری کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کو معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ فوراً ہی گولی ماری جاتی تھی لیکن عبدالمعبود خان عابد کی وہ نیکیاں کام آگئی تھیں جو انہوں نے مفرور بنگالیوں کے ساتھ کی تھیں۔ ان کے مکان کے قریب ہی چیٹری پن کی جامع مسجد مکتی باہنی کا اڈہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ وہ بنگالی ہو کر اگرچہ بنگلہ دیش کے غدار ہیں تاہم انہوں نے بنگالیوں کی جان و مال کی حفاظت کی ہے لہٰذا ان کی جان بخشی کی جاتی ہے لیکن سختی سے یہ کہا گیا کہ وہ اردو زبان میں شاعری نہیں کریں گے۔ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب قائداعظم کا پاکستان نہیں رہا تو قائداعظم کی مسلم لیگ وہاں زندہ کیسے رہ سکتی تھی؟

عبدالمعبود خان عابد نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کیا۔ پاکستان گیا، اسلم بیگ گئی، اردو شاعری گئی، ان تمام باتوں کا انھیں افسوس تھا لیکن بیوی بچوں کی جان بچ گئی اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ وہ ہر حال میں انسانی زندگی کا تحفظ کرنے کے قائل تھے۔ اس لیے شاعری اور سیاست پر اہل خاندان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔ بے چارے نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

۲ [illegible] ۹۷۲ء کو انڈین آرمی واپس چلی گئی۔

تاہم

بنگلہ دیش [illegible] کے بعد اسی بھارتی فوج نے وہاں اردو بولنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کی تھی اور انھیں بنگالیوں کے انتقام سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے جب تک وہ موجود رہے، اردو بولنے والے مطمئن رہے لیکن بنگلہ دیش کے عوام بحیثیت مسلمان، پاکستان کے مسلمان فوجیوں کو برداشت نہ کر سکے تو پھر بھلا ہندوستانی فوجیوں کو کب تک برداشت کرتے۔ ایک دن تو انڈین آرمی کو واپس جانا ہی تھا سو وہ چلی گئی۔

۶ مارچ تک بنگلہ دیش کی افواج نے وہاں کے حالات پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔ امن و امان کو بحال رکھنے کے لیے سب سے پہلے انھوں نے مکتی باہنی سے ہتھیار رکھوانے شروع کیے تاکہ بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان تصادم کم سے کم ہوتا چلا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مکتی باہنی کے جوانوں نے بنگلہ دیش کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات ہزاروں کی تعداد میں یہ نوجوان اپنا گھر اپنا دیش چھوڑ کر سرحد پار کر کے ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ وہاں ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور

انھیں خبریں ملتی رہتی تھیں کہ پاکستان میں ان کے بیوی بچوں کے ساتھ عوام کے ساتھ کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ وہ ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہوتے تھے۔ انتقام کی آگ میں سلگتے تھے

حتیٰ کہ ایک

وقت آیا جب انھوں نے بنگلہ دیش بنانے کے لیے گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔ ہم پاکستانی انھیں ملک دشمن عناصر کہہ سکتے ہیں لیکن وہ بنگلہ دیش کے دوست تھے۔ ایسے جوانوں کو بنگلہ دیش کی حکومت ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ جبھی یہ کہ انھیں اپنی فوج میں مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی لہٰذا ایسے ہی لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا جو گوریلا جنگ لڑ چکے تھے۔ یعنی ایک طرف مکتی باہنی کے جوانوں سے ہتھیار رکھوائے گئے دوسری طرف انھی جوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیے گئے۔ ناک ادھر سے نہیں پکڑی گئی۔ اُدھر سے پکڑ لی گئی۔

عبدالمعبود خان عابد بہت عرصے کے بعد اپنے بہاری دوستوں سے ملنے سردار بہادر کالونی پہنچے۔ وہ اُدھر جانے سے ہچکچاتے تھے لیکن بی ڈی آر کا ایک آفیسر ان کا شناسا تھا۔ اس نے یقین دلایا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جیسے بنگالیوں کو جو اردو زبان اچھی طرح جانتے ہیں ان بہاریوں سے رابطہ رکھنا چاہیے انھیں جا کر سمجھانا چاہیے کہ وہ دل سے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں، بنگلہ زبان اور تہذیب کو اپنا لیں یا پھر پاکستان چلے جائیں۔"

وہ بہاریوں کے علاقے میں پہنچے تو وہاں ہر جگہ سہمی ہوئی صورتیں نظر آئیں۔ یہ وہی بہاری تھے جو پچھلے برس پاکستانی فوج کے آگے آگے رہتے تھے۔ ان ملک دشمن لوگوں کی نشاندہی کرتے تھے جو حکومت پاکستان کے خلاف محاذ آرائیاں کرتے رہتے تھے۔ کرفیو کے اوقات میں تمام بنگالی سہمے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں دبکے رہتے تھے اور بہاری کرفیو پاس لے کر بنگالیوں کے علاقے میں دندناتے پھرتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر فاتحانہ جوش و خروش کی چمک دمک ہوا کرتی تھی۔ آج یہی چہرے بجھے ہوئے تھے، سہمے ہوئے تھے۔ لوگ صدیوں سے انسانی تاریخ پڑھتے آ رہے ہیں اور سمجھتے آ رہے ہیں کہ طاقت سے اور ہتھیاروں سے انسان کبھی دائمی آسودگی اور امن قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہاتھ میں بندوق ہو اور منہ میں کڑوی زبان ہو تو خوشحالی کا پرندہ دہشت زدہ ہو کر اڑ جاتا ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ع

گلاب ہاتھ میں ہو آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبت کا استعارہ ہو

عبدالمعبود خان عابد نے سردار بہادر کالونی میں ایسے لب بدم مریضوں کو دیکھا جن کے لیے علاج کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ ایسے خاندان دیکھے جہاں بچے بھوک سے ایڑیاں رگڑتے تھے اور ایسے تو سبھی تھے جو راتوں کو سوتے نہیں تھے کبھی ذرا آنکھ لگ جاتی تو یوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے جیسے موت اچانک ان کے سروں پر پہنچ گئی ہو۔ وہ اپنے ایک شاعر دوست کے ہاں پہنچے۔ وہاں بھی بھوک، بیماری اور رت جگے تھے۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ باہر دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ سر جھکا کر بولے: "میں اپنے ساتھ کچھ اناج لے کر آیا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے دوستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اب میرے پاس یہ پچاس روپے رہ گئے تھے۔ پانچ روپے اپنی واپسی کے لیے رکھتا ہوں۔ پینتالیس تم رکھ لو۔"

انھوں نے ۴۵ روپے اپنے شاعر دوست کے ہاتھ پر رکھ

دیے۔ شاہد نے ندامت سے کہا: "اب کوئی چار پیسے کی مدد بھی کرتا ہے تو رسماً انکار نہیں کیا جاتا۔ انکار کریں گے تو بچوں کا پیٹ کیسے بھرے گا۔"

انھوں نے دوست کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہا: "حوصلہ کرو۔ ان حالات میں رسمی تکلفات ختم ہو جاتے ہیں۔"

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "یہ وقتی امداد کہاں تک کام آئے گی۔ ہم کب تک بے یار و مددگار رہیں گے۔ کب تک بے بسی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔"

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کسی طرح یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرو۔ ابھی امیر صاحب کہہ رہے تھے کہ دلال دو چار سو روپے لے کر سرحد پار کرا دیتے ہیں۔"

"سرحد پار کرنے کے لیے اپنے پیروں سے چل کر جانا ہوتا ہے لیکن دشمنوں نے میرے جوان بیٹے کو چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

عبدالمعبود خان عابد نے چونک کر پوچھا: "کیا ہوا منظور بیٹے کو؟ کیا دشمنوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیے ہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "نہیں، پاؤں تو سلامت ہیں لیکن وہ شاید کئی ماہ تک یا کئی برسوں تک اپنے پیروں سے چل نہیں سکے گا۔"

"کیا ہوا کچھ تو بتاؤ۔ وہ تو فٹ بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔"

"ہاں، رائٹ آؤٹ کا کھلاڑی، جب گیند لے کر بھاگتا تھا تو کوئی اس کے ساتھ دوڑ نہیں سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کھیل کھیل میں اتنی بھیانک دشمنی ہو جائے گی۔ مخالف ٹیم کے مقامی کھلاڑی اس پر دانت پیستے رہتے تھے۔ شاید کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور وہ موقع انھیں مل گیا۔ منظور کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے اسد گنج کی طرف گیا تھا۔ وہاں دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ بتاتا تھا کہ اسے کس طرح مارا پیٹا گیا۔ کس طرح اسے گالیاں دی گئیں۔ پھر اسے ایک چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا گیا۔ ایک نے کہا اسے جان سے مار دو۔ دوسرے نے کہا۔ نہیں یہ بنگالی زبان بولتا ہے لیکن اس کا جرم یہی ہے کہ یہ ماوڑا (بہاری) ہے۔ اسے ایسی سزا دی جائے جس سے ہمیں تسکین بھی پہنچے اور یہ بہاری دی ہوئی سزا کو ہمیشہ یاد رکھے۔

ایک اور کھلاڑی نے کہا: "یہ بہت تیز بھاگتا تھا۔

گیند ایسے لے جاتا تھا جیسے وہ پاؤں سے چپک گئی ہو پھر یہ کمبخت گول کر کے ہی واپس آتا تھا۔"

کسی اور کھلاڑی نے کہا: "اس کے پاؤں نہیں رہیں گے تو یہ آئندہ کبھی ہم سے آگے نہیں بھاگ سکے گا۔"

"کیا اس کے پاؤں کاٹ دیے جائیں؟"

"ارے نہیں نہیں بے چارے کو لنگڑا اپاہج نہیں بنانا چاہیے۔ یہ بڑا ظلم ہوگا بس تھوڑی سی سزا دو۔"

پھر انھوں نے میرے بیٹے کے پاؤں کے تلوے کو چاقو سے چھیلنا شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ دونوں پاؤں کے تلووں کی کھال اتار دی جائے لیکن ایڑی کی طرف کھال موٹی ہوتی ہے۔ وہ کسی ماہر قصائی کی طرح اسے نہ اتار سکے۔ لہٰذا چاقو سے چھیلتے چلے گئے۔ دونوں پاؤں اب تک موجود ہیں لیکن وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کے تلووں کی جلد نہیں ہے صرف لال لال گوشت نظر آتا ہے۔ وہاں خون کے لوتھڑے خشک ہو کر جم گئے ہیں۔ ہم کس سے علاج کرائیں۔ یہاں کوئی معقول ڈاکٹر نہیں ہے اور ڈاکٹر جو بھی دوائیں بتاتا ہے۔ وہ ہمیں حاصل نہیں ہوتیں پھر بھی رو دھو کر کچھ مرہم پٹی ہو رہی ہے۔"

کمرے کے اندر سے منظور کی آواز سنائی دی: "ابا جان! میں پاکستان جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔"

عبدالمعبود خان عابد نے سر گھما کر کمرے کے اندر دیکھا پھر فوراً ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جو نوجوان کھڑا نہیں ہو سکتا تھا وہ اس وقت ان کے سامنے کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس طرح کہ اس کے پاؤں کے دونوں تلوے زمین پر ٹکے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس نے پاؤں کے دونوں سروں پر اپنے تمام جسم کا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ تلوے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور وہ اسی طرح پاؤں کے دائیں اور بائیں سروں پر وزن ڈالتا ہوا دیوار کا سہارا لے کر ان کے قریب آ گیا تھا۔ عبدالمعبود خان عابد نے کہا۔ "بیٹے! اپنے بستر پر لیٹے رہو۔ میں خود تمھارے پاس آنے والا تھا۔"

منظور نے انکار میں سر ہلا کر کہا: "نہیں چچا میاں! میں یہاں تک آ کر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے دروازے کی چوکھٹ پار کر سکتا ہوں تو بنگلہ دیش کی سرحد کو بھی پار کروں گا۔"

"لیکن بیٹے! یہ کیا نادانی ہے۔ تم زمین پر بیٹھ کر گھسٹ گھسٹ کر یہاں تک آ سکتے تھے۔"

"ابا جان! میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں اپاہج بننا پسند نہیں کروں گا۔ میں ایک اسپورٹس مین ہوں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں ہزار زخم کھانے کے باوجود اپنے پاؤں پر کھڑا رہوں گا اور اپنے پیروں پر چلتا رہوں گا۔"

اس کے باپ نے اپنے بیٹے کو ہاتھ سے تھپکتے ہوئے کہا: "میرا بیٹا جواں مرد ہے، حوصلہ مند ہے مگر بیٹے تم آرام سے لیٹو۔ پہلے تمھارے زخموں کا علاج ہو جائے۔ تمھارے پاؤں کے

تلوے اس قابل ہو جائیں کہ تم انھیں زمین پر ٹھیک ٹھیک رکھ کر آہستہ آہستہ چل سکو تو میں کسی دن تمھارے جانے کا بندوبست کردوں گا۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب جلد سے جلد پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو آپ کی آدھی سے زیادہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں نے آپ کو بچپن سے دیکھا ہے آپ بہت ہی حوصلہ مند ہوتے تھے۔ لیکن اب شاید میری وجہ سے، شاید ان حالات کی وجہ سے ٹوٹ گئے۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ اسی حوصلے سے میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال لیں گے پھر میں وہاں جاتے ہی اپنی ملازمت بحال کراؤں گا اور آپ لوگوں کو بلاؤں گا۔"

"لیکن بیٹے! تمھیں اب کون ملازمت دے گا؟"

"کیوں نہیں دے گا۔ میں حکومت پاکستان کے دور میں واپڈا کا ملازم رہ چکا ہوں میرے پاس تمام ضروری کاغذات موجود ہیں۔ پاکستان یہاں نہ رہا وہاں تو ہے۔ میں کل بھی پاکستانی تھا، آج بھی پاکستانی ہوں۔ کل بھی واپڈا کا ملازم تھا، آج بھی ملازم ہوں۔ لہٰذا میری ملازمت برقرار ہے اور برقرار رہے گی۔"

"لیکن تمھیں تو فٹبال کے کھلاڑی کی حیثیت سے ملازمت ملی تھی۔ کیا آئندہ تم کھیل سکو گے؟"

اس نے دور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ میرے پاؤں کے تلوؤں پر بھی نئی کھال چڑھے گی۔ میں نئے سرے سے پھر کھلاڑی بننے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کی طرف لے گیا وہ گلے میں کچھ پہنے ہوئے تھا جب اس نے گلے سے اسے اتارا تو وہ سونے کا میڈل تھا۔ اسے فٹبال کے بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے وہ میڈل انعام میں ملا تھا۔ اس نے سونے کا میڈل عبدالمعبود خان عابد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "میں نے کئی بار اباجان سے کہا کہ اسے بیچ کر گھر کے اخراجات پورے کریں لیکن انھوں نے امی کے زیورات بیچ دیے۔ گھر کا کتنا ہی سامان فروخت ہو گیا بہرحال آپ اسے بیچ کر میرے لیے رقم فراہم کریں۔ میں کسی دلال کے ذریعے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

اس کے باپ نے کہا: "نہیں بیٹے! میں ابھی تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ پہلے تمھارے پیروں کا باقاعدہ علاج ہو گا۔"

"جب تک علاج ہو گا، تب تک پانی سر سے گزر چکا ہو گا میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دن رات فاقے کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں جلد سے جلد پاکستان پہنچوں گا آپ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ مصیبت کے یہ دن جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔"

عبدالمعبود خان نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی: "بیٹے! یہ سونے کا میڈل بیچنے سے پہلے اپنی طرف دیکھ لو۔ یہاں سے برما تک کا راستہ بہت ہی دشوار گزار ہے۔ صحیح سلامت ہاتھ پاؤں رکھنے والے رستے میں تھک کر گر جاتے ہیں۔ بنگال اور برما کے جنگلوں کا عذاب انھیں مار ڈالتا ہے۔ خدا تمھیں لمبی عمر دے لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ قدم منزل تک پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟"

منظور نے بڑے عزم سے کہا: "چچا میاں! جب میرے پاؤں صحیح سلامت تھے تو میں گیند لے کر گول تک پہنچ جاتا تھا۔ ایک کھلاڑی کی منزل گول پوسٹ تک ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے صلے میں مجھے یہ سونے کا میڈل ملا تھا۔ جب میں زخمی پاؤں سے چلتا ہوا مصائب سہتا ہوا پاکستان پہنچوں گا تو انشاءاللہ مجھے سونے کا مستقبل ملے گا۔"

عبدالمعبود خان عابد نے سر جھکا کر اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پاؤں کے دائیں بائیں سرے پر اپنے تمام جسم کا بوجھ اٹھائے کھڑا تھا۔ پاؤں کے تلوے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہاں خون کے لوتھڑے خشک ہو چکے تھے۔ گوشت کی سرخ رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ اگر باقاعدہ علاج ہوتا تو وہ زخم شاید مہینوں میں بھر جاتے۔ اب تو برسوں تک توقع نہیں تھی۔

انھوں نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے سوچا۔ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو پیروں سے نہیں بلکہ زخموں سے چل کر منزلِ محبوب تک پہنچتے ہیں۔

وہ چھاؤ تلا سے لوکل ٹرین میں بیٹھ کر چاٹگام سٹیشن پہنچے۔ وہاں ان کا ایک ڈاکٹر دوست غلام انبیاء رہتا تھا شام کے وقت کلینک کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر غلام انبیاء مریضوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا پھر عبدالمعبود خان عابد نے کہا: "میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن تنہائی میں۔"

"تو پھر صبر کرنا ہو گا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں مریضوں سے نمٹ لوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں دو گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔"

وہ کلینک سے نکل کر بیپاری بیتان نیو مارکیٹ پہنچے وہاں ایک سنار کو سونے کا میڈل دکھایا۔ سنار نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا: "یہ تو ساگر ٹورنامنٹ کا میڈل ہے۔ آپ بوڑھے ہیں۔ یہ آپ کو کہاں سے مل گیا۔ یہ تو جوانوں کو ملتا ہے۔"

"میرا بھتیجا فٹ بال کا کھلاڑی ہے۔ اسے انعام میں ملا تھا۔"

"آپ کے بھتیجے کا نام کیا ہے؟"

"منظور احمد۔ وہ بہت مشہور کھلاڑی ہے۔"

اس کا نام سنتے ہی دوسرے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا نوجوان تیزی سے چلتا ہوا اپنے سنار باپ کے پاس آیا پھر اس کے ہاتھ سے میڈل لے کر دیکھتے ہوئے بولا: "کیا یہ منظور میاں کا میڈل ہے؟"

عبدالمعبود خان عابد نے سر ہلا کر کہا: "ہاں، یہ اسی کا ہے۔"

"لیکن منظور صاحب اسے کیوں بیچ رہے ہیں؟"

"بیٹے! اگر تم منظور احمد کو اچھی طرح جانتے ہو تو اس کی مجبوریوں کو بھی سمجھ سکتے ہو۔"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "ہاں، وہ بہاری ہے اور ان دنوں کن مصیبتوں میں مبتلا ہوگا، یہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں ان کا بہت مداح ہوں۔ جب بھی ان کا کھیل ہوتا ہے، اپنے دوستوں سے بازی لگاتا ہوں کہ وہ ضرور مخالف ٹیم کے خلاف گول کریں گے اور یہ شرط میں ہمیشہ جیت جاتا ہوں۔ افسوس! آج اتنا بڑا کھلاڑی اپنے حالات سے مجبور ہو کر بک رہا ہے۔ میں اسے بکنے نہیں دوں گا۔"

اس کے سنار باپ نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا: "یہ فٹ بال گراؤنڈ نہیں ہے۔ کاروبار کی جگہ ہے، دکان ہے۔ تم یہاں صرف کاروبار کی باتیں کرو۔"

اس جوان نے میڈل کا وزن کیا پھر کہا: "یہ چونی بھر وزن کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پچیس روپے ملیں گے اور پچیس روپے میں ان کا کیا بھلا ہوگا؟ آپ پرابلم بتائیں۔ مجھے ان کے لیے کچھ کر کے بڑی خوشی ہوگی۔"

بوڑھے سنار نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے میڈل کو چھین کر عبدالمعبود خان عابد کے سامنے کاؤنٹر پر پھینکتے ہوئے کہا: "یہ چونی بھر ہے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے ملیں گے۔ منظور ہو تو نقد پیسے لے جاؤ۔"

اس نوجوان نے میڈل کو اٹھا کر کہا: "میرا نام جمال الدین ہے۔ میں آپ کے ساتھ باہر چل رہا ہوں۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

وہ کاؤنٹر سے نکل کر جانے لگا۔ اس کا باپ آوازیں دیتا رہ گیا۔ اس نے ایک نہ سنی۔ باہر پہنچ کر اس نے کہا: "آپ مجھے منظور صاحب کے حالات بتائیں۔"

عبدالمعبود خان عابد نے جب یہ بتایا کہ اتنے اچھے کھلاڑی کے دونوں پاؤں کے تلوے چاقو سے چھیل دیے گئے ہیں تو وہ سنتے ہی لرز گیا۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک رکشا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "آپ میرے ساتھ چلیے۔ ہم یہاں کے ایک کھلاڑی سے ملاقات کریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ فٹبال کے ایک کھلاڑی کے مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کھلاڑی نے کہا: "میرا نام افسر میاں ہے۔ میں منظور کی ٹیم کا سینٹر فارورڈ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دشمنوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو دیر ہو چکی تھی۔ میں اپنی ٹیم کے تمام جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ دشمن اس وقت تک اس کے دونوں پاؤں کے تلوے چھیل چکے تھے۔ پھر بھی ہم نے اس کی جان بچالی۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو شاید وہ اسے جان سے بھی مار سکتے تھے۔"

جمال الدین نے کہا: "افسر میاں! تم سب کھلاڑی ہو۔ ایک دوسرے کی مدد سے گیند لے کر گول تک پہنچتے ہو، اور یہ سبق حاصل کرتے ہو کہ منزل تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کا تعاون بہت لازمی ہے۔"

افسر میاں نے کہا: "بے شک، ہم یہ سبق حاصل کرتے ہیں۔"

"تو پھر منظور صاحب کو پاکستان تک پہنچانے کے لیے تمھاری ٹیم کے سارے جوانوں کو ان سے تعاون کرنا ہوگا۔ ان کے جو پرابلم ہیں، انھیں حل کرنا ہوگا۔"

"ہم ضرور کریں گے اور آج ہی منظور صاحب سے ملاقات کریں گے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے خوش ہو کر کہا: "میں تم جوانوں کے جذبات سے آج بہت خوش ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان اتنی نفرت اور خونریزی کے باوجود ہماری جوان نسل کی ایک بڑی تعداد تعصب اور نفرتوں سے پاک ہے لیکن اب رات کو جانا مناسب نہیں ہے۔ کل صبح ہم سب مل کر جائیں گے۔"

وہ ان جوانوں سے رخصت ہو کر ڈاکٹر غلام انبیا کے پاس پہنچے۔ وہ انھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا: "ہاں تو فرمائیے تنہائی میں کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"ایک بہاری کے زخم بھرنے ہیں۔ وہ میرے جگری دوست کا بیٹا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

عبدالمعبود خان عابد اسے منظور کے متعلق بتانے لگے۔ تمام باتیں سننے کے بعد انھوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "اگر وہ جوان یہاں سے پاکستان جانا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں میرا بھی ایک پرابلم ہے۔ تم میرے کام آؤ۔ میں تمھارے کام آتا ہوں۔"

"میں ابھی تمھارا پرابلم سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ، کیا پاؤں کے

کھوں کے بغیر وہ اتنا لمبا سفر کر سکتا ہے؟"

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا: "میرے خیال میں تو یہ ناممکن ہے لیکن جو شخص بڑا حوصلہ رکھے اور ہو سکتا ہے جس کام کو ہم ناممکن کہتے ہیں، وہ اسے دشوار کہتے ہیں اور کوئی دشواری جوانوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔"

"درست کہتے ہو۔ ہم بوڑھے جسے کہتے ہیں سفر پر منزل تک لے جاتی ہے جوان کہتے ہیں۔ ان کی جوانمردی وہاں پہنچاتی ہے بہرحال اپنا پرابلم بتاؤ۔"

ڈاکٹر غلام انبیاء نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا: "میرے ایک بنگالی دوست کا لڑکا ہے۔ وہ بھی پاکستان جانا چاہتا ہے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے حیرانی سے پوچھا: "بنگالی یہاں سے پریشان ہو کر ہندوستان یا برما جاتے ہیں۔ وہ پاکستان جا کر کیا کرے گا؟"

"بھئی جس طرح تم اردو میں شاعری کرتے تھے اور یہاں مجرم سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح اس کا باپ بنگالی ہونے کے باوجود حکومت پاکستان کا وفادار تھا۔ آج اس کے لیے بنگلہ دیش کی زمین تنگ ہو گئی ہے۔ جہاں جاتا ہے۔ وہاں دشمنوں کا خوف پیچھا کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اس دلال سے بات کروں گا جو منظور کو لے جائے گا۔"

"جو اخراجات ہوں گے۔ وہ میں پورے کروں گا۔"

"منظور کے پاؤں کے زخم کتنے دنوں میں بھر سکتے ہیں؟"

"تمہارے بیان کے مطابق مہینوں لگ جائیں گے۔ ویسے میں زخم دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔"

"تم کل صبح میرے ساتھ چل سکتے ہو؟ اپنے دوست کے لڑکے کو بھی لے چلنا۔ وہاں ہم دلال سے معاملات طے کریں گے۔"

ڈاکٹر غلام انبیاء راضی ہو گیا۔

دوسرے دن منظور احمد کے مکان کے اندر اور باہر اس کے مداحوں کی بھیڑ لگ گئی۔ بنگالی نوجوان کھلاڑی اس کے لیے راشن، کپڑا، نقد روپے اور ضرورت کا بہت سا سامان لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر انبیاء بھی دواؤں کی پیٹی کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں پہنچے تھے۔ عبدالمعبود خان عابد نے اس سے پوچھا: "تم اپنے دوست کے صاحبزادے کو کیوں نہیں لائے؟"

"میں بہت محتاط ہوں۔ اسے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ باہر اگر کوئی اسے غدار کی حیثیت سے پہچان لے گا تو مجھ پر ایک غدار کو پناہ دینے کا الزام عائد ہو جائے گا۔ جب یہاں کسی دلال سے معاملات طے ہو جائیں گے اور جانے کا دن مقرر ہو جائے گا تو میں اسے یہاں لے آؤں گا۔"

فٹبال کا ایک شوقین کہہ رہا تھا: "منظور صاحب! ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ آخر یہاں کیا تکلیف ہے۔ دشمنوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا ہم بدلہ لیں گے۔ آپ کے پیروں کا علاج کرائیں گے۔ ان شاء اللہ آپ جلد ہی چلنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

منظور نے کہا: "آپ لوگوں سے مجھے جتنی محبت مل رہی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں نہ جاؤں لیکن میں جس قدر آپ لوگوں سے گھل مل کر رہتا آیا ہوں۔ میری فیملی اسی قدر آپ لوگوں سے دور رہتی آئی ہے۔ ہمارے خاندان کے لوگ کہتے ہیں ہم پاکستان میں رہنے کے لیے ہندوستان چھوڑ کر آئے اور آج بھی پاکستان کی محبت میں بنگلہ دیش چھوڑ کر جائیں گے۔ جئیں گے تو پاکستان میں، مریں گے تو پاکستان میں۔ جب حب الوطنی کے جذبات اس قدر انتہائی ہوں تو ہم میں سے کسی کو راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔"

ان کی باتوں کے دوران غلام انبیاء نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ ان کی صفائی کی، مرہم لگایا، پٹی باندھی پھر انجکشن لگاتے ہوئے کہا: "میں تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا مشورہ دوں گا۔ کم از کم ایک برس تک گھر سے نکلنے کا خیال دل سے نکال دو۔ میرے اندازے کے مطابق تم چار چھ مہینے میں اپنے پاؤں زمین پر جما کر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکو گے۔"

عبدالمعبود خان عابد نے مسکراتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر! تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا، کل یہ لڑکا میرے سامنے اپنے پیروں پر چلتا ہوا باہر دروازے تک آیا تھا۔"

ڈاکٹر نے منظور کو بے یقینی سے دیکھا۔ منظور نے کہا: "میں پاؤں کے ان دو ابھروں پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال کر چل سکتا ہوں۔"

"چلنے کی ضرورت کیا ہے؟ جب تک زخم بھر نہ جائیں۔ تب تک کیا تم زمین پر بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت نہیں کر سکتے اور کہیں آنے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آرام سے بستر پر پڑے رہو۔"

"ڈاکٹر! میں اسپورٹس مین ہوں۔ نہ تو میں بیماروں کی طرح بستر پر زیادہ عرصے تک لیٹ سکتا ہوں، نہ ہی اپاہجوں کی طرح زمین پر رینگ سکتا ہوں۔ میں چلنا پھرنا، دوڑنا اور ورزش کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب بھی بستر سے اٹھوں گا تو دونوں پاؤں کے بل پر اٹھوں گا۔ آپ میرے لیے ایسی دوائیں، انجکشن اور مرہم وغیرہ تجویز کریں جنہیں میں سفر کے دوران استعمال کر سکوں، میرے زخم ساتھ ساتھ بھرتے رہیں اور سفر کے دوران مجھے ڈاکٹر اور دواؤں کی ضرورت نہ پڑے۔"

ڈاکٹر انبیاء نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "وہ تو میں

ضرور کروں گا لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ تم بنگال اور برما کے جنگلات میں اپنے پاؤں پر چل سکو گے۔ میرا مشورہ ہے اپنے ساتھ ایک اسٹریچر لے جانا۔ تاکہ جس پر تمہیں اٹھا کر لے جا سکیں۔"

"ڈاکٹر! میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک اپاہج کا مذاق نہ اڑائیں۔ میں مر جاؤں گا مگر جیتے جی کسی کے کاندھے کا سہارا نہیں لوں گا۔"

ڈاکٹر نے تعریفی نظروں سے مسکرا کر دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "آخر جوان ہو ایسی ہی باتیں کرو گے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں' ۔ نہ تو یہ پاؤں تمہیں پاکستان پہنچائیں گے اور نہ ہی تقدیر نے آج تک کسی اپاہج کا ساتھ دیا ہے۔ اگر تم اپنی منزل تک پہنچو گے تو صرف اپنے حوصلے سے۔"

وہ عبدالغفور خان صاحب کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ستار کے بیٹے جمال الدین نے اپنی جیب سے سونے کا وہ میڈل نکالا پھر اسے دکھاتے ہوئے کہا: "اب اسے بیچنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم اتنے سارے لوگ تمہاری ہر طرح سے مدد کر رہے ہیں۔"

"مجھے آپ لوگوں کی دوستی اور محبت سے بے انتہا خوشی حاصل ہو رہی ہے لیکن یہ خیال ستا رہا ہے کہ میں ایک معذور کی حیثیت سے امداد حاصل کر رہا ہوں۔"

"انسان کو اتنا خوددار بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ضرورت کے وقت وہ کسی کی مدد حاصل نہ کرے۔ آخر انسان ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ہی مخالف ہواؤں کے سامنے ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔"

ایک جوان نے کہا: "اگر تمہاری خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے تو ہماری اس امداد کو یاد رکھنا۔ تمہارے اچھے دن آئیں گے تو ہمارے بھی کسی کام آجانا۔"

جمال الدین نے کہا: "منظور صاحب! سونے کا یہ میڈل ایک طرح سے آپ کا نہیں رہا کیونکہ اسے فروخت کرنے کے لیے بازار بھیجا گیا تھا۔ یہ ایک مجبور بہاری کے ہاتھ سے نکل کر صاحب حیثیت بنگالیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ آپ یہاں سے جانے والے ہیں۔ اس میڈل کو ہماری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجیے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یہ آپ کی اور آپ کے احباب کی نظروں میں آئے گا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ جس بہاری نے بھی بنگالیوں سے محبت کی، بنگالیوں نے جواباً اس کے سینے پر محبت کے تمغے سجا دیے۔"

جمال الدین نے آگے بڑھ کر اس میڈل کو منظور کے گلے میں پہنا دیا۔ تمام نوجوان خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

دو دن کے بعد اسی کالونی کے ایک مکان میں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس مکان کے ایک کمرے میں مغلی چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں مرد حضرات باتیں کر رہے تھے۔ ایک بنگالی کہہ رہا تھا: "ہم ایک آدمی کا تین سو ٹاکا لیتا ہے اور بوڑھا مانوس کو، بیمار مانوس کو لے کے نہیں جاتا ہے۔ کوئی اپنے سے جانا مانگتا ہے تو ہم کیا کرے گا۔ ہم کو تو ٹاکا سے مطلب ہے۔ اگر وہ راستے میں بیمار ہو جاتا ہے۔ آگے چلنے کو نہیں سکتا ہے تو ہم اس کو وہی جگہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ ایک مانوس کے واسطے دس مانوس کو نہیں روک سکتا۔ روکنے سے وہ لوگ بھی پھنسے گا اور ہم بھی پھنس جائے گا۔"

ایک شخص نے کہا: "ٹھیک ہے تم اپنے ٹاکا سے مطلب رکھو مگر میرے بیٹے کو لے جاؤ۔"

"تمہارے بیٹے کے پاؤں کا تلا نہیں ہے۔ وہ کھڑے ہونے کو نہیں سکتا، چلنے کو کیسے سکے گا؟"

"وہ چلے گا اور چلنے والوں سے زیادہ چلے گا۔ میں اپنے بیٹے کے حوصلوں کو خوب سمجھتا ہوں۔"

دوسرے لوگ اس کی تائید کرنے لگے۔ دلال کو سمجھانے لگے کہ اسے صرف اپنے پیسوں سے مطلب رکھنا چاہیے اگر ایک راہی چلتے چلتے گر پڑے۔ آگے نہ بڑھ سکے تو اس میں راہنما کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

"اس باری ہم چار جون (آدمی) کے نیٹے جالو (اس بار میں چار آدمیوں کو لے جاؤں گا)، ایک جون کا پاؤں ہے مگر نہیں ہونے کے مانند ہے۔ دوسرا بوڑھا مانوس ہے وہ راستے میں بہت گڑبڑ کرے گا۔ تیسری ایک گونگی ہے اس کے اوپر میں کوئی شک نہیں کرے گا مگر وہ زنانہ ہے اور زنانہ لوگ بہت مصیبت کرتا ہے۔"

مغلی سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ڈاکٹر غلام انبیا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا: "اور چوتھا شخص میرا یہ بھتیجا ہے اور یہ بنگالی ہے۔"

کسی نے پوچھا: "تعجب ہے۔ جب یہ بنگالی ہے تو اسے بنگلہ دیش سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے"، ایک جوان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا: "میں بنگالی ہوں اور میں پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے جانے پر کسی کو حیران نہیں ہونا چاہیے جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دشمن ہو سکتا ہے تو ایک بنگالی دوسرے بنگالی کا دشمن کیوں نہیں ہو سکتا، حالانکہ بنگالی زیادہ تر مسلمان ہیں۔ مگر وہ بنگالی اب ہم سے دور ہو رہے ہیں، ہم سے انھیں جو کام لینا تھا وہ انھوں نے لے لیا۔"

اس جوان کی آواز سنتے ہی عظمی یکلخت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ایسی تازگی آگئی جیسے کوئی دیرینہ شناسا مل گیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا: "پاکستان سے محبت کرنے والے صرف بہاری نہیں ہیں۔ بنگالی بھی ہیں اور ایسے بنگالی یہاں غدار سمجھے جاتے ہیں۔"

وہ دیوار سے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ آواز سننے کے بعد آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: "میرے والد سلیم الدین بھوئیاں دیناج پور کے ایک معزز جج تھے۔ وہ بحیثیت جج قانون کا احترام کرتے تھے۔ پاکستان سے وفا کرنے کے جرم میں انھیں میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ میں اپنی جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ اگر دشمنوں میں سے کسی نے مجھے پہچان لیا تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا: "سچ پوچھو تو میں اب تک شاید زندہ نہ رہتا۔ جب میرا اپنا کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا تو میں رہ کر کیا کرتا۔ میرے اندر کشمکش جاری تھی۔ زندہ رہوں یا مر جاؤں۔ خودکشی کر لوں یا دشمنوں سے انتقام لیتے لیتے اپنی جان دے دوں۔ اسی کشمکش کے دوران میری زندگی میں ایک ایسی ہستی آئی جس نے میرے اندر زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ میری آنکھوں کو مسرت کی وہ بینائی دی کہ دنیا بالکل نئی اور خوبصورت نظر آنے لگی۔ ابھی آپ لوگوں نے ایک لڑکی کا ذکر کیا تو میرے تصور میں وہی ہستی آکر مسکرانے لگی اور اپنا نام بتانے لگی: اوزما!"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ عظمی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "میں نہیں جانتا اوزما کیا نام ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے مگر یہ تمام دنیا کی عورتوں کے ناموں میں سب سے پرکشش نام ہے۔ وہ پیدائشی گونگی تو نہیں تھی۔ کسی نے اس کی زبان کاٹ دی تھی۔ اور اس کی کٹی ہوئی زبان سے محبت کا بس یہی نام ادا ہوتا ہے: اوزما!"

وہ اچانک ہی کھلے ہوئے دروازے کے عین وسط میں آکر کھڑی ہوگئی۔ کلیم الدین بھوئیاں کے سامنے جیسے بجلی لپک گئی ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہ کھلا رہ گیا۔ وہ ایک ٹک عظمی کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بجلی کوندنے کے بعد کچھ اور نظر نہ آ رہا ہو۔ بس اسی بجلی کا تصور رہ گیا ہو اور وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ تصور ہی ہے یا وہ حقیقتاً سامنے آگئی ہے؟

◆

یہ روز کا معمول تھا۔ نین تارا اور خسرو رات کے آٹھ بجے بڑی دیدی کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ تلسی رام کے آنے کے بعد بھی یہی معمول رہا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی کی چھت پر بیٹھ کر گھنٹے دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی بہار گفتگو کا موضوع بنتا تھا، کبھی بنگلہ دیش کے حالات پر تبصرے ہوتے تھے۔ رات کے دس بجے تک وہ دونوں کمرے میں آجاتے تھے۔ ان کے لیے بڑی دیدی نے شروع دن ہی سے ایک کمرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ انھیں میاں بیوی سمجھتی تھی۔ لہٰذا نین تارا کو ایک سہاگن کا بھرم رکھنا پڑتا تھا۔

جب وہ پہلی بار خسرو کے ساتھ سید پور آئی تھی تو بڑی دیدی نے عظمی کو الگ کمرہ دیا تھا۔ نین تارا! ذرا دیر کے لیے بھول گئی تھی کہ اسے ایک سہاگن کا رول ادا کرنا ہے۔ وہ عظمی کے ساتھ سونے جا رہی تھی۔ اسی وقت بڑی دیدی نے آکر اس کا ہاتھ پکڑا، پھر اسے کھینچتے ہوئے خسرو کے کمرے میں لے آئیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں، شاید میاں بیوی میں ناراضگی ہے۔ اسی لیے نین تارا عظمی کے پاس سونے جا رہی تھی۔ بہرحال انھوں نے اپنی دانست میں میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کے لیے انھیں ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ وہ رات نین تارا کے لیے قیامت کی رات تھی۔ اگرچہ وہ غیر نہیں تھا۔ اپنا ہی تھا۔ دل سے قریب تھا۔ اس کے باوجود وہ تمام رات بند دروازے سے لگی بیٹھی رہی جیسے خسرو پکڑنے آئے گا تو وہ دروازہ توڑ کر نکل جائے گی۔

خسرو نے سمجھایا تھا: "دیکھو تم آرام سے پلنگ پر سو جاؤ۔ میں زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹ جاؤں گا۔ اگر تم مجھ سے ڈرتی رہو گی اور بڑی دیدی کے سامنے غیر شعوری طور پر مجھ سے کتراتی رہو گی تو وہ تاڑ لیں گی۔ تمھیں یہاں رہ کر یہ رشتہ نبھانا ہے۔"

"میں نہیں سوؤں گی۔ بس یونہی دروازے کے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"اگر تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی ہو اور مجھ سے ڈرتی ہو تو چلو ہم بڑی دیدی کے سامنے اعتراف کر لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ ابھی ہماری رخصتی نہیں ہوئی ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: "نہیں انھیں معلوم ہوگا تو پھر وہ تمھیں روک لیں گی۔ مجھے پاکستان میں اپنے بھائیوں کے پاس پہنچانے کے لیے یہاں سے کسی قافلے کے ساتھ روانہ کر دیں گی۔ میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے اور رات گزرتی رہی۔ اس رات دونوں سو نہ سکے پھر دوسری رات آئی۔ اس کے بعد تیسری رات آئی۔ رفتہ رفتہ نین تارا کے دل میں اعتماد پیدا ہوتا گیا۔ وہ خسرو کی شرافت اور پارسائی کی قائل ہوگئی۔ اب وہ رات کے

کھانے کے بعد ہنسی خوشی کمرے میں آ جاتی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اپنے لیے فرش پر چٹائی بچھاتی تھی۔ پھر ایک تکیہ رکھتی تھی اور بڑے اطمینان سے لیٹ جاتی تھی۔ خسرو پلنگ پر رات گزارتا تھا۔

رات تو گزر جاتی تھی۔ اعتماد بھی بحال ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایسے شریفانہ ماحول کے پروردہ تھے کہ گناہ کی ترغیب پر مر سکتے تھے مگر گنہگار نہیں بن سکتے تھے۔ نہ وہ بہک سکتے تھے نہ ایک دوسرے کو بہکا سکتے تھے۔ تاہم انہیں بڑی مشکلوں سے نیند آتی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر کروٹیں بدلتے رہتے تھے۔ کبھی یہ دائیں کروٹ ہوتی اور وہ بائیں کروٹ ہوتا تو دونوں کی نظریں ٹکرا جاتی تھیں۔ وہ پلنگ پر سے اور یہ فرش پر سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جیسے زمین آسمان کو اور آسمان زمین کو دیکھ رہا ہو۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساڑی کو ادھر ادھر سے درست کرنے لگی۔ خسرو پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

وہ سر جھکا کر بولی: "بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "یوں لگتا ہے جیسے ہم دونوں کو جہنم میں جھونک دیا گیا ہو۔"

"جب تک ہم یہاں رہیں گے، جلتے رہیں گے۔"

"بڑی دیدی نے کہا ہے کہ ایک ہفتے بعد ہی وہ ہمارے ساتھ ہندوستان جائیں گی پھر ہم وہاں سے..."

مین تارا نے بات کاٹ کر کہا: "وہ نہیں جائیں گی۔ تم سمجھ رہی نہیں کہ ہریا پر مقدمہ چل رہا ہے اور اس مقدمے میں ان کی پیشی بھی ہوتی ہے۔"

خسرو نے کہا: "دیدی نے تحریری بیان دے دیا ہے۔ اب ان کی پیشی نہیں ہوگی۔"

"ہو یا نہ ہو۔ جب تک مقدمہ چلتا ہے کاشی کو یہاں رہنا پڑے گا اور دیدی اسے تنہا چھوڑ کر ہندوستان نہیں جائیں گی۔"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کیسے جائیں گے؟"

"پوچھا تھا کہنے لگیں کسی بھروسے کے آدمی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں ہندوستان یا نیپال بھیج دیا جائے گا۔"

"پھر تو ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے۔"

"مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔ اس قید خانے میں ذہنی اذیتیں مل رہی ہیں۔"

"میں [illegible] ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ کمرہ تنگ سا ہے۔ ہمارے [illegible] اصل بات احساسات کی ہے۔"

"بات احساسات کی نہیں حالات کی ہے۔ یہ گھر ہمارا نہیں ہے، یہ زمین پاکستان کی زمین نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہیں مگر ہمارے رشتے دار نہیں ہیں۔ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے سروں پر ننگی تلواریں لٹک رہی ہیں۔ احساسات دراصل حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ کوئی یہ ننگی تلواریں ہٹا دے پھر ہمارے سروں پر ہمارے وطن کا آسمان ہو تو احساسات یکسر بدل جائیں گے۔ تم دیدی سے کہتی کیوں نہیں؟ وہ فوراً ہماری رہائی کا انتظام کر دیں گی۔"

"میں نے دیدی اور جیجا جی دونوں سے کہا تھا۔ وہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے فکرمند ہیں۔"

"تم اپنی طرح سبھی کو فکرمند سمجھنے لگتے ہو۔ میرا تو یہاں ایک ذرا جی نہیں لگتا۔ کھاتی ہوں تو کھایا نہیں جاتا۔ لقمہ حلق میں پتھر کی طرح اٹکتا ہے۔ نیند نہیں آتی ہے۔ اگر آتی ہے تو بھیانک خواب آتے ہیں۔"

"مین تارا! ہم آگ اور خون کے دریا سے گزر کر آئے ہیں۔ کیا تم کچھ دنوں تک حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتیں؟"

"نہیں! یہاں ہر لمحہ جھوٹے الزامات اور سازشوں کا ڈر لگتا ہے۔ تم نے یہاں آ کر اناج فروخت کیا تھا۔ تمہارے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ گنہگار ہریا تھا مگر الزام تم پر آیا۔ لوگوں نے تمہیں کس بری طرح مارا پیٹا۔ تمہیں ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی ہیں۔ دیدی نے یہ سب تماشا دیکھا لیکن چپ رہیں۔ بعد میں انہیں غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے معافی مانگ لی۔ ہم نے بھی صاف دل سے معاف کر دیا ہے لیکن دل کے آئینے میں جو بال پڑ گیا ہے، وہ کبھی نہیں جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ کاشی سے سامنا ہوتا ہے تو میری گردن جھک جاتی ہے۔ میں نے گناہ نہیں کیا ہے لیکن گناہ حوالے کر کے مجھے اس سے منسوب کیا گیا۔ یہ ایسی شرمناک بات ہے کہ میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ دن رات سامنا ہوتا ہی رہتا ہے۔ پھر جیجا جی اور دیدی کے سامنے اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ بات مجھے ایک ذرا اچھی نہیں لگتی۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔"

"ہاں مجھے چھوڑ کر بھاگ سکتے ہو۔ دراصل میں تمہارے ذہن کی زنجیر ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی تو تم مردانہ وار کسی راستے سے بھی ہندوستان کی طرف یا نیپال کی طرف نکل جاتے۔"

"تنہا سرحدوں کو پار کرنا مردانگی نہیں ہے۔ مرد وہ ہوتے ہیں جو اپنے رشتوں اور اپنی [illegible] کو اپنے ساتھ سمیٹ کر [illegible] سے

سے گزرتا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے میں اپنی جان یہاں چھوڑ دوں اور زندہ لاش کو گھسیٹتے ہوئے یہاں سے لے جاؤں۔ آئندہ ایسی بات نہ کہنا۔"

"نہیں کہوں گی لیکن میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا ہے جب تک دیدی ہماری روانگی کا انتظام نہیں کریں گی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

دوسری صبح خسرو کمرے سے نکل کر غسل خانے میں گیا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ وہاں کا یہ دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی غسل کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ہی بڑو دیدی کسی کو بھی رسوئی میں آنے کی اجازت دیتی تھی۔ زمین تارا نے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر سلاخوں کے پار دیکھا۔ صحن کے دوسری طرف رسوئی گھر تھا۔ خسرو وہاں پہنچ کر کہہ رہا تھا: "دیدی! بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ جلدی کھانا دیجیے۔"

رسوئی گھر سے پوریاں تلنے کی آواز آ رہی تھی۔ خالص گھی کی مہک نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ بڑو دیدی پوچھ رہی تھی۔ "بھوجائی نے غسل کر لیا ہے؟"

"نہیں، وہ غسل نہیں کرنا چاہتی ہے۔ مجھ سے جھگڑا کر رہی ہے۔"

"تم اسے پریشاں کیوں کرتے ہو۔ جاؤ اسے منا کر لاؤ۔"

"مجھ سے نہیں مانے گی۔ آپ ہی جا کر اسے منائیں۔"

"ہے رام! تم نہیں جانتے۔ جب تک تم میں سے کوئی غسل نہ کرے میں سامنے نہیں جاتی۔ اگر میں جاؤں تو پھر پوجا نہیں کر سکتی۔ چھی چھی۔"

"پھر تو مجھے بھی تارا کے سامنے نہیں جانا چاہیے کیونکہ میں نے بھی غسل کر لیا ہے۔ آپ کی طرح مجھے بھی دور سے چھی چھی کہنا چاہیے۔" بڑو دیدی خسرو کا مذاق نہیں سمجھ سکیں۔

"ارے دور سے اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو منا تو سکتے ہو۔ اسے غسل کرنے کے لیے کہہ سکتے ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ رسوئی گھر سے باہر آئیں پھر بیچ صحن میں پہنچ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "زمین تارا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ جاؤ غسل کیوں نہیں کرتی ہو؟"

اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا: "میں نہ تو غسل کروں گی نہ کچھ کھاؤں گی۔"

"خسرو کا غصہ ہم پر کیوں اتار رہی ہو؟"

"مجھے غصہ کسی پر نہیں، صرف اپنے حالات پر ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ [illegible] اپنے رشتے داروں کا خیال آتا رہتا ہے۔ [illegible] ان کے پاس نہیں بھیجیں

گی۔ مجھے کھانا اچھا لگے گا نہ سونا۔ آپ نے مجھے نئی ساری خرید کر دی تھی۔ میں نے بہانہ کر دیا تھا کہ کل پہنوں گی لیکن دیدی! وہ کل کبھی نہیں آئے گا۔ نیا لباس خوشی کی علامت ہے۔ جب تک مجھے اپنے بھائیوں کے درمیان پہنچنے کی خوشی حاصل نہیں ہوگی میں وہ ساری نہیں پہنوں گی۔"

تلسی رام نے غسل خانے سے نکلتے ہوئے تولیہ اپنے کاندھوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہو گئی۔ نند بھاوج میں لڑائی ہو رہی ہے؟"

شانتا نے کہا: "ابھی تو نہیں ہو رہی ہے لیکن آپ ہمارے درمیان ضرور لڑائی کرائیں گے۔ میں ایک ہفتے میں دس بار آپ سے کہہ چکی ہوں۔ ان کے جانے کا بندوبست فوراً کر دیں لیکن آپ اس کان سے سنتے ہیں۔ اس کان سے نکال دیتے ہیں۔"

تلسی رام نے تولیے سے اپنے سر کے گیلے بالوں کو پونچھتے ہوئے کہا: "شانتا! میں بنیے کا بیٹا ہوں۔ کوئی کام کرتا ہوں تو اس میں اپنا فائدہ بھی دیکھتا ہوں۔ خسرو اور زمین تارا کو کلکتہ سے یہاں بھیجا تو ان کے ساتھ اناج کا ویگن بھی یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ دونوں ہندوستان جائیں گے۔ تو میں ان کے ساتھ ساتھ اپنی چاندی بناؤں گا۔"

خسرو نے پوچھا: "کیا اس بار بھی ہمیں کچھ مال لے کر جانا ہوگا؟"

"ہاں، کوئی بھاری بھرکم مال نہیں ہے۔ میں ایک ہفتے سے بھاگ دوڑ کر کے یہاں کے لوگوں سے چاندی خرید رہا ہوں۔ معاملہ یہ ہے کہ میں یہاں پاکستان اور بنگلہ دیش کی کرنسی میں کما رہا ہوں۔ یہ کرنسی ہندوستان بھیجوں گا تو سو روپے کے بدلے ساٹھ روپے ملیں گے اور چاندی خرید کر بھیجوں گا تو اسے بیچنے پر سو کی جگہ سوا سو روپے ملیں گے۔"

"لیکن جیجا جی، ہندوستان میرے لیے اجنبی ملک ہے۔ میرے لیے قدم قدم پر وہاں خطرات ہوں گے۔ میں چاندی لے جا کر کہاں فروخت کروں گا؟"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ یہ سب میرے آدمی کریں گے اور میرے آدمی تم دونوں کو جہاں تک پہنچا دیں گے۔ اسے بھی

بریفالٹ کی تصنیف MAKING OF HUMANITY میں صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اہل مغرب نے سائنس اور سائنٹیفک طریق کار پہلی بار مسلمانوں سے سیکھا

نین تارا! تمھارے لیے خوشخبری ہے کل تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب غسل کرو۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤ اور ہنستی بولتی رہو۔ خوش رہو۔"

وہ خوش ہوگئی۔ فوراً ہی غسل کرنے چلی گئی۔ شام کے وقت بڑی دیدی نے دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کمرے میں پہنچے تو دیکھا بستر کی سفید چادر پر زیورات کے ڈبے کھلے ہوئے رکھے تھے۔ انھوں نے پوچھا: "خسرو! تم نے مجھے کتنے روپے رکھنے کے لیے دیے تھے؟"

"دیدی! دو برس ہوگئے۔ میں بھول گیا ہوں۔ شاید دس ہزار روپے دیے تھے۔"

"کل تم جانے والے ہو۔ اس لیے حساب صاف ہونا چاہیے تم نے بارہ ہزار دیے تھے۔ یہ جانتے ہی ہو کہ ویسے بھی تو میں بنیے کی بیوی ہوں۔ ہمارے ہاں پیسے کو تجوری میں بند کرکے نہیں رکھا جاتا۔ اسے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ تمھاری رقم کو میں نے ایک چھوٹے سے کاروبار میں لگایا تھا۔"

وہ ایک بہی کھاتہ کھولتے ہوئے کہنے لگیں: "اس میں کمائی اور لاگت کا پورا حساب لکھا ہوا ہے۔ تم اسے دیکھ لو۔"

"نہ تو میں کاروبار کرتا ہوں اور نہ ہی میں نے وہ رقم آپ کو کسی کاروباری منافع کے لیے دی تھی۔"

انھوں نے کھاتے کو بند کرتے ہوئے کہا: "ہمارے ہاں باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی میں بھی کاروباری لین دین ہوتا ہے۔ کوئی اپنا منافع نہیں چھوڑتا۔ تم صرف اتنا سمجھ لو کہ دو برس میں تمھارے بارہ ہزار، بائیس ہزار روپے بن گئے ہیں۔ تمھارے بھائی تمھیں اس میں سے دس ہزار روپے منافع کے طور پر دے رہے ہیں۔ بارہ ہزار تمھارے اپنے ہیں۔ آٹھ ہزار میں دے رہی ہوں۔ اس طرح تمھیں یہاں سے جاتے وقت تیس ہزار روپے ملیں گے۔"

وہ مسکرا کر بولا: "مجھے خوشی ہے کہ میرے بارہ ہزار سے آپ لوگوں نے چالیس ہزار کمائے اور مجھے بھی تیس ہزار دے رہی ہیں۔"

بڑی دیدی نے کہا: "وہ بھی اس طرح کہ ہم نقد روپے نہیں دیں گے کیونکہ ہندوستان جانے کے بعد ان روپوں کی قیمت گر جائے گی۔ میں سونا دے رہی ہوں۔ بعد میں ہندوستان یا پاکستان جاکر فروخت کرو گے تو تیس ہزار سے زیادہ ملیں گے۔"

نین تارا نے آگے بڑھ کر کہا: "دیدی! آپ کتنی اچھی ہیں ہم یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

"بھولوں گی میں بھی تمھیں کبھی نہیں بھولنا چاہتی لیکن تم نے مجھے کبھی دلہن کا روپ نہیں دکھایا۔ یہاں میرے بھائی کی دلہن بن کر آئیں بھی تو اجڑی ہوئی سی۔ کتنی بار کہا۔ نئے کپڑے پہنو مگر تم نے نہیں پہنے۔ اب جانے سے پہلے میری یہ خواہش پوری کر دو۔ آج رات تم سرخ جوڑا پہنو گی۔ میں تمھیں یہ گہنے پہناؤں گی، تمھارا سنگھار کروں گی اور تمھیں دلہن بنا کر اپنے بھائی کے کمرے تک پہنچاؤں گی کیونکہ نئی دلہن کو بہنیں اپنے بھائی کے کمرے تک پہنچاتی ہیں۔"

نین تارا نے ایک دم سے گھبرا کر خسرو کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا رہا تھا۔ بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔ یہ کچھ کم نہ تھا کہ دونوں کو ہر رات ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی زیادتی ہونے والی تھی۔

⁂

روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ چار آدمیوں کا مختصر سا قافلہ چاٹگام سے برما کی طرف جانے والا تھا۔ منظور فٹبال پلیئر کے مکان کے سامنے جوانوں اور بزرگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بنگالی جوان اس کے لیے ایک گاڑی لے کر آئے تھے۔ دلال نے کہا تھا کہ ان سب کو آٹھ یا نو بجے تک سٹینڈ ہوٹل پہنچ جانا چاہیے اور اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ کلیم الدین بھوپالی جس دن سے سردار بہادر کالونی آیا تھا۔ اس دن سے ایک بہاری فیملی کے ساتھ وہیں دن گزار رہا تھا۔ ڈاکٹر غلام ضیا نے اس کے لیے راشن پہنچایا تھا اور انھیں نقد روپے بھی دیے تھے تاکہ بھوپالی اس فیملی پر بوجھ نہ بنے۔

دوسری طرف سید پور سے آنے والے ظاہر محمد عظمیٰ کو کسی بہاری کے مکان میں رکھنا چاہتے تھے لیکن عظمیٰ نے بھوپالی کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ رہنے کی ضد کی۔ زبان سے ضد کرتی تو کوئی نہ سمجھتا۔ اس نے اشاروں سے سمجھایا کہ جہاں یہ ہوگا وہاں میں رہوں گی۔ لہٰذا اسے بھی بھوپالی کے ساتھ اسی فیملی میں چھوڑ دیا گیا۔

وہاں کے لوگ عظمیٰ کی بولی کو حیرانی سے سنتے تھے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کلیم الدین بھوپالی اس کی باتیں سنتا تھا اور یوں مسکرا کر سر ہلاتا تھا جیسے سمجھ رہا ہو۔ ایک ہی مکان میں رہنے کے بعد جب عظمیٰ کو کچھ کہنے کا موقع ملا تو اس نے کہا: "تم بھوڑا اشے ہو (تم بہت اچھے ہو)"

اس مکان میں رہنے والے حیرانی سے اس کی بولی سن رہے تھے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے وہ بولتی جا رہی تھی: "بھوپالی! تم مت، اچھے ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے اچھے لوگوں کی حفاظت میں چھوڑنا چاہتے تھے اس لیے اس شہر سے دور کہیں جا کر گم ہو گئے تھے۔"

وہ خاک نہیں سمجھ رہا تھا مگر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ جب ایک لمبا سفر ٹھہرا اور اس کے بعد بھی عظمیٰ اسی اعتماد سے اس کے ساتھ رہنا چاہے گی تو پہلے وہ اس کی کٹی ہوئی زبان کی بولی سمجھے گا۔ اسے لانے والے لوگوں نے بتا دیا تھا کہ اس کا نام عظمیٰ ہے۔ کلیم الدین بھوتیاں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب وہ عظمیٰ کہتی ہے تو اس کے منہ سے اوزما کا لفظ ادا ہوتا ہے۔ تو ان میں کون سے حروف ایسے ہیں جو صحیح ادا نہیں ہوتے؟

وہ چھ دنوں تک اس مکان میں رہے۔ بھوتیاں اس کی باتوں کو کسی حد تک سمجھنے لگا۔ ساتویں دن صبح ان کی روانگی تھی۔ منظور فٹبال بلیئر کے مکان کے سامنے ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ محلے کے لوگ جمع تھے اور انھیں رخصت کر رہے تھے۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا "میں آپ لوگوں کے ساتھ اس گاڑی میں نہیں جاؤں گا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہاں میرے کچھ دشمن ہیں۔ جنھیں میں دیکھ چکا ہوں لیکن انھوں نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس گاڑی میں سفر کے دوران وہ مجھے دیکھ لیں پھر میرے ساتھ ساتھ آپ لوگ بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

ایک نے پوچھا "تو کیا تم سفینہ ہوٹل نہیں جاؤ گے؟"

"جاؤں گا مگر دوسرے راستے سے اور تنہا جاؤں گا۔"

"کیا تم یہاں کے راستوں سے واقف ہو؟"

"میں یہاں ایک سال تک رہ چکا ہوں۔ راستوں کو پہچانتا ہوں۔"

ایک نے کہا "یہ درست کہہ رہا ہے۔ ایک کی وجہ سے دوسروں کو نہیں پھنسنا چاہیے۔ پھر یہ جوان، صحت مند اور دلیر ہے۔ سفینہ ہوٹل تک پہنچ جائے گا۔ تم لوگ گاڑی میں چلے جاؤ۔"

عظمیٰ تیزی سے چلتے ہوئے بھوتیاں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی "میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

اس کی گڑبڑ زبان کو سن کر ایک نے پوچھا "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

کلیم الدین بھوتیاں نے پوچھنے والے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو۔ میں نو بجے تک سفینہ ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ عظمیٰ یاد رکھو۔ ہمارے ساتھ جو دلال جا رہا ہے۔ اس کی ذمے داری بس اتنی ہے کہ وہ سرحد تک ہماری رہنمائی کرے لیکن ہر قدم پر تمھاری حفاظت کرنا میری ذمے داری ہے۔ اسی لیے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ راستے میں میرے دشمن تمھارے دشمن بن جائیں۔ جہاں موقع دیکھوں گا۔ تمھارے قریب آؤں گا اور دور ہی سے تمھاری حفاظت کرتا رہوں گا۔ اب جاؤ دیر نہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ وہاں تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

عظمیٰ نے سر کو جھکایا۔ وہ اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا، خود کو تنہا پایا تھا۔ رشتے دار اپنے نہیں تھے۔ ایک منعم باللہ نے اسے اپنایا تھا لیکن دشمنوں سے بدتر سلوک کیا تھا۔ یمن تارا اور خسرو نے بھرپور محبتیں دی تھیں لیکن دنیا والوں کی الزام تراشی نے ان سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ کلیم الدین بھوتیاں ایک بار پھر اسے مل گیا تھا۔ جیسے ڈوبتی ہوئی امید پھر ابھر آئی ہو۔ اس سے گہری شناسائی نہیں تھی لیکن اس پر گہرا اعتماد تھا۔

بھوتیاں نے اس کے بازو کو تھام کر اسے گاڑی تک پہنچا دیا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ منظور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انھیں لے جانے والا دلال پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ ان کا بوڑھا ہمسفر بیٹھا ہوا تھا۔ عظمیٰ اس بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

جب وہ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی تو کلیم الدین بھوتیاں اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ سردار بہادر کالونی کے پیچھے سرسبز و شاداب پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر مشرقی پاکستان کے سابق گورنر ذاکر حسین کا بنگلہ تھا۔ اب وہ بنگلہ ویران تھا۔ دو چار نوکر وہاں رہتے تھے۔ دور دور تک سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بھوتیاں اس بنگلے سے دور کا چکر لگا کر پہاڑی کی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا اور تصور میں عظمیٰ کو دیکھتا رہا۔ ان حروف کو یاد کرتا رہا جو عظمیٰ کی کٹی ہوئی زبان سے صحیح ادا نہیں ہوتے تھے۔ انھیں یاد رکھنے کے بعد ہی اس کی باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔

کافی دور جانے کے بعد وہ پہاڑی سے اتر گیا۔ ایک پختہ سڑک پر چلنے لگا۔ آگے جا کر ایک بے بی ٹیکسی (آٹو رکشہ) مل گئی۔ وہ اس میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف جانے لگا۔ [illegible] سے گزرتے وقت اسے ایک سرکٹ ہاؤس نظر آیا۔ یہ وہی سرکٹ ہاؤس تھا جہاں بعد میں بنگلہ دیش کے صدر ضیاء الرحمٰن کو گولی ماری گئی تھی۔ اسی سرکٹ ہاؤس میں کبھی پاکستان آرمی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ سڑک کے دوسری طرف چٹاگانگ کا مشہور نیاز اسٹیڈیم نظر آ رہا تھا۔ وہ تاسی ڈیوڑھی سے گزرتا ہوا تین پل ماتھا کے [illegible] پہنچ گیا۔ آگے جی۔ ٹی روڈ تھا۔ اس کے اطراف ہارڈ ویئر کی دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی دور بڑی گرانڈ ہوٹل اور [illegible] ہوٹل نظر آ رہے تھے۔ وہاں اسے سفینہ ہوٹل کے [illegible] وہ بھوتیاں کو ساتھ لے کر ہوٹل کے اندر [illegible] لیکن [illegible] وہاں [illegible] پہنچے ہوئے ہمسفر [illegible] ہوٹل کی

میز کے دوسری طرف منظور نظر آیا۔ کلیم الدین جویاں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا "منظور بھائی! کیسی طبیعت ہے۔ پاؤں میں تکلیف زیادہ تو نہیں ہے؟"

وہ مسکرانے لگا لیکن مسکراہٹ تھکی تھکی سی تھی۔ اس نے اپنی تھکن کو چھپاتے ہوئے کہا "بالکل خیریت سے ہوں۔ انشاءاللہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی ہم سب بخیریت رہیں گے۔"

بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "آمین!" منظور نے پوچھا "آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

جویاں نے کہا "میں اپنے طور پر محتاط رہ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب کسی نے دیکھا ہو تو یہ خدا ہی جانتا ہے۔"

دلال نے ایک آدمی کو وہاں لا کر ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہمارا ساتھی ہے۔ ادھر سے یہ تم لوگوں کو لے کر جائے گا۔ [illegible] ڈیوٹی [illegible] ختم ہو گیا ہے۔"

ساتھ آنے والے نے کہا "ہماری گاڑی ٹھیک [illegible] ہوٹل کے سامنے پہنچ جائے گی۔ میں نے آپ [illegible] کسی نے کچھ خشک چیزیں [illegible] مشورہ ہے [illegible] آپ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں۔"

[illegible]

عظمیٰ نے انکار میں سر ہلایا۔ آنے والے نئے دلال نے کہا۔ [illegible] کھانا نہیں ملے گا۔ یہ [illegible] پیٹ بھر [illegible] آئے نصیب میں کیا لکھا ہے۔"

[illegible] عظمیٰ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ [illegible] اپنے لیے نہیں میرا ساتھ رہنے کے لیے کچھ کھاتی رہو۔"

[illegible] ٹھیک ساڑھے دس بجے وہاں [illegible] گاڑی آ پہنچے گی۔

منظور بڑی آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب اس کے [illegible] آہستگی [illegible] ہوٹل کے [illegible]

[illegible]

"میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

بوڑھا زبان تو نہ سمجھ سکا مگر مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ وہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے جانے لگا "اسی لیے تو قیامت برپا ہونے والی تھی۔ یہ لڑکیاں کسی جوان کو دیکھ کر اس سے چپک ہی جاتی ہیں۔ توبہ توبہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ بے شرمی کی حد ہو گئی۔"

بڑے میاں کے جانے کے بعد جویاں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ! اب ہم چلیں۔"

وہ کیبن سے نکل آئے۔ عظمیٰ نے ساری پہنی ہوئی تھی ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ اس کے انداز سے اس کے پہناوے سے پتا چلتا تھا کہ وہ بنگالن ہے۔ کلیم الدین جویاں نے تنگ پائنچے کی پتلون اور شرٹ پہنی تھی۔ شرٹ [illegible] تھی۔ اب [illegible] دونوں ہی خوبصورت [illegible] میاں بیوی سمجھ رہے ہوں گے۔

ہوٹل کے باہر [illegible] نے انہیں دیکھتے [illegible] کر بیٹھ جاتی تھی [illegible] سے بھی دیکھ [illegible] تھی۔ اس کے پاس [illegible] کے لیے جگہ خالی تھی [illegible]

دلال نے [illegible]

[illegible] پھر کہا "میں [illegible] یہاں تو آغاز سفر سے ہی پھول بننے لگے ہیں۔"

جویاں نے [illegible] وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا [illegible] تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس [illegible] پیچھے میں بیٹھتا ہوں۔ تم [illegible]

[illegible] سے بولتے ہوں۔

[illegible]

اس نے دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ جب کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو پانچویں مسافر نے ذرا سا جھک کر عظمیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا: "میرا نام بابر ہے۔ تمھارا نام؟"

عظمیٰ نے اسے ناگواری سے دیکھا پھر [illegible] زبان میں کچھ بولنے لگی۔ اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا پھر حیران ہو کر کہا: "بھئی! میں نے اتنا لمبا نام تو نہیں پوچھا تھا۔"

منظور اگلی سیٹ پر دلاّل کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر گھما کر کہا: "مسٹر بابر! پلیز آپ کسی کو چھیڑنے کا انداز اختیار نہ کریں۔"

بابر نے جواب دیا: "مسٹر! شاید آپ کو نہیں معلوم کسی بھی عورت کو تنہائی میں چھیڑا جاتا ہے۔ چار آدمیوں کے سامنے اس سے بات کی جائے تو بات کرنے والے کی نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا۔"

کلیم الدین جونپوری نے کہا: "تمھارے من میں کھوٹ ہو یا نہ ہو عظمیٰ کے تیور سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تم سے بات کرنا گوارا نہیں کرتی ہے۔"

بابر نے مسکرا کر عظمیٰ کو دیکھا پھر کہا: "اچھا تو عظمیٰ نام ہے۔ بہت مختصر ہے مگر یہ بہت دیر تک بتاتی رہیں۔"

دلاّل نے ہنستے ہوئے کہا: "بھئی آپ لوگ بُرا نہ مانیں بابر ذرا من موجی ہے۔ بولتا بھی بہت ہے۔"

کسی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ خاموشی رہی۔ کار تیز رفتاری سے کاکس بازار کے راستے پر کالوگھاٹ کی طرف جا رہی تھی۔ جانے والے مسافروں کو منزل کا پتا معلوم تھا مگر راستے کی پہچان نہیں تھی۔ وہ سب اس دلاّل کے محتاج تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ کچھ اپنے رشتے داروں کو یاد کر رہے تھے اور کچھ پیش آنے والے حالات کے متعلق اندیشوں میں گرفتار تھے۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ بنگال اور برما کے درمیانی جنگلوں میں زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔ جب تک وہ بچوں کو شیر بھیڑیے سے ڈراتے رہے تھے اب ان خطرناک جانوروں سے سامنا ہونے والا تھا۔ سنا تھا کہ جنگلی ہاتھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ان مسافروں میں سے کسی نے دیکھا نہیں تھا صرف سنا تھا اور سنی سنائی بات کہاں تک درست ہے یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔

تقریباً پون گھنٹے کی خاموشی کے بعد بابر نے اکتا کر ادھر ادھر دیکھا پھر پیچھے پلٹ کر بیٹھے ہوئے بڑے میاں سے مخاطب ہو کر پوچھا: "بابا! آپ کا نام کیا ہے اور کس سے ملنے جا رہے ہیں؟"

"میرا نام احسان الحق ہے۔ میرا اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں رہا۔ سب موت کے منہ میں چلے گئے۔ تنہا ہوں۔ بھٹکنے کے لیے زندہ رہ گیا ہوں۔"

"بھٹکنے کی ضرورت کیا تھی۔ آپ بنگلہ دیش میں ہی رہتے۔ آپ کی عمر کتنی رہ گئی ہے۔ خواہ مخواہ راستے میں ہمارے لیے مصیبت بنیں گے۔"

منظور نے کہا: "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم جیسے جوانوں کو بزرگوں کا سہارا بننا چاہیے انھیں بخیریت منزل تک لے جانا چاہیے اور تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

اس نے کہا: "مسٹر منظور! تمھارے بھی دو پاؤں بیکار ہیں صاف کیوں نہیں کہتے کہ صرف بزرگوں کو نہیں، تمھیں بھی ہمارا سہارا ملنا چاہیے۔"

"اگر کوئی ایسا وقت آیا تو میں مر جاؤں گا مگر تمھارا سہارا کبھی نہیں لوں گا۔"

بڑے میاں احسان الحق نے کہا: "بیٹے! یہ سرپھرا جوان ہے۔ اس کے منہ نہ لگو۔ جب یہ بوڑھا ہوگا اور جب کوئی جوان اس کے منہ پر ایسی ہی باتیں کرے گا تو پتا چلے گا کہ کوئی ہمیشہ جوان نہیں رہتا۔ آئندہ نسل کے جوانوں کے طعنے سننے کے لیے وہ بھی ایک دن بوڑھا ہو جاتا ہے۔"

بابر ہنستے ہوئے بولا: "حقیقت کو سب سمجھتے ہیں مگر کوئی یاد نہیں رکھتا۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے لیکن ہم موت کو بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن آنے والے بڑھاپے کو ایک ذرا یاد نہیں کرتے اور جب یاد کرتے ہیں تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہمارے جوان بچے ہمیں سہارا دیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی، خود تو بوڑھے ہونے کے بعد جوانوں کا سہارا تلاش کرنا چاہتے ہو اور ابھی جو تمھارے سامنے بوڑھے ہیں، انھیں بیزاری سے دیکھ رہے ہو۔"

بابر نے کار کی چھت کو دیکھتے ہوئے کہا: "یہی ہوتا آیا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ ذہانت سے بڑھ کر ذہین ہے۔ عظمت سے بڑھ کر عظیم ہے۔ طلب سے بڑھ کر طالب ہے۔ پیسے سے بڑھ کر پیسو ہے اور شرم سے زیادہ شرمیلا ہے۔"

اس نے کہنے کے دوران عظمیٰ کو دیکھا پھر کہا: "یعنی جو کر گزرنا چاہیے اس پر شرماتا ہے۔ اتنا بڑا ہے کہ دوسروں کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ اپنے بڑھاپے میں سہارا لو گے اور دوسروں کے بڑھاپے کو دھتکارتے ہو تو بڑے میاں! میں انسانی سوچ کا المیہ ہی بیان کر رہا ہوں۔ انسان اتنا مصلحت اندیش ہے کہ خود ڈوبے تو پکارتا ہے۔ مجھے بچاؤ، دوسرا ڈوبے تو آواز لگاتا ہے۔ اُسے بچاؤ۔"

ظہیر الدین جوتیاں نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن راستے میں تم پر کوئی مصیبت آئے گی تو تم مدد کے لیے پکارو گے اور ہم میں سے کوئی تھک کر گر پڑے گا تو ہمیں اٹھانے کے لیے کسی دوسرے کو آواز دو گے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے اتنی فرصت نہیں ملے گی کہ جنگل میں تم لوگوں کے لیے کسی کو آوازیں دیتا پھروں۔ اگر بڑے میاں کہیں بیٹھ گئے یا دونوں پاؤں سے اپاہج منظور جانی چلنے سے معذور ہو گئے تو میں انھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

سب اسے ناگواری سے دیکھنے لگے۔ دلاّل نے اچانک کار کی رفتار سست کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو! فوجی گاڑیاں آ رہی ہیں۔ چلو فوراً تالیاں بجانا، ہنسنا بولنا اور گانا شروع کر دو۔ یہ تاثر دو کہ چھاترو طالب علم پکنک منانے جا رہے ہیں۔"

وہ سب فوراً ہی زور زور سے تالیاں بجانے اور ہنسنے بولنے لگے۔ بابر نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا: "ہائے ہائے! یہ بڑے میاں طالب علم جیسے نظر آئیں گے اور طلبا کے درمیان یہ گڑبڑ بولنے والی کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟"

ظہیر الدین جوتیاں نے منظور کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم دونوں سیٹوں کے درمیان بیٹھ جاؤ۔"

اس نے جوتیاں کی ہدایت پر عمل کیا۔ منظور دونوں سیٹوں کے درمیان دبک گئی۔ جوتیاں نے اخبار کا ایک بڑا سا صفحہ اس پر رکھ دیا۔ دوسرا صفحہ بڑے میاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ اسے پڑھنا شروع کریں۔ اس طرح آپ کا چہرہ چھپ جائے گا۔ کوئی آپ کے بڑھاپے کو نہیں دیکھ سکے گا۔"

بڑے میاں نے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ منظور، جوتیاں اور بابر کھڑکیوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ زور زور سے تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ اس وقت تک فوجی گاڑیاں ان کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ وہ کھڑکیوں سے ہاتھ نکال کر دو انگلیوں سے وی [illegible] وکٹری کا نشان دکھاتے ہوئے [illegible] رہے تھے: "جے [illegible] بنگلہ دیش..."

وہ [illegible] بنگلہ دیشی سپاہی مسکراتے ہوئے ان کے قریب سے گزرنے لگے۔ وہ اس وقت تک تالیاں بجاتے اور شور مچاتے رہے جب تک آخری فوجی ٹرک سپاہی اور ان کی گاڑیاں نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ اس کے بعد [illegible] منظور [illegible] سیٹوں سے [illegible] اٹھ کر [illegible] بڑے میاں [illegible] الحمد للہ [illegible] ہے وہ آئی بلا کو ٹال دیتا ہے۔"

[illegible] وہ فوجی [illegible]

سب گڑبڑا گئے۔ بڑے میاں نے ایک دم سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بابر قہقہے لگانے لگا۔ ظہیر الدین جوتیاں نے گھور کر پوچھا: "تمھیں شرم نہیں آتی جھوٹ بول کر سب کو ڈراتے ہوئے؟" وہ بدستور ہنستے ہوئے بولا: "میں انسانی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھو نا، آدمی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنی جان بچانے کی دھن میں خدا اور دعا کو بھول جاتا ہے۔ جب مصیبت ٹلنے لگتی ہے تو خدا بھی یاد آتا ہے اور دعا کے لیے ہاتھ بھی اٹھ جاتے ہیں جیسے ابھی میں نے کہا۔ پھر مصیبت آ گئی تو بڑے میاں دعا بھول کر اس مصیبت کی طرف دیکھنے لگے۔"

منظور نے کہا: "اگر تم ماہر نفسیات نہ بنو تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ پلیز بابر! دوست بنو۔ دشمنوں کی طرح مذاق نہ اڑاؤ۔"

اس نے کہا: "تم میرے سچ کو مذاق بنا کر اڑا رہے ہو۔ سفر کے دوران ہم سب کو جانے کتنی مشکلات سے گزرنا ہوگا لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تم سب کے لیے سب سے بڑی مشکل میری سچائی ہوگی۔ جو دیکھوں گا، جو سمجھوں گا، جو میرا ذہن کہے گا، میں اسے بے خوف و خطر کہہ دوں گا۔ تم لوگ کیسے انسان ہو؟ اگر میں جھوٹ کہہ دوں کہ تمھاری مصیبتوں میں کام آؤں گا تو خوش ہو جاؤ گے اور سچ کہہ دوں کہ مصیبتوں میں چھوڑ کر بھاگنے والا انسان ہوں تو مجھے دشمن سمجھو گے حالانکہ میری سچائی کی قدر کرنی چاہیے۔ اوہ گاڈ! تم میرے جیسے سمجھ میں نہیں آتے!!"

ان سب کو چپ سی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزرنے لگے۔ دلاّل نے گاڑی کو تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے کہا: "یہ آخری گاؤں ہے۔ اس کے بعد سرحد تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ سرحد پار پہنچنے تک شاید کھانا بھی نہ ملے۔ بہتر ہے ہم آگے جا کر قیام کریں اور پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں۔"

تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک سڑک سے ہٹ کر دور جھونپڑی نظر آئی۔ وہ دلاّل کی رہنمائی میں اس جھونپڑی تک پہنچے۔ وہاں دو عورتیں، کچھ بچے اور چار مرد نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھی، بھالے کے تلوار نما ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی منظور ظہیر الدین جوتیاں کے بازو سے لگ گئی۔ بڑے میاں زیر لب کچھ پڑھنے لگے۔ بابر نے ان کے قریب ہو کر کہا: "بوڑھے جو کمزور اور بے بس ہوتے ہیں، اس لیے کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ جوان ایسے وقت اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ [illegible] حسب حال کوئی صورت نظر آئے گی تب ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم کسی کا احسان مانتے ہی نہیں۔"

وہ تمام ہتھیار والے اور ان کی عورتیں منظور کے پیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دلال نے آگے بڑھ کر ایک ہتھیار والے کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اسے دور لے جا کر کچھ باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں سن کر وہ انکار میں سر ہلا رہا تھا۔ دلال نے جیب سے دس روپے نکال کر دیے۔ وہ پھر انکار میں سر ہلانے لگا۔ اس نے جیب سے اور پانچ روپے نکال کر دیے۔ پندرہ روپے دیکھتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ وہیں سے چیخ کر اپنے باقی ساتھیوں سے کہنے لگا: "انہیں گھر میں بٹھاؤ، کھانے کا بندوبست کرو۔ یہ بہت دور جانے والے ہیں۔"

ایک منٹ کے بعد ہی وہ سب جھونپڑی کے اندر گھاس کے بستر پر آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے مرغیاں ذبح کی جا رہی تھیں۔ دال بھات پکایا جا رہا تھا۔ پندرہ روپے میں چھ آدمی کا کھانا مرغ کے سالن کے ساتھ بہت سستا تھا لیکن دور افتادہ غریب بنگالیوں کے لیے پندرہ روپے بہت تھے۔ اس لیے وہ خوش ہو کر میزبانی کے فرائض ادا کر رہے تھے۔

دلال نے ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "ہم یہاں سے اندھیرا ہونے کے بعد روانہ ہوں گے۔ رات کو صرف زہریلے سانپوں اور کیڑے مکوڑوں کا ڈر رہتا ہے لیکن جنگلی ہاتھی اور دوسرے درندے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ہم اکثر رات کو سفر کرتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر کہنے لگا: "یہ کس کی گاڑی ہے؟ کون آ رہا ہے؟"

یہ بات سنتے ہی سبھی گھبرا گئے۔ کلیم الدین بھوئیاں فوراً ہی بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی دیوار کے پاس آ کر اس کے سوراخ سے جھانکنے لگا پھر اس نے کہا: "ایک جیپ ہے اور اس میں سے دو آدمی اتر کر ادھر آ رہے ہیں۔"

اس وقت تک دلال جھونپڑی سے باہر جا چکا تھا۔ بڑے میاں نے پوچھا: "بیٹا! وہ کون لوگ ہیں؟ کیا فوجی ہیں یا مکتی باہنی کے جوان؟"

کلیم الدین بھوئیاں نے ننھے سوراخ سے جھانکتے ہوئے کہا: "صاف طور سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ پہلے اتنا ہی دکھائی دیا کہ دو آدمی جیپ سے اتر رہے ہیں پھر جھاڑیاں آڑے آ گئیں۔"

منظی بھی اس کے قریب آ کر بانس کی دیوار سے لگ گئی تھی۔ وہ ادھر ادھر کسی سوراخ سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت باہر سے کوئی گرج کر کہنے لگا: "منظور دلوا! یہاں کون لوگ آئے ہیں؟ ان سب کو باہر لاؤ نہیں تو ان کے ساتھ اس جھونپڑی کو بھی آگ لگا دوں گا۔"

اس کی آواز سنتے ہی منظی یکبارگی لرز گئی۔ چہرہ اچانک ہی سفید پڑ گیا۔ وہ یوں سہم کر بانس کی دیوار سے ہٹ گئی جیسے وہاں بھتنو دیکھ لیا ہو۔ اس نے کلیم الدین بھوئیاں کو دیکھتے ہوئے کہا: "ومنعم بڑا۔ یہ یہاں کیسے آ گیا؟ (منعم باللہ یہ یہاں کیسے آ گیا؟)۔"

کلیم الدین بھوئیاں خود تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ بھی منعم باللہ کو جانتا تھا۔ وہ سب دیناج پور کے رہنے والے تھے۔ دیناج پور بنگلہ دیش کے انتہائی شمال مغرب میں ہے اور وہ لوگ انتہائی جنوب مشرقی علاقے میں تھے۔ سوال پیدا ہوتا تھا کہ منعم باللہ اتنا طویل فاصلہ طے کر کے شمال سے جنوب کی طرف کیوں آیا تھا۔ جواب سمجھ میں آتا تھا کہ منظی اور کلیم الدین بھوئیاں بھی اتنی ہی دور سے آئے تھے۔ وہ دونوں مجبوراً آئے تھے اور منعم باللہ دوسروں کی مجبوریوں سے کھیلتا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جن کی تلاش میں ہے وہ دونوں وہاں پائے جا سکتے ہیں۔ اگر جانتا تو سب سے پہلے انہیں طلب کر کے للکارتا۔

وہ جھونپڑی کی طرف دیکھتا ہوا دلال سے کہہ رہا تھا: "تم بہت چالاک بنتے ہو۔ تم نے پاس والے گرام (گاؤں) میں گاڑی نہیں روکی۔ روکتے تو بستی والے تمہارے بیوپاریوں کو تاڑ لیتے۔ تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہاں مجھ جیسا جیپ گاڑی والا موجود ہوگا۔ تاڑا تاڑی بولو کتنے آدمی لائے ہو؟"

دلال کی آواز سنائی دی: "پانچ — پانچ جن آچھے۔"

منعم باللہ نے قہقہہ لگایا: "پانچ ہیں اور میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ یعنی ایک گولی فالتو ہے۔"

اچانک اس کا قہقہہ رک گیا۔ اس نے گرج کر کہا: "اے پانچو! سنو اور فالتو گولی کی آواز سنتے ہی باہر آ جاؤ۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ اسی لمحہ منعم باللہ نے ریوالور کو اپنے سر سے بلند کر کے آسمانی فائر کیا۔ ٹھائیں کی دل ہلا دینے والی آواز جنگل کی ہر چہار سمت گرجتی جا رہی تھی۔

اب پانچ گولیاں اور پانچ آدمی رہ گئے تھے۔

◆

اس بھاری بھرکم ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ مگر وہ ٹرک آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جب آدمی تعاقب سے بچ کر اور گاڑی کی روشنی بجھا کر آگے چلے تو نیت ہمیشہ مجرمانہ ہوتی ہے۔ اس وقت سات بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ دور ایک لالٹین اس ٹرک کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس لالٹین کے ساتھ ایک گودام میں پہنچ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی گودام کے بڑے سے دروازے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔

گودام میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک نے کہا: "دوسری لالٹین جلاؤ۔"

منسی رام اگروال نے اعتراض کیا: "نہیں۔ یہی کافی ہے

زیادہ روشنی ہوگی تو گودام کے پاس سے گزرنے والوں کو شبہ ہوگا۔"

"اگر وہاں بھی ایک لالٹین سے کام کیسے ہوگا۔ اُدھر سے مال اٹھا کر لانا اور یہاں رکھنا ہے۔"

"تم ابھی نئے رنگروٹ ہو۔ اسمگلنگ کے دھندے میں الّو کی آنکھ سے اندھیرے میں دیکھنا پڑتا ہے۔ چلو ایک لالٹین سے شروع ہو جاؤ۔ پہلے ٹرک میں مال جانے کا راستہ نکالو پھر اوپر سے مال لے کر آؤ۔"

وہ سب لوگ اس کی ہدایت کے مطابق کام میں لگ گئے۔ تلسی رام ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمی ٹرک کے پچھلے فرش کو بڑی مہارت سے الگ کر رہے تھے۔ تلسی رام اپنے چار ماتحتوں پر بڑا بھروسہ کرتا تھا۔ ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر معاوضے سے زیادہ رقم بھی دیا کرتا تھا۔ وہ چاروں اسمگلنگ کے دوران مال کے ساتھ رہتے تھے۔ طرح طرح کے خطرات سے کھیل جاتے تھے۔ بارڈر پولیس سے [illegible] ہوتا تو اس کا سامنا [illegible] نہیں تھا۔ وہ [illegible] بھی [illegible] کوئی خرابی ہوتی تو منٹوں میں درست کر لیتے تھے۔ [illegible] ہوشیار [illegible] تھا۔ بنگال کے شمال سے جنوب تک تمام [illegible] اس کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا۔ وہ [illegible] مشکل کے راستوں اور سرحدی چوکیوں کی تعداد سے واقف تھا۔

یوں بھی بھارت اور بنگلہ دیش کی درمیانی سرحدیں اب زیادہ [illegible] بھارت میں [illegible] اور [illegible] چاولوں کی [illegible] بنگلہ دیش سے آنے والے اپنے مال کو سرحدی چوکیوں [illegible] تھوڑی سی رشوت دے کر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

اس نے ٹرک کے پچھلے فرش کو کھول کر الگ رکھ دیا۔ اس کے نیچے [illegible] ٹرک کے پچھلے حصے [illegible] دوہرا فرش [illegible] چھپا کر رکھا جاتا تھا [illegible] میں چھپ گئے [illegible] سونے [illegible] اور چاندی [illegible] چھپا کر [illegible] تھے۔

تلسی رام نے [illegible] ایک چھوٹی سی [illegible] کے [illegible] ساتھ [illegible] نہیں بھی یہاں چھپا دو۔ [illegible] ہوگی۔"

— ظاہر ہے ہندوستان پہنچنے کے بعد انہیں دے دینا۔"

"اگر وہ یہ زیورات واپس کرنا چاہیں تو؟"

"تو بازار کے حساب سے [illegible] رقم دے دینا۔ [illegible] ہمیں بھی [illegible] مل جائے گی۔"

ایسا کہتے وقت وہ دل ہی دل میں نفع و نقصان کا حساب کر رہا تھا۔ سید پور میں اس نے ایسے ملازم رکھے تھے جو اس کی عدم موجودگی میں عوام کی بھوک، بیماریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ انہیں اناج اور دواؤں کے لیے روپے دیتے تھے اور ان کے سونے چاندی کے زیورات رہن رکھتے تھے۔ ریلوے کے مزدور محدود آمدنی میں تین وقت مٹھی بھر اناج خرید کر نہیں کھا سکتے تھے۔ اس لیے رہن رکھا ہوا زیور چھڑا نہیں سکتے تھے۔ بالآخر رہن رکھنے والوں کے پاس اونے پونے بیچ دیتے تھے۔

اس شہر میں ریلوے کے مزدور اور چھوٹی پونجی کے دکاندار تھے۔ ان کی طرز رہائش دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر غریب نظر آنے والے بہاری اپنی عورتوں کے لیے اتنے سارے سونے چاندی کے زیورات بنواتے رہے ہیں۔ اس وقت تلسی رام پچیس سیر سونے کی پتریاں اور ایک من چاندی کی پتریاں چھپا کر لے جانے والا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوسرے ہندو بنیے وہاں کے مسلمانوں کو کس طرح کھوکھلا کر کے بنگلہ دیش کا سونا بھارت پہنچا رہے ہوں گے۔

ٹرک کے نچلے فرش پر تمام مال احتیاط سے رکھنے کے بعد انہوں نے لکڑی کے تختے سے بنے ہوئے اوپری فرش کو اٹھا کر اس کی پہلی جگہ رکھ دیا۔ تمام مال دوہرے فرش کے درمیان چھپ گیا۔ اب وہ لوہے کی پتیوں اور اسکرو وغیرہ کے ذریعے فرش کو مضبوطی سے جما رہے تھے۔ چیکنگ کرنے والے اس کے اوپر چڑھ کر یا ٹرک کے نیچے سے جھانک کر اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ فرش اندر سے کھوکھلا ہے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو [illegible] چاولوں کی بوریاں لا کر اس پر لادنے لگے۔ تلسی رام نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو۔ ساڑھے دس ہو چکے ہیں۔"

ثمرو حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ بڑو دیدی نے تمام [illegible] کہہ دیا تھا "اب تم اسے دلہن کے روپ میں ہی دیکھ سکو گے۔ تب تک وہ پردہ کرے گی۔"

اس نے صحن میں آ کر آواز دی۔ "بڑو دیدی! ذرا میرے کمرے کا تالا ہی کھول دیجیے۔ میں جا کر سونا چاہتا ہوں۔"

بڑو دیدی نے کمرے کے اندر سے کہا۔ "ذرا صبر کرو۔ تم میری بھوجائی کو دیکھو گے تو نیند اڑ جائے گی۔"

سامنے کیا ہو رہا ہے اس نے دیکھا۔ بڑو دیدی [illegible] درمیان [illegible] دلہن کو تھامے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ دلہن ہر جوڑے میں چھپی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں ذرا سے جھلک رہے تھے۔ ان میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ سونے کے زیورات بھی نظر آ رہے تھے

بڑو دیدی زیر لب گنگنا رہی تھیں۔ شاید سہاگ کا گیت گا رہی تھیں۔ ششی خاموش تھی۔ اس کا اپنا دکھ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ اداس نہیں تھی۔ قہقہے بھی نہیں لگا رہی تھی۔ بس وہ اپنی شانتا بھابی کی خوشی میں سنجیدگی سے ساتھ دے رہی تھی۔

وہ تینوں خسرو کے سامنے سے گزر گئیں۔ پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ اس نے پوچھا: "دیدی! میں آؤں؟"

"ابھی نہیں۔" انھوں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پتا نہیں اندر کیا ہو رہا تھا۔ خسرو کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ پونے بارہ بجے تلسی رام حویلی کے دروازے اندر سے بند کر کے صحن کی طرف آیا۔ خسرو کو تنہا دیکھ کر پوچھا: "یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟ یہ عورتیں کہیں گئی ہیں کیا؟"

"سب کے سب میرے کمرے میں ہیں۔ دیدی مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ شام سے نین تارا کو چھپا رکھا ہے۔ ابھی اپنے کمرے سے دلھن بنا کر میرے کمرے میں لے گئی ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا: "اچھا تو ہماری بھاوج کو دلھن بنایا گیا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں، دلھن کے روپ میں کیسی لگتی ہے۔"

اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ پھر آواز دی۔ شانتا نے اپنے پتی کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ ششی اپنے بھائی کو دیکھتے ہی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خسرو اپنے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ بڑو دیدی نے ڈانٹ کر کہا: "ابھی نہیں۔ جب بلاؤں گی تب آنا۔ پہلے تمھارے جیا جی دلھن کو منہ دکھائی دیں گے۔"

تلسی رام نے کہا: "منہ دکھائی ضرور دوں گا۔ پہلے منہ تو دکھاؤ۔"

دونوں میاں بیوی اندر چلے گئے۔ خسرو دروازے کے باہر دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جیجا جی کی آواز سنائی دی: "وان قسم میں نے ایسا روپ اور ایسی سندرتا پہلے نہیں دیکھی۔ دیکھا ہو تو یاد نہیں ہے۔ میں آشیرواد دیتا ہوں۔ بھگوان تمھاری اور خسرو کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے اور مصیبتوں سے بچائے۔"

پھر اس نے بیوی سے پوچھا: "شانتا! منہ دکھائی کیا دوں؟ میرے ہاتھ میں یہ سونے کی انگوٹھی ہے۔ کیا اس سے کام چل جائے گا؟"

"آپ اپنی خوشی سے جو چاہیں دے سکتے ہیں۔ ایسے وقت بیچاری دلھن کچھ بول نہیں سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا میں کچھ نہ دے کر جاؤں، تب بھی یہ نہیں بولے گی۔"

شانتا نے کہا: "میں اپنی بھاوج کی طرف سے لڑوں گی۔ پہلے انگوٹھی دے دیجیے۔"

تھوڑی دیر بعد تلسی رام کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے خسرو کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا: "کیوں میاں! بہت بے چین ہو؟ میں دلھن کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہاں میری تو صرف انگوٹھی اتری ہے۔ تمھاری تو اب مستقل کھال اترتی رہے گی۔ عورت شادی سے پہلے معصوم ہوتی ہے۔ شادی کے بعد قصائی کی بیٹی بن جاتی ہے۔"

شانتا نے قریب آ کر پوچھا: "اچھا تو آپ میرے بھائی کو بہکا رہے ہیں۔ چلو خسرو! اندر آ جاؤ۔"

وہ خسرو کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ بڑے سے پلنگ کی سفید چادر پر گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پلنگ کو چاروں طرف سے پھولوں کی لڑیوں سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ تاکہ دلھن ہر زاویے سے جلوہ نما رہے۔ وہ شادی کے سرخ جوڑے میں سمٹی، سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑو دیدی نے خسرو کو اس کے پاس بٹھاتے ہوئے کہا: "نین تارا! میں تمھارے جیون ساتھی کو لے آئی ہوں۔ یہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ بھابیاں آ کر بھائی کو چھین لیتی ہیں۔ کل تم بھی اسے چھین کر لے جاؤ گی۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ہزاروں میل دور جانے کے بعد بھی بھائی بہن کا مقدس رشتہ قائم رہے گا۔"

خسرو نے ان کا ہاتھ تھام کر فرطِ عقیدت سے کہا: "دیدی! ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے بعد قومیتیں بدلتی ہیں۔ بہنیں کبھی نہیں بدلتیں۔ میں اور نین تارا آپ کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

انھوں نے دولھا اور دلھن کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ پھر ان سے رخصت ہو کر باہر آ گئیں۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا لیکن وہیں کھڑی رہیں۔ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتی رہیں اور زیر لب مسکراتی رہیں۔

خسرو کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔ کبھی یوں لگتا تھا سچ مچ شادی ہو گئی ہے پھر یاد آتا تھا، زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔ صرف انسانی آنکھ کا فریب انھیں دور افق پر ملاتا ہے۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی دلھن کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بڑا مستحکم اعتماد تھا۔

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے نین تارا کے پاس سے اٹھ گیا۔ دلھن کی طرح سجے ہوئے کمرے کو دیکھ کر کہنے لگا: "دیدی نے خوب مذاق کیا ہے۔ آج تک ہمیں میاں بیوی بنا کر کمرے میں بند کرتی رہیں۔ آج دولھا دلھن بنا کر اتنے سارے پھولوں کی خوشبو میں بسا دیا ہے۔ ہمیں بہکا رہی ہیں۔ سچ پوچھو تو اس میں دیدی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے میاں بیوی کا ڈھونگ رچا! وہ بیچاری ہمارے جھوٹ کو سچ سمجھ کر ہمیں ایک بھابی کا مان دے

سوئی ہیں۔"

باہر دروازے سے لگی ہوئی شانتا کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یک لخت بجھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سن کر بھی یقین نہیں کر رہی ہو، ذرا اچھی طرح کہ [illegible] سننے کے بعد یقین کرنا چاہتی ہو۔

کمرے [illegible] وہ بولتا ہوا دروازے تک آیا پھر اس نے کہا: "تم میری [illegible] مگر میں گھونگھٹ اٹھا کر دلہن کا روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک اندازہ کر سکتا ہوں کہ آج تمہارے حسن کا عالم کیا ہوگا لیکن یہ دروازہ دیدی نے باہر سے بند کیا ہے۔ کہیں وہ شرارت سے پھر نہ آ جائیں۔"

شانتا کو ایک کھٹکا سا سنائی دیا۔ وہ اندر سے دروازہ بند کرنے کی آواز تھی۔ وہ غصے سے ہونٹ بھینچنے لگی۔ یہ صدمہ اسے مار رہا تھا کہ خسرو بھائی بن کر اب تک دھوکا دیتا رہا۔ اس وقت وہ بہت اونچے اعتماد کی بلندی سے بے اعتمادی کے گڑھے میں خود کو گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دوسری طرف خسرو نے لیلا تارا کے پاس بیٹھ کر سنجیدگی سے کہا: "میں نے دانستہ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ آج بھی میں تمہارا اعتماد قائم رکھوں گا۔ صرف گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے کی اجازت دو۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ کو تھام لیا۔ [illegible] آہستہ آہستہ اٹھانے لگا۔ آہستہ آہستہ حسن طلوع ہونے لگا۔ تاریکی سے اچانک روشنی میں آؤ تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ سامنے نور ہی نور ہو تو دیکھنا سوچتی رہ جاتی ہے، کیا دیکھے؟ کہاں سے دیکھنا شروع کرے؟ حسن کے بھرے میلے میں اس کی نگاہیں یوں بھٹک رہی تھیں جیسے کوئی بچہ میلے میں گم ہو کر بھٹک رہا ہو۔

سرخ جوڑے میں گورا گورا گلابی گلابی مکھڑا، مکھڑے پر حیا کی لالی، اس پر سونے کے زیورات کا جھلملاتا ہوا عکس منعکس ہو رہا تھا۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ کسی چہرے کی کسی کمی کو چھپانے کے لیے میک اپ اور سنگار کیا جاتا ہے اور کہیں سنگار کی زیادتی چہرے کے حسن کو گہنا دیتی ہے۔ خسرو نے سورج گہن تو دیکھا ہی تھا وہ [illegible] ہوئے قمری صورت گہن بھی دیکھ لیا۔

اچانک خسرو اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیلا تارا گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ بڑی دیدی صحن میں کھڑی غصے سے کہہ رہی تھیں: "دیدی! یہ سب نے جھوٹے ہیں۔ جس بھائی سے خون کا رشتہ تھا اس کے کرموں نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ جس بھائی کے ساتھ زبان اور دل سے رشتہ کیا وہ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ جانے کس کی بہن یا بیٹی کو بھگا لایا ہے۔ ہمارے سامنے بیوی کہتا ہے [illegible]۔ کیسا کلنک ہے۔ ارے خسرو! بھگوان کرے ابھی میرے سامنے تجھے موت آئے جس زبان سے تو نے مجھے بہن کہا۔ وہ زبان جل جائے۔"

تلسی رام نے ڈانٹ کر کہا: "اری مورکھ! اتنی رات کو شور کیوں مچا رہی ہے۔ ایک بار تو نے خسرو کو غلط سمجھا، بعد میں معافی مانگ لی۔ اچھی طرح سوچ لے، یہ دوسری غلطی نہ ہو۔"

"میں نے اچھی طرح سنا ہے، خسرو کہہ رہا تھا، دونوں نے میاں بیوی کا ڈھونگ رچایا ہے اور میں مورکھ ان کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر اس کی سگی کو بھابی کا مان دے رہی ہوں۔"

تلسی رام نے آواز دی: "ارے بھئی خسرو! یہ کیا معاملہ ہے۔ اپنی بہن کی غلط فہمی دور کرو۔"

صحن کی طرف کھڑکی کھل گئی۔ خسرو کمرے کے اندر نظر آیا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ بڑی دیدی نے کہا: "اس سے پوچھئے، مجھے اپنی صورت نہ دکھائے۔ جو مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا ہے، وہ بھلا اپنی صفائی میں کیا کہے گا۔"

خسرو نے سر اٹھا کر کہا: "دیدی! آپ [illegible] جو کچھ سنا وہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ ہماری شادی ہوئی تھی مگر ادھوری ہوئی تھی۔"

بڑی دیدی نے اس کی طرف سے نظر ہٹا کر اپنے پتی سے کہا: "دیکھیے دیکھیے! یہ کیسی بکواس کر رہا ہے۔ ہماری اتنی عمر ہوئی، ہم نے آج تک کہیں نہیں سنا کہ شادی آدھی بھی ہوتی ہے۔"

تلسی رام نے پوچھا: "ہاں میاں! یہ کیسی نئی بات کہہ رہے ہو؟ پہلے ہی سیدھی طرح کیوں نہ بتایا کہ شادی ادھوری ہوئی ہے، پوری کرا دیتے۔ ہمارے ہاں اگر ایک کمرے میں رہتے ہوئے کچھ تو شرم آنی چاہیے تھی۔"

وہ صحن کے فرش پر پاؤں پٹخ کر بولیں: "بے شرموں کو کبھی شرم نہیں آتی۔ ذرا صورت تو دیکھو یہی گناہگاروں کا سا [illegible] کر کل یہاں سے پاکستان جانا چاہتے تھے۔ دیا جا کر تو دکھا، میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔"

"دیدی! ایسا غضب نہ کریں۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ، ہمیں پاکستان جانے سے نہ روکیں۔"

"بکواس مت کرو۔ جس گھر میں گناہ ہوتا ہے اس گھر میں ہونے والی عبادت یا پوجا قبول نہیں ہوتی۔ جب سے تم دونوں آئے ہو میرے گھر کی پوجا خاک میں ملتی رہی ہے۔ میری پوجا عبادت اکارت ہوتی رہی ہے۔"

وہ کھڑکی کی طرف ایک قدم آگے بڑھا کر بولیں: "مجھے بتاؤ جب تم اپنے وطن کو پاکستان کہتے ہو تو پھر تم دونوں کون سی پاکی لے کر وہاں جا رہے ہو؟"

نے بڑی ہی منتوں اور منت سماجت

ٹرو دیدی

[illegible] دی تھی۔ نسرو کا سر شرم سے [illegible] تو [illegible] مخصوص حالات میں ایک شخص ہی مجھ کے [illegible] دوسرے شخص کی [illegible] نسرو نے [illegible] سر اٹھا کر [illegible] آپ بعض نہیں [illegible] ہم جاتے ہیں اور [illegible] آپ کے پاس آکر منت [illegible] سے [illegible] میں بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] اس کے لیے اگر آپ کہیں تو میں کلام پاک اٹھا کر قسم کھا سکتا ہوں"

تلسی رام نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی سے کہا: "اری بھاگوان! [illegible] ہے، نسرو بہت بڑی بات کہہ رہا ہے۔ یہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ ہم اسے آج سے نہیں برسوں سے جانتے ہیں۔ معلوم تو ہو یہ قصہ کیا ہے۔ [illegible] نہیں تھے تو یہ ڈھونگ کیوں رچایا؟"

نسرو نے کھڑکی کی سلاخوں کو دونوں ہاتھ سے تھام کر کہا۔ "جی ہاں! ہم نے ڈھونگ رچایا لیکن اس ڈھونگ میں آدھی صداقت گئی ہے۔ ہمارے ساتھ حالات نے عجیب مذاق کیا ہے۔ گلشن کے کیمپ میں میرا اور زرین تارا کا نکاح پڑھایا گیا تھا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں کے دستور کے مطابق پہلے لڑکی نکاح قبول کرتی ہے۔ اس کے بعد لڑکے کی باری آتی ہے۔ جب میری باری آئی تو ایک دم چاروں طرف سے ہم پر گولیاں برسنے لگیں۔ ملکی باغیوں کے جتھوں نے یکبارگی ہمیں گھیر کر حملہ کیا تھا۔ ان حالات میں ہمارا نکاح کی کارروائی پوری نہ ہو سکی۔ وہ نکاح نامہ بھی پتہ نہیں کہاں گم ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ زرین تارا نے نکاح قبول کر لیا تھا۔ مجھے اپنا شوہر قبول کر لیا تھا۔ چونکہ میں قبول نہ کر سکا، اس لیے یہ نکاح شریعت کی رُو سے ادھورا رہ گیا ہے۔"

ٹرو دیدی نے چمٹے سے کہا: "یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں۔ یہاں میاں بیوی بن کر کیوں رہ گئے؟ کیوں ہمیں دھوکا دیتے رہے؟"

"ٹرو دیدی! خدا کے لیے میری پوری بات سن لیجیے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں، ہمارے متعلق فیصلہ کریں۔"

تلسی رام نے کہا: "ہاں۔۔ ہاں بولو۔ اے شانتا! خبردار، جو اب بیچ میں بولیں۔"

"بھابی جی! آپ اسی رات کیمپ میں مجھ سے ملنے آئے آپ [illegible] دیدی کے پاس بھیجنا چاہتے [illegible] تو آپ نے کہا مجھے ہزاروں لڑکیاں [illegible] وقت بہت کم ہے۔ [illegible] اگر میں تارا کو اپنی بیوی [illegible] مجبور ہو جاتی ہے [illegible] ساتھ لے [illegible] کے حالات ہم جس علاقے [illegible] کن لوگوں کے درمیان رہنا ہے؟"

[illegible] ٹھیک [illegible] ہے"

[illegible] دیدی [illegible] پوچھ لیا [illegible] آپ سے [illegible] تھے تو [illegible] جھوٹ [illegible] ضرورت تھی [illegible] مجھے پہلے معلوم ہوتا تو کیا میں اس کا نکاح نہ پڑھوا دیتی"

"دیدی! یہی تو آپ نہیں جانتیں، اس وقت ہمارا نکاح [illegible] تارا کے [illegible] مشکل ہوتے [illegible] ایسی صورت میں [illegible] آپ سے پہلے کہہ دیا [illegible] رشتہ [illegible] کہ وہاں [illegible] حالات [illegible] سکتے تھے؟"

"خسرو ٹھیک کہتا ہے"

[illegible] دیدی [illegible] پوچھا: "کیا [illegible] تھی [illegible] کہتی تھی۔ [illegible] اسے بیوی بنا کر [illegible] کرتا رہا؟"

[illegible] تم اس طرح سوچو [illegible] محبت [illegible] نہیں [illegible] کہا ہے۔ [illegible] میاں بیوی [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] کہا جا سکتا ہے [illegible] سب کے مطابق [illegible] نہیں ہوا ہے۔ لیکن [illegible] ہو [illegible] بیوی [illegible] رہتے ہیں۔"

"[illegible] ایسا نہیں ہوتا؟"

"ایسا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، اب تو ہو سکتا ہے؟ میں [illegible] ایک مولوی صاحب کے ساتھ لے [illegible]"

[illegible] دیدی [illegible] کہہ کر خسرو کی طرف سے منہ پھیر کر [illegible] دیدی [illegible] بے ساختہ [illegible]

دیدی خسرو نے لڑکی کی طرف سے پشت کر دیکھا، وہاں دیدی کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "چلو نکلو [illegible] شرم نہیں آتی؟"

وہ سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر نکاح پڑھا دیا گیا جس طرح [illegible] قانونی طور پر [illegible] تھے شادی [illegible] جیرانی سے پوچھا [illegible]

وہ [illegible]

"تو ایسے [illegible] بھائی تو [illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

وہ [illegible] مرنے کے بعد [illegible] پیچھے چھوڑ کر [illegible]

[illegible] ہندوستان تقسیم ہوا [illegible] قائم ہو گئیں [illegible] ہو گیا [illegible] تقسیم [illegible] رشتے بھی تقسیم ہوتے [illegible] ایک رشتے کے [illegible] تاریخ کے [illegible] ملک ہو گئیں [illegible] جائیں [illegible] خدا [illegible] تنہا [illegible] دعائیں مانگتی [illegible] ہندوستان [illegible] جائیں [illegible] آج [illegible] دعائیں مانگتے مانگتے [illegible] انھیں کسی ملک میں [illegible]

وہ [illegible] ملکوں کی تقسیم سے [illegible] نہیں ملتی [illegible]

ہیں اور تینوں ملکوں کی سرحدیں انھیں ملنے سے روک رہی ہوں۔ جانور قربان ہوں تو ان کا گوشت گھر گھر تقسیم ہو جاتا ہے لیکن بہاریوں کی قربانیاں کسی کھاتے میں نہیں تھیں۔ یہ قربانیاں دینے کے بعد ہڈیاں اور چھیچھڑے بن گئے تھے جنھیں حالات کے چیل اور کوّے ایک ملک سے دوسرے ملک لیے پھر رہے تھے۔

نین تارا اور خسرو اس رات سو نہ سکے۔ انسان اپنی مرضی سے سو نہیں سکتا۔ جذبے اسے سلاتے اور جگاتے رہتے ہیں۔ مصائب کی مار پڑتی رہے تو نیند نہیں آتی اور مسرتیں آغوش میں بھر جائیں تب بھی نیند بھاگ جاتی ہے۔ خسرو نے کہا: "کل سے ہم نجانے رستوں پر سفر کرنے والے ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ ورنہ راستے میں اونگھتی رہوگی۔"

"میں ابھی سو جاؤں مجھے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا [illegible] تم پہلے سے زیادہ اب میری ذمے داری قبول کرو گے۔ [illegible] دراصل مرد کو آرام کرنے کے بعد [illegible] رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ سفر کے دوران چوکنا رہے۔ میں تمھارے [illegible] ہوں۔ بالوں میں کنگھی کرتی ہوں۔ تم سو جاؤ۔"

وہ سر سہلانے آئی تو نگاہوں کے عین مقابل اور زیادہ [illegible] زیادہ روشنی [illegible] نیند نہیں آتی۔ اس لیے وہ سو نہ سکا۔ [illegible] جو سکون [illegible] آتے ہیں۔ وہی جگانے لگتے ہیں۔ [illegible] کہ اس کی موجودگی میں [illegible] آرام سے [illegible] چوکیدار [illegible] گھنٹے [illegible] آواز لگاتا ہے ہوشیار [illegible]

[illegible] سونے کے لیے نہیں [illegible] خسرو اب [illegible] تھی اور وہ اس کی چوکیداری [illegible] موجودگی میں [illegible] جاگ [illegible]

بڑو دیدی کے دستور اور دھرم کے مطابق رسوئی گھر میں [illegible] دونوں نے غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر لیا تھا۔ تلسی رام نے نین تارا سے کہا: [illegible] تمام [illegible] سب کے سب تمھیں ہندوستان پہنچنے کے لیے [illegible]

[illegible] تمام [illegible] لا کر دے دیے۔ تلسی رام [illegible] بڑو دیدی اور ششی تم دونوں [illegible] کالج تک [illegible] کی۔ [illegible] کا

پتا نہیں ہے کہ تمھیں سرحد پار بھیجا جا رہا ہے۔ اپنے چہرے سے پریشانی ظاہر نہ کرنا۔ ہنستے بولتے رہنا۔"

اس کے جانے کے بعد بڑو دیدی اور ششی ان دونوں سے خوب باتیں کرتی رہیں۔ بڑو دیدی کی باتوں سے اور لہجوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھائی کے جانے پر خوش نہیں ہیں۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں: "پاکستان پہنچنے کے بعد مجھے بھولنا نہیں۔ مجھے ہندوستان کے پتے پر خط لکھنا۔ وہ خط مجھے یہاں مل جایا کریں گے۔"

ناشتہ کرنے کے ایک گھنٹے بعد ان کے مکان کے سامنے دو رکشے آ گئے۔ خسرو نے ایک چھوٹی سی اٹیچی میں اپنے اور نین تارا کے دو دو جوڑے رکھ لیے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ضروری سامان تھا۔ ایک رکشے میں وہ بڑو دیدی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرے رکشے میں نین تارا اور ششی بیٹھ گئیں۔ پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مارواڑی پٹی کی سڑک شہر سے باہر جاتی تھی۔ سڑک کے اطراف بہت سے مکانوں کے لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ عورتوں نے بھی انھیں دیکھا لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شہر کے باہر چھوٹے سے پل کے اس پار ایک مندر تھا۔ سبھوں نے یہی سوچا کہ بڑو دیدی اور ششی پوجا کے لیے جا رہی ہیں اور اپنے ساتھ ان مسلمانوں کو بھی محض ہوا خوری کے لیے لے جا رہی ہیں۔

وہ قائداعظم کالج کے سامنے پہنچ گئے۔ خسرو نے دیکھا کالج تو اپنی جگہ موجود تھا مگر اس کی پیشانی پر سے قائداعظم کا نام کھرچ دیا گیا تھا۔ ان دنوں سید پور کے ہندو اور بنگالی اس کالج کا نام رکھنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کر رہے تھے۔ ایک خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمن کے نام پر اس کالج کا نام بنگو بندھو کالج رکھا جائے گا۔

پل کے اس پار مندر کے پیچھے وہ ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر بڑو دیدی اور ششی کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ انھوں نے نین تارا کو گلے لگا کر دعائیں دیں۔ بڑو دیدی نے خسرو کی پیشانی کو چوم کر کہا: "بہن کو یاد رکھنا۔"

"دیدی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ جیسی محبت کرنے والی ہستیوں کو بھولنے کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا۔ میں آدمی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک آپ کو بھلا نہیں سکوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔"

آخر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ٹرک کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ خسرو اور نین تارا بیٹھ گئے۔ پیچھے سے

میں باسمتی چاول کے بورے بھرے ہوئے تھے اور وہ بنگلہ دیش سے ہندوستان لے جائے جا رہے تھے۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہیں تھا۔ اعتراض جس پر ہوتا، وہ مال ٹرک کے چور خانے میں چھپا ہوا تھا۔ اور بنگلہ دیش میں فوج اور پولیس کا عملہ زیادہ نہیں تھا [illegible] سمت [illegible] بٹ جاتے [illegible] اگر ایسا ہوتا بھی تو اسمگلنگ کو روکنا تقریباً ناممکن تھا۔

اب سے پہلے پاکستانی حکمران بھی اسمگلنگ کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے اسباب معلوم کرنے کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کو ابتدا ہی سے کس طرح اسمگلنگ کے ذریعے کھوکھلا کیا جاتا رہا ہے۔ میجر جنرل [illegible] (اسٹاف پاکستان) نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"جب میں مشرقی پاکستان کا آخری بار جی او سی تھا (۱۹۵۶ تا ۱۹۵۷)، تو اسمگلنگ کی رپورٹیں بہت آتی رہیں۔ ۱۹۵۰ء کے بعد تو حالات بہت ہی بگڑ چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کی تمام پیداوار ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے استعمال کے لیے ہے۔ چاول، پٹ سن، مچھلی [illegible] سبھی چیزیں غلط جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ اسمگلنگ کی راہ [illegible] اسمگلروں سے ملے ہوئے تھے۔ یہ بات کہ بیشتر سیاست دان بھی بڑے ہندو تاجروں سے پیسے وصول کرتے تھے اور ان کی [illegible] میں پشت پناہی کرتے تھے۔

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہی حال [illegible] رہا تو [illegible] میں ہماری معیشت [illegible] ہو جائے گی تو میں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی اور جی ایچ کیو کو روانہ کر دی۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی [illegible] کی رپورٹ پڑھ کر جی ایچ کیو فوج کے استعمال کی سفارش [illegible] مجھے یقین ہو گیا کہ بغیر فوج کے اسمگلنگ کو روکنا ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے [illegible] روک تھام میں لیا جائے، اور اس کے ذریعے فوج [illegible] پیش [illegible] فیصلہ نہیں [illegible] مجھے اس بات کو [illegible] تھے [illegible] ہرگز کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔

[illegible]

تھے۔ جب انھوں نے رپورٹ پڑھی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ وزیراعظم پاکستان سے درخواست کریں کہ ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ کراچی میں بلائی جائے جس میں فوج کے کمانڈر انچیف بھی موجود ہوں اور وہ مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کریں کہ اسمگلنگ کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ چنانچہ ۱۲ یا ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء کو یہ میٹنگ مسٹر آئی آئی چندریگر کی زیر صدارت کراچی میں منعقد ہوئی۔ میں بھی موجود تھا اور ایوب خان کے برابر بیٹھا تھا تاکہ اگر مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو بتا سکوں۔ ایوب خان کے پیچھے عتیق الرحمٰن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل اور سابق گورنر پنجاب) بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں جی ایچ کیو میں وائس چیف آف اسٹاف کے عہدے پر فائز تھے اور ایوب خان کے ساتھ بطور سینئر اسٹاف افسر موجود تھے۔ عطاء الرحمٰن صاحب [illegible] ہونے کے سبب [illegible] میں ان کا [illegible] بھی گم ہو گیا۔ [illegible] پریشانی کی حالت میں [illegible]۔

بہرحال انھوں نے مشرقی پاکستان کی تباہی کا نہایت ہی [illegible] سے نقشہ کھینچا۔ جس سے تمام حاضرین [illegible] ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر میں [illegible] کہا کہ اگر ملک کو بچانا ہے تو فوج کو میدان میں آنا پڑے گا۔ ورنہ کوئی صورت نہیں کہ مشرقی پاکستان کی [illegible] بچ سکے کیونکہ قریب قریب تمام ہندو بیوپاری اور صنعت کار [illegible] کو مغربی بنگال بھیج چکے ہیں [illegible] کی صنعتکاری کے لیے [illegible] مشرقی پاکستان میں کمایا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ [illegible] پہنچ جاتا ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ تمام ہندوؤں کو [illegible] سیاست دانوں [illegible] لیگ کے لیڈروں کی حمایت حاصل تھی۔ قریباً سب نے اس وقت میں اپنی [illegible] کسی سرکاری ادارے کی مجال نہیں تھی [illegible]۔

جب عطاء الرحمٰن خان یہ ہولناک انکشافات سنا رہے تھے تو اس وقت [illegible] عتیق الرحمٰن نے ایک کاغذ کا پرزہ ایوب خان کے [illegible] ایوب خان نے اس کو پڑھا اور [illegible] فوج کو کسی حالت میں [illegible] ۱۹۵۵ء میں ہندو ذخیرہ اندوزوں نے قحط کے سے حالات پیدا کر دیے تھے۔ [illegible] کم ہو گئی تھی [illegible]

آہستہ آہستہ بیچنا شروع کیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چاول کی قیمت بارہ روپے سے بڑھ کر چالیس روپے تک پہنچ گئی۔ ملک میں کہرام مچ گیا۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ چاول پر کنٹرول تھا لیکن عوامی لیگ کے عہدیداروں کو پرمٹ دینے کا اختیار تھا۔ انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ تمام بڑے بڑے ہندو تاجروں کو پرمٹ دیے گئے اور اس طرح ملک کا تمام چاول ان کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پرمٹ دینے والوں کو مناسب معاوضہ مل گیا۔

جب حکومت کے خلاف جلسے جلوس شروع ہوئے اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا، تب فوج کو بلایا گیا اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کا حکم صادر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے اندر اندر چاول کی قیمت اپنی اصلی سطح پر آگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام ہندوؤں کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے سیاسی دباؤ ڈالا اور فوج کو واپس بیرکوں میں بھجوا دیا۔

یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج ہم جو ایک قیمت بھر رہے ہیں وہ تاریخی سچ تھا۔ بات یہ ہے کہ ان دنوں مشرقی پاکستان میں مسلمان دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ عوامی لیگ اور مولوی فضل حق کی کے ایس پی۔ ہندوؤں کے [illegible] ممبر صوبائی اسمبلی میں تھے۔ یہ سب کے سب عوامی لیگ کے ساتھ تھے۔ ان کے بغیر عوامی لیگ اپنی وزارت بھی قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے وہ ان کے رحم و کرم پر تھی۔ اُدھر مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کی حکومت تھی جو عوامی لیگ کے بل بوتے پر ٹھہر سکتی تھی۔ اس سے مشرقی پاکستان اور مرکزی حکومت پر چھایا ہوا تھا [illegible] [illegible] سے زیادہ [illegible]

میں عرض کر رہا تھا [illegible] مشرقی پاکستان سے سب سے [illegible] پہلے یہ بات کہی تھی [illegible] مشرقی پاکستان نہیں ٹوٹتا تو [illegible] میں وہ ٹوٹ گئی۔ [illegible] کو [illegible] جنرل صاحب کی بات [illegible] تو بات سچ ہوئی ہے، وہ پرانی جیسی ہوتی [illegible] آج بھی وہی ہندو مشرقی پاکستان کی طرح بنگلہ دیش کی معیشت پر چھائے ہوئے تھے آج بھی [illegible] اسمگلنگ ہو رہی تھی [illegible] سمگلنگ کے ایک ٹرک میں یمن تارا اور خسرو وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔

تلسی رام اگرچہ دال ایک دان پُن کرنے والا لعنتی خیرات کرنے اور نیکی کرنے والا ہندو تھا لیکن اسے حماقت سمجھتا تھا کہ اناج کا بوجھ کم کرکے عوام سے نیکی کمائی جائے۔ یہ حماقت خسرو نے کی تھی۔ پہلی بار تلسی رام کا اناج سیدپور لانے کے بعد بازار کے بھاؤ کے خلاف لے سستا فروخت کیا تھا۔ اس کے باوجود تلسی رام کا منافع رکھا تھا لیکن بیوپاری دوسروں کی کھال کھینچنے کی حد تک منافع کمانے کے عادی ہوتے ہیں۔ تلسی رام نے خسرو کی اس حماقت پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ خسرو اور یمن تارا کے سامنے وہ اپنی گنہگار طبیعت کے باعث بھی شرمندہ تھا۔ زیادہ زبان کھول نہیں سکتا تھا۔ اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ شانتا کے سامنے پھٹ نہ پڑیں۔ اس کا پول نہ کھول دیں۔

دوسری بات یہ کہ انھوں نے خسرو کی رقم اپنے کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کا منافع اس حد تک حاصل ہوا تھا کہ ادھر خسرو نے اناج فروخت کرنے میں نقصان کیا تھا تو دوسری طرف سے فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ منافع تلسی رام نے اپنے پاس رکھا تھا اور اس کا کچھ حصہ خسرو کو دیا تھا۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی

دراصل ایک ہی سماج میں رہ کر شریف اور سمجھدار لوگ ایک دوسرے کو پیچ کرکے کبھی نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ اپنی سہولتیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور دوسروں کو اپنے راستے سے ہٹائے رکھنے کے لیے مختلف چالیں چلتے ہیں۔ جیسا کہ اب تلسی رام کر رہا تھا۔ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوتی کہ یمن تارا اور خسرو کو پاکستان پہنچانے کے لیے وہ انھیں ہندوستان کے راستے نیپال پہنچا رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان دو مصیبتوں کو محبت سے گلے لگا کر رخصت کر رہا تھا۔

ایک ہی سماج میں رہ کر محبت سے یوں بھی الّو سیدھا کیا جاتا ہے۔

* * *

وہ پانچوں جھونپڑی کے اندر تھے۔ عظمی اور کلیم اللہ بھیگی دیوار سے ٹیک لگائے منعم باللہ کی آواز سن رہے تھے۔ وہ ہر گھڑی اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے انھیں گستی سمجھا رہا تھا۔ ایک ہوائی فائر کے بعد اس کے ریوالور میں پانچ گولیاں رہ گئی تھیں اور اس کے پانچ شکار جھونپڑی کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

جس جھونپڑی میں وہ چھپے ہوئے تھے، اس کے مکین عام بنگالیوں کی طرح سادہ اور بہت ہی غریب تھے۔ وہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے متعلق بہت کم جانتے تھے۔ ملک کا کوئی سا بھی ہو حکمران کوئی ہو، وہ جنگل کے کنارے ایک جھونپڑی میں آباد تھے۔ انھیں اپنے بنگالی بھائیوں سے دشمنی تھی نہ بہاریوں سے۔ وہ امن و اماں سے رہنے کے لیے ہی آبادیوں سے بہت دور وہاں آباد تھے۔ ایسے موقع پر نہ تو وہ آنے والے بنگالی بھائیوں سے لڑ سکتے تھے نہ بہاری مہمانوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ ان کے پاس تلوار تھا نہ لانچہ، پھل کے چاقو تھے جنھیں رام داؤ کہا جاتا تھا۔ وہ رام داؤ سے

جنگل کی جھاڑیوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے یا پھر جنگلی جانوروں کا ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ انھوں نے آج تک اس ہتھیار سے کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا۔

بڑے [illegible] کلیم الدین بھوئیاں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولے: "کیا تمھارے یہ میزبان بنگالی ایسے وقت اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے کچھ کر سکتے ہیں، یا دوسرے بنگالیوں کی طرح منافق ہیں؟"

کلیم الدین بھوئیاں نے وضاحت پیش کر کے کہا: "بنگالی منافق نہیں ہیں۔ اگر ہیں بھی تو تھوڑی ہی تعداد میں جتنی کہ کسی دوسری قوم میں ہو سکتے ہیں۔ ورنہ منافقت ہوتی کیا ہے؟ انسان کو اپنے وقت کی روٹیاں ملیں، زندگی گزارنے کے لیے ضرورت کے اسباب مہیا ہوں، تو اس کے دل سے لالچ ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں لالچ نہیں، جھوٹ اور فریب نہیں ہوتا، وہاں منافقت نہیں ہوتی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو لوگوں نے دیکھی تھی، جب ہم اس جھونپڑے کی طرف آ رہے تھے تو یہی [illegible] ہاتھوں میں [illegible] کر یوں کھڑے ہوئے تھے جیسے [illegible] ہوتے ہی ان کی دشمنی دوستی میں بدل گئی۔ دراصل [illegible] اقتدار کی ہوس انسان کو انسان سے دور کرتی ہے۔"

بابو منعم باللہ نے گرجتے ہوئے کہا: "اب میں تم [illegible] اس جھونپڑے [illegible] لگا دوں گا۔"

جھونپڑی کے رہنے والے مرد، عورتیں اور بچے سہمے ہوئے [illegible] ہیں۔

منظور [illegible] جھونپڑی کو جلنے دیا جائے۔"

بڑے میاں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ زندگی [illegible]

[illegible]

وہ بہت آہستہ مٹی کے فرش پر پاؤں رکھتے ہوئے دروازے کی طرف گیا۔ پھر دروازے کو کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگ اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگے۔ پاؤں پر نظر پڑتے ہی وہیں رک جاتی تھی۔ منظور نے منعم باللہ کو دیکھا، [illegible] اس نے ریوالور کی پانچ گولیاں [illegible] ہوئی تھیں۔ [illegible] کسی بھی [illegible] صرف پانچ گولیوں پر اکتفا کرے گا۔ [illegible] ہوگا اور [illegible] گولیوں سے [illegible] کر دے گا لیکن [illegible] کی [illegible] ہوئی تھی۔

منعم باللہ کے پیچھے اس کے دو جوان ساتھی کھڑے ہوئے تھے۔ [illegible] ان میں سے ایک نے کہا: "منعم دا، یہ تو منظور قریشی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں [illegible]"

منعم [illegible] سے دیکھا، پھر پوچھا: "کیا زخم بھر گئے ہیں؟"

منظور نے کہا: "نہیں۔"

[illegible] دیکھتے ہوئے بولا: "پھر تم [illegible]

[illegible]

کھڑا بھی ہو سکے۔ آخر پٹیاں کھل گئیں۔ منظور نے اس [illegible] منعم باللہ کی طرف اٹھا کر دکھایا۔ وہاں سرخ گوشت [illegible] رہا تھا۔ گھاؤں پر سرخ دانے ابھرے ہوئے، اور [illegible]

خطرناک جنگل سے گزر کر برما جائے گا۔ اس کا تو باپ بھی نہیں جا سکے گا۔"

اس کے ایک ساتھی نے پوچھا: "کیا تم اسے زندہ چھوڑ دو گے؟"

"ہاں، یہ اگر یہاں سے چل کر سرحد پار جا سکتا ہے تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے وطن میں پہلے ہی گشت گشت کر سڑکوں پر بھیک مانگنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ جس طرح اب تک بھیک مانگتے ہماری روٹی، کپڑے اور مکان میں حصہ دار بنتے آئے ہیں، اسی طرح یہ دونوں [illegible] بنگالی بھیک منگوں کی روزی میں حصہ دار بنے گا۔ اس لیے اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے اور مارنا اس لیے نہیں چاہیے کہ یہ آدھا مر چکا ہے اور اپنی زندگی کی آدھی لاش خود [illegible] کر یہاں سے جانے والا ہے۔ اسے جانے دو۔"

پھر اس نے جھونپڑی کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اے دوسرا کون ہے؟ باہر آؤ۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جھونپڑی کا دروازہ کھلا۔ بڑے میاں باہر آئے۔ بڑھاپے میں [illegible] تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ [illegible] ہوئے پوچھا: "بڑے میاں! اتنی عمر گزار چکے ہو [illegible] موت کے ڈر سے کیوں کانپ رہے ہو؟"

"بیٹے، موت سے نہیں خدا کے خوف سے کانپ رہا ہوں۔ سوچتا ہوں ابھی دنیا سے رخصت ہو کر وہاں پہنچوں گا تو اپنے اعمال کا کیا حساب دوں گا۔"

منعم باللہ نے غصے سے کہا: "میں اپنی بنگالی میں بات کر رہا ہوں اور تم جواب میں اجنبی زبان بول رہے ہو۔ اگر چند لمحوں کے لیے بھی زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہماری زبان میں بات کرو۔ [illegible] مانگ ہو تب بھی ہماری زبان میں [illegible]"

بڑے میاں نے کہا: "بات تو یہ ہے کہ بنگالی تہذیب میرے مزاج کے خلاف [illegible] اس لیے میں نے آج تک تمہاری زبان نہیں سیکھی۔"

"میرے مزاج کے خلاف رہی، ہماری تہذیب میں کون [illegible] یا کون سا خلا ہے؟ تم [illegible] سے دیکھو، رقص و موسیقی، [illegible] مصوری و سنگ تراشی ہماری [illegible] میں پڑے ہیں۔ [illegible] جیسی تہذیب و ثقافت [illegible] کسی قوم میں نہیں [illegible] دو زبانیں ہیں [illegible] سائنس، ارتھمیٹک اور الجبرا کے تمام متبادل الفاظ موجود ہیں۔ [illegible] کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہے۔ پھر ہماری زبان میں کس چیز کی کمی ہے اور اگر محبت کی کمی ہے تو رابندر ناتھ ٹیگور سے لے کر نذر الاسلام کی شاعری تک ایک ایک لفظ کا تجزیہ کر کے دیکھ لو۔ ان میں محبت ہی محبت ملے گی۔ پھر ہم سے نفرت کیوں کرتے رہے۔ کیوں تم نے ہماری زبان نہیں سیکھی؟"

ایک ساتھی نے [illegible] اس بوڑھے کو تو مار ہی ڈالو۔ [illegible] اس کے سامنے [illegible] تقریر کرنے کا کیا فائدہ [illegible]"

[illegible] نے منظور کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی طرف [illegible] ہوئے [illegible] یہ شخص تو زندہ رہے گا۔ شاید یہ اپنے حوصلے کی بنا پر یہاں سے پاکستان پہنچ جائے۔ وہاں جا کر [illegible] یہ لوگوں سے کہتا [illegible] دونوں ہاتھوں سے [illegible] کر بنگالیوں کی کچھ غلطیاں تھیں تو [illegible] بے شمار غلطیاں تھیں۔ [illegible] زبان سے یہ نہیں کہتا کہ انہیں ہماری زبان سیکھنی [illegible] لطف [illegible] ہیں۔ یہاں سے [illegible] گئے تو انہیں اپنی مادری زبان کے علاوہ کچھ اور زبان بھی [illegible] جب یہ مغربی پاکستان پہنچیں گے تو شاید کراچی اور لاہور کے علاوہ [illegible] صوبے میں بھی رہیں گے انہیں وہاں کی بولی کو کسی حد تک [illegible] ہوگا۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مسلمان جس صوبے میں رہتے ہیں وہاں اپنی مادری زبان کے علاوہ علاقائی بولیاں سیکھتے ہیں لیکن بنگال میں ایسی کیا قیامت ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں اپنا دشمن سمجھا، ہمیں [illegible] کے لیے ہماری تہذیب سے دور رہے۔ ہماری زبان کو منہ نہیں لگایا۔"

وہ جھنجھلاتے ہوئے بڑے میاں کی طرف پلٹ کر بولا: "میں بھی ایسے لوگوں کو [illegible] پسند نہیں کرتا بلکہ زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور سے بڑے میاں کا نشانہ لیا۔ اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ [illegible] باہر نکلتے ہوئے کہا: "دانڑاؤ (رک جاؤ)"

منعم باللہ نے پہلے تو اسے حیرانی سے دیکھا پھر ایک قہقہہ لگا کر [illegible]

تم تو چھپے ہوئے تھے۔ اس کے لیے تڑپ کر باہر کیوں آ گئے؟"

"میں کسی بھی انسان کے لیے تڑپ سکتا ہوں۔ ابھی تم نے پوچھا تھا کہ ان لوگوں نے تمھاری زبان کیوں نہیں سیکھی۔ بے شک انھیں سیکھنا چاہیے تھا لیکن تم کسی پر زور زبردستی نہیں کر سکتے۔ زبان محبت سے سیکھی جاتی ہے اور محبت سے سکھائی جاتی ہے۔ یہ بتاؤ تم نے نفرت کرنے کے سوا کبھی کسی کو اپنی زبان سکھانے کی کوشش کی؟ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جس سے بہاریوں کو بنگال زبان سیکھنے کی ترغیب دی جاتی؟ میں مانتا ہوں ان لوگوں کو خود سیکھنا چاہیے تھا۔ یہ بھی مان لو کہ تمھیں بھی سکھانے کا کوئی ذریعہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ جب ایسا نہیں ہو تو پھر اسے شخصی آزادی پر چھوڑ دو۔ یہ اپنی مرضی اور اپنی پسند کی بات ہے جو جس زبان کو سیکھنا چاہے، جس تہذیب کو اپنانا چاہے۔ اس کے لیے کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ کتنے ہی بنگالیوں نے بہاری لڑکیوں سے شادی کی اور کتنے ہی بہاریوں نے بنگالی عورتوں سے شادی کی۔ یہ شادی کرنے کے لیے کسی نے بین الصوبائی شادی دفتر نہیں کھولا تھا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی مرضی کی بات تھی۔"

منعم باللہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور یہ تمھاری اور تمھارے باپ کی شخصی آزادی تھی کہ تم لوگوں نے بنگلہ دیش کی مخالفت کی۔"

"ہاں، ہر شخص کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ ہم نظریہ پاکستان کے حامی تھے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ اگر میں بخیریت پاکستان پہنچ جاؤں اور کچھ عرصے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں تم ایک سفارت کار کی حیثیت سے پاکستان آؤ تو میں تم سے کبھی یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے بنگلہ دیش کا [illegible] کیوں انتخاب کیا تھا۔ اس طرح جب سفارتی تعلقات کی بنا پر بنگلہ دیش آؤں تو تم یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرو گے کہ میں نظریہ پاکستان کا حامی کیوں تھا۔ اس وقت تم مجھے قتل نہیں کر سکو گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آج جو دشمنیاں ہیں وہ وقتی اور جذباتی ہیں۔ ایسی حماقتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

منعم باللہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو [illegible] ہوئے [illegible] تعلقات [illegible] اور ایسا وقت [illegible] آمنے سامنے آ گئے ہو [illegible] تمھیں تمھارے ماں باپ کے [illegible]

اس نے ریوالور کا نشانہ لیا۔ اس وقت کوئی اسے اس کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی اسے روکنے کے لیے بھی کہتا تو اس کے کہنے سے پہلے ہی ٹریگر دبنے سے گولی چل جاتی لیکن اچانک ہی اس کا ریوالور والا ہاتھ کانپ گیا۔ عظمیٰ کی چیخ سنائی دی تھی۔ وہ چیخ ایسی تھی جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی تھی۔ پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے کلیم الدین جوہان کے سامنے پہنچ کر ڈھال بن گئی تھی۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "[illegible] انھیں نہیں، پہلے مجھے مار دو۔ تمھارے ریوالور میں جتنی گولیاں ہیں وہ سب میرے سینے میں بھر دو۔ میں اس سینے کو محبت کرنے والوں سے خالی نہیں ہونے دوں گی۔ ان سب کے لیے اپنی جان دے دوں گی۔"

منعم باللہ حیرانی اور پریشانی سے اس کی بولی سن رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا "یہ تم کیا بول رہی ہو؟ تمھاری [illegible] کیوں ہو گئی؟ صاف طور سے کیوں نہیں بولتی ہو؟"

وہ کلیم الدین جوہان کے پاس سے ہٹ گئی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر منعم باللہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس نے پھر پوچھا "خاموش کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟"

کلیم الدین جوہان نے کہا "کسی ظالم نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔"

منعم باللہ یہ سنتے ہی لرز گیا۔ غصے سے چیخ کر بولا "کس نے کاٹی ہے؟ کون ہے وہ ظالم؟ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

اس وقت تک عظمیٰ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمھیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تمھیں کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ تمھیں اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ [illegible] تمھارے ساتھ [illegible] ہوا ہے؟"

عظمیٰ نے اپنا منہ کھول کر زبان باہر نکالی۔ زبان موجود تھی۔ [illegible] منعم باللہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا "ظالم تم ہو! تم نے۔"

[illegible] سکتا کہ اپنی محبت کی زبان کاٹ دوں۔"

وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے بولنے لگی "یاد کرو اس رات تم نے [illegible]

تو ہمت بھی نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں غصہ اور جھنجھلاہٹ غالب آ جاتے ہیں اور تم نے لیتے ہیں تو کچھ کیا وہ تمہارے سامنے ہے۔"

وہ اس کی بات نہیں سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس نے مظلی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر [illegible]

کسی سے التجا نہیں کرتا۔ جو چاہتا ہوں اس سے چھین لیتا ہوں لیکن میں عاجزی سے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں ایک غلطی کر بیٹھا ہوں اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی، تو میں تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے برآمدے سے اتر کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "میں سارا قصہ سمجھ گیا یہ تم ہو جو اسے اٹھا کر لے گئے تھے اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا اور جب یہ تم سے محبت کرنے لگی تو اس کی زبان کاٹ ڈالی۔ تم یہ اس کے ساتھ وہی ناٹک کھیلنے آئے ہو۔"

منعم باللہ نے غصے سے کہا "بکواس مت کرو۔ ہم سے دور رہو۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔"

مظلی نے کلیم الدین بھوتیاں کو محبت سے اور حسرت سے دیکھا پھر منعم باللہ کی طرف کچھ مسکراتی کٹی ہوئی زبان سے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہنسی خوشی جینے کے لیے تیار ہوں مگر یہ چاہتی ہوں کہ ان سب کو یہاں سے جانے دو۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔"

وہ زبان سے بھی کہہ رہی تھی اور اشاروں سے بھی سمجھا رہی تھی۔ منعم باللہ نے کہا "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، اپنی غلطی کی تلافی کے لیے تم جو کہو گی وہ کروں گا۔ ان سب کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ انہیں جانے کی اجازت دوں گا۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔"

کلیم الدین بھوتیاں ان کے درمیان آ کر بولا "میں ایسی زندگی نہیں چاہتا جو ایک عورت کو قربان کرنے کے بعد ملے۔"

"دیکھو مظلی! معلوم ہوتا ہے یہ مد رنگاں مرنا چاہتا ہے اس کی حسرت پوری کر دو۔ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ اسے زندہ چھوڑ سکتا ہوں لیکن اگر یہ ایسی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اسے مارنے کے بعد تمہارے باقی ساتھیوں کو چھوڑ دوں گا۔"

مظلی فوراً کلیم الدین بھوتیاں کو ایک طرف دھکا دے کر ہٹاتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنے راستے پر لوٹ کر چلے جاؤ۔ میری پرواہ مت کرو۔ میں تو عورت ہوں۔ عورت پانی کی طرح ہوتی ہے جس شکل کے برتن میں ڈالا جاتا ہے وہی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ جیسے مرد کے پاس رہتی ہے ویسی زندگی گزارتی ہے۔ تم لوگ میری پرواہ مت کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ یہ میری لاش پر سے گزر کر ہی تمہیں لے جا سکے گا۔"

منعم باللہ [illegible] کر کہا "تو ٹھیک ہے [illegible] پر سے گزر کر اسے لے جاؤں گا۔"

عظمی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کے ریوالور والے ہاتھ کو تھام لیا اسے فائر کرنے سے منع کرنے لگی۔ [illegible] نے کہا: [illegible] ہوتا ہے۔ تم بھی وہ سے چلتے ہو جو ایسی صورت میں ہو میرا رقیب ہو اور رقیب کو زندہ چھوڑنا بہت بڑی نادانی ہے۔ یہ یہاں سے جانے کا مگر راستے سے پلٹ کر آ جائے گا۔ [illegible] نہیں ہو سکتا ہے پھر [illegible] تو [illegible] عظمی [illegible] تمہیں سمجھاتا ہوں [illegible] زندہ نہیں جائے گا۔

عظمی فوراً ہی [illegible] عمریان کے سامنے [illegible] ہوئی زبان سے کہنے لگی [illegible] اسے مارنا ہی ہے تو پہلے مجھے مارو۔ میں ان سب کی زندگی چاہتی ہوں۔ [illegible] ان کے ساتھ مر جانا چاہتی ہوں۔

اس کی حرکتوں سے بہت سی باتیں سمجھ میں آ جاتی تھیں۔ اس نے کہا: اس سے جان دینے کی حد تک محبت کر رہی ہو؟ [illegible] ہاتھ میں [illegible] ہو جو اس کے ساتھ چلتی ہے۔ میرے ہاتھ سے [illegible] چھوٹ [illegible] ساتھ [illegible] تمہارے ساتھ [illegible] میرے ہاتھ میں آ جائے گی۔

اس کی بات پوری ہوتے ہی ایک بڑا سا پتھر اس کے منہ پر [illegible] وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا [illegible] تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ وہ [illegible] بھول گیا تھا [illegible] چھوٹی سی چھت پر چڑھ کر [illegible] مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے پتھر کھینچ کر مارا تھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا [illegible] ہوگا جب تک وہ سمجھتے اس وقت تک منعم باشاہ [illegible] دوسری طرف [illegible] تھی اور دوسری طرف سے کلیم الدین عمریان نے اس کے [illegible] وقت ہو ایک طرف [illegible] ٹریگر [illegible] کر دیا۔

گولی چلنے کی آواز سنتے ہی سب منتشر ہو گئے جہاں تھے وہاں سے ذرا دور بھاگ کر اکٹھے ہو گئے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ گولی کس نے چلائی۔ ریوالور دوست کے ہاتھ میں ہے یا دشمنوں کے؟

منعم باشاہ اور بابر گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دونوں [illegible] کی آواز پر [illegible] ہو گئے۔ جب بابر نے دیکھا کہ ریوالور کلیم الدین عمریان کے ہاتھ میں ہے تو اس نے پھر منعم باشاہ پر حملہ کیا۔ عمریان نے کہا: رک جاؤ بابر! لڑنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس کے پاس جتنے بلٹ ہیں، انہیں اپنے قبضے میں لے لو۔

بابر نے فوراً ہی اس کی کمر سے وہ پیٹی کھول لی جس میں بلٹ لگے ہوئے تھے۔ عمریان نے کہا: منعم باشاہ! عارفی اور عظمی کی [illegible] کا علم ہوا تو تمام [illegible] آ گئیں ہم سب ہی جانتے ہیں کہ تمہاری [illegible] پر [illegible] ہوتی تھیں۔ ہم تمام بنگالی تمہاری ماں کو [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] تمہاری ولدیت بھی یہ نہیں [illegible] ہو گا کہ اردو بولنے والے قتل کیے جائیں [illegible] زبان کاٹی جائے ہم سب کی [illegible] کسی کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرتے ہیں تو اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ اگر زبان کا مسئلہ تھا تو ہمارے ملک کی [illegible] اکثریت کی زبان بنگالی ہے پاکستان [illegible] بنگالی سب سے زیادہ بولی سب سے زیادہ لکھی سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے لہٰذا اسے قومی زبان ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ بنگالی زبان کو قومی زبان نہیں بنایا جا رہا ہے لہٰذا اردو بولنے والوں کو قتل کیا جائے یا اردو زبان کو کچل دیا جائے

اس نے پوچھا: تم ریوالور دکھا کر کیا منوانا چاہتے ہو؟

[illegible] ہتھیاروں کے زور پر منوائی نہیں جاتی۔ میں صرف دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ عظمی کے ساتھ تم نے جو سلوک [illegible] کوئی [illegible] اپنا [illegible] تم [illegible] بھی [illegible] گا۔ دوسری بات [illegible]

[illegible]

جو۔ ان تینوں کو گولی مار دو یہاں [illegible]

[illegible]

رکھوں گا۔ یہ دیکھیں گے کہ ہم لوگ جتنیں اٹھا رہے ہیں یہ بھی ہمارے ساتھ مصیبتیں اٹھاتے ہوئے برما کی سرحد تک جائے گا۔ جب ہم دوسرے ملک پہنچ جائیں گے تو میں اس کا خونی ریوالور اسے واپس کر دوں گا۔"

منعم باللہ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا "میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے زبردستی نہیں لے جا سکتے۔"

"تم جاؤ گے اور نہیں جاؤ گے تو پہلے تمہاری ایک ٹانگ پر گولی ماروں گا۔ تم لنگڑاتے ہوئے گھسٹتے ہوئے چلنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ میں [illegible] ساتھیوں کا بھی [illegible] ہو گا۔ سوچ لو۔"

بڑے میاں نے کہا "یہ کیا حماقت ہے۔ دشمنوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو راستے میں یہ کہیں بھی ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔"

بھوتیاں نے جواب دیا "شیر اگر پنجرے میں ہو تو اسے کہیں بھی لے جایا جا سکتا ہے۔ دشمنوں کو ریوالور کی زد پر رکھا جائے تو وہ چوہے بن کر رہتے ہیں۔"

[illegible] نے جھنجھلا کر کہا۔ صاف کیوں نہیں کہتے [illegible] نہیں چاہتے

[illegible] پاکستانی [illegible] بنگالی [illegible] خود کو [illegible]

[illegible]

دی۔ وہ کان لگا کر [illegible] درختوں [illegible] میں کر سرحد سے آنے والی گاڑی نظر نہیں آ سکتی تھی [illegible] ہوا تھی [illegible] پاکستان کی [illegible] پیچھے [illegible] قیدیوں [illegible] ایک اور جیپ کار آ کر رک گئی۔ اس میں بنگلہ دیش کے مسلح فوجی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں اور [illegible] تھیں۔ [illegible] تیزی سے ان کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ [illegible] منعم باللہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ریوالور اب تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔ تم مجھے سرحد کی طرف کیا لے جاؤ گے ابھی دیکھتے ہی دیکھتے میں تم سب کو زندگی کی سرحد کے پار پہنچا دوں گا۔"

ان کی باتوں کے دوران بی ڈی آر کے جوانوں نے [illegible] چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ چاروں طرف اسٹین گنیں [illegible] تھیں۔ کلیم الدین بھوتیاں نے بے بسی سے ایک گہری سانس لی اور ریوالور کو فوجی افسر کے قدموں کی طرف پھینک دیا۔

◆

وہ ٹرک سرحد کی طرف جا رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ [illegible] بیٹھا ہوا تھا۔ خسرو کے ساتھ نین تارا بیٹھی ہوئی تھی۔ پچھلے حصے میں بوروں کی بوریوں پر ایک [illegible] کے ساتھ تلسی رام کا خاص آدمی بیٹھا ہوا تھا جو خسرو اور نین تارا کو [illegible] تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔

نین تارا سونا نہیں چاہتی تھی لیکن [illegible] کی جاگی ہوئی تھی۔ [illegible] کی کوشش کرنے کے باوجود اونگھنے لگی تھی۔ [illegible] وقت سامنے [illegible] سے ٹکرانے لگی تھی۔ خسرو نے کہا "میرے کاندھے پر سر رکھ لو۔"

وہ بھلا سر کیسے رکھتی؟ وہ نئی دلہن تھی۔ پھر ایک اجنبی ڈرائیور ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مشرقی عورت کی یہ خوبی [illegible] اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بھی شرماتی ہے۔ پھر وہ [illegible] کاندھے پر سر رکھ کر کیسے سو سکتی تھی؟ لیکن وہ تھوڑی [illegible] نہ سکی۔ نیند کا غلبہ ایسا تھا کہ آنکھیں بند ہونے کے بعد اس کا سر آپ ہی آپ خسرو کے شانے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔

حسن اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر اکثر لوگوں کی [illegible] پل بھر میں بدل جاتی ہے۔ خسرو نے محسوس کیا [illegible] بھی کبھی کن انکھیوں سے نین تارا کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ کبھی [illegible] پر تاؤ دیتا ہے [illegible] لگتا ہے۔ اس نے نین تارا کے سر پر چادر ڈال دی۔ اس کے چہرے کو ڈھانپ دیا۔ مرد خواہ کتنا ہی برتر ہو، شادی کے بعد عورت کا باڈی گارڈ بن کر رہ جاتا ہے۔

[illegible] وہ [illegible] گوپی ناگر پہنچ گئے۔ ان کا راستہ [illegible] تھا۔ ڈرائیور نے ٹرک کو [illegible] سامنے لے جا کر روک دیا۔ تلسی رام کا خاص آدمی ٹرک سے [illegible] چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جسے پولیس والے تھانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ٹرک کی آواز سنتے ہی تھانیدار جلدی سے باہر آیا تھا۔ جو تلسی رام [illegible]

آدمی کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر خوشی سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے سمجھوتہ ہے۔ [illegible] مال [illegible] اور نہ ہی خسرو اور زمین تارا کو روکا جائے گا۔

وہ دونوں تھانے کے اندر چلے گئے۔ ڈرائیور ٹرک سے [illegible] چیک کرنے کے لیے سامنے کی طرف آیا۔ بوٹ اٹھانے کے [illegible] اس نے زمین تارا کی طرف دیکھا مگر اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے بوٹ کو اٹھایا پھر ایک [illegible] دھماکے کی آواز کے ساتھ گرا دیا۔ زمین تارا [illegible] چیخ مار کر سیدھی ہو گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ خسرو نے اسے تھام لیا، پھر ایک ہاتھ سے تھپکتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، میں تمہارے پاس ہوں۔"

ڈرائیور پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "بی بی جی۔ ڈر گئی۔ بے چاری سو رہی تھی۔"

تھانیدار نے جھونپڑی سے باہر نکل کر پوچھا "یہ کیسی آواز تھی؟"

ڈرائیور نے کہا "حضور میرے ہاتھ سے بوٹ چھوٹ گیا تھا کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔"

خسرو اسے تھپک رہا تھا اور کہہ رہا تھا "سب ٹھیک ہے [illegible] زیادہ [illegible] ضرورت [illegible] ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ سے بوٹ چھوٹ گیا تھا تم سو جاؤ۔"

وہ [illegible] میں [illegible] بولی "میں کیسے سو سکتی ہوں؟"

"نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔"

[illegible]

داروغہ نے کہا "میرے گھر میں بیوی بچے اور جوان بیٹیاں ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم دونوں وہاں چل کر اشنان کرو، بھوجن کرو۔ اس کے بعد نیند ہو تو سو جاؤ۔ ہم وقت پر جگا دیں گے۔"

خسرو نے کہا "ہم اشنان کر کے آتے ہیں۔ بھوجن کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ [illegible] تھوڑا [illegible] آرام کریں گے۔"

وہ داروغہ کے مکان میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک [illegible] عمر کی عورت [illegible] خوش دلی سے [illegible] استقبال کیا۔ جب وہ ان کے ساتھ ایک کمرے میں چلی گئی تو [illegible] میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

[illegible] اس کی شرارتوں کو ثابت کر سکتا ہوں۔"

رام اوتار نے کہا "ہوں، سمجھ گیا۔ وہ پکا بدمعاش ہے جس تھال میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرے گا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہاں اندھیرا ہونے تک [illegible]"

"میں اس ڈرائیور کی موجودگی میں اطمینان سے نہیں سو [illegible]"

[illegible]

وہ اس کے ساتھ جھونپڑی سے [illegible] دوسرے کمرے میں چلا گیا پھر واپس آ [illegible] ریوالور تھا۔ اس نے خسرو کو دیتے ہوئے [illegible] حالات سے گزر رہے ہو کہ رام اوتار [illegible] نہیں کر سکتے۔ اس ریوالور کو رکھ لو۔ یہ پوری طرح لوڈ [illegible] اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لینا۔ رات کو ہماری [illegible]

[illegible]

وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انھوں نے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر دیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر مین تارا جا کر بیٹھ گئی۔ خسرو جب تک جاگتا رہتا۔ وہ نیند نہیں پا رہی تھی۔ ابھی تک شرما رہی تھی۔ وہ ریوالور کو چیک کر رہا تھا۔ پھر لیٹ گیا۔ تکیے کے نیچے رکھنے کے بعد مین تارا پر ایک نظر ڈالی۔ خسرو کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ انھیں پیار کے جذبوں سے رنگ مل رہی ہیں یا ان پر نیند کا خمار چڑھ رہا ہے۔ مین تارا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر پر آنچل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ایک ذرا آنکھ نہیں جھپکائی ہے۔ میں تو دیر کے لیے راستے میں سو گئی تھی۔ اب آپ آرام سے سو جائیں۔ ان انجانے راستوں پر دماغی طور پر بیدار رہنے کے لیے آپ کا سونا لازمی ہے۔"

خسرو چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ اس کے سر کو سہلانے لگی۔ اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے سر کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

آہ! یہ کیسی ازدواجی زندگی شروع ہوئی تھی۔ دنیا والے ان کے درمیان آتے جاتے تھے۔ یہ سو رہی تھی تو وہ جاگ رہا تھا۔ اب وہ سو رہا تھا تو یہ جاگ رہی تھی۔ یوں تو اس نے دن رات اسے دیکھا تھا لیکن تب وہ ایک ساتھی تھا۔ اب جیون ساتھی بن گیا تھا۔ اب وہ نظر بھر کر اسے دیکھ رہی تھی۔ یہی دیکھنے کا موقع تھا۔ محبت کرنے والے جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ دوسروں کو ان آنکھوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی

نگاہیں ملتی ہیں یہ تو محبت والوں کی گفتگو ہے

وقت گزر رہا تھا۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو ڈرائیور نے رام اوتار سے کہا۔ "آپ کہتے ہیں ہم رات کو گیارہ بجے یہاں سے چلیں گے۔ ایک بجے تک ہم بارڈر پار کریں گے۔ اتنی [illegible] ڈرائیو کرنے کے لیے ایک بوتل دارو پینا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلا سکوں گا۔"

"اس [illegible] خیر ہی گاڑی چلاؤ گے۔ تم دیکھ رہے ہو، ہمارے ساتھ [illegible] اور [illegible] ہماری امانت ہے [illegible] کوئی ترکاریاں [illegible] ہر [illegible] کے [illegible] گا۔

[illegible]

حال ہمارے دوسرے گودام میں پہنچ جائے گا تو تمہیں چھٹی دے دوں گا۔ کل تمام دن پیتے رہنا۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ رات کے نو بجے رام اوتار نے دروازے پر دستک دے کر خسرو کو بیدار کیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ مین تارا سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے عورتوں میں چلی گئی۔ خسرو نے داروغہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا ریوالور واپس کر دیا۔ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور کلینر اسے دیکھ رہے تھے اور خسرو سوچ رہا تھا، یہاں تو ریوالور کی موجودگی میں نیند آ گئی۔ اب کسی ہتھیار کے بغیر باقی راستہ کیسے طے ہوگا۔ وہ پریشان تھا لیکن اس پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا۔ سید پور چھوڑ کر وہ بہت دور آ گئے تھے۔ نہ پیچھے جا سکتے تھے، نہ آگے جانے سے انکار کر سکتے تھے۔

وہ دونوں منہ ہاتھ دھو کر ایک کمرے میں آ گئے۔ ان کے سامنے چاول بھات کھانے کے لیے رکھ دیا گیا۔ جو بھی میسر آیا انھوں نے اس سے پیٹ بھر لیا۔ رات کے سوا گیارہ بجے پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔ وہ ایک اندھیرا سفر تھا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آنکھیں رکھنے کے باوجود کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دور تک راستہ دکھائی دیتا تھا مگر اس کے آگے پھر تاریکی تھی۔ ڈرائیور اور رام اوتار کس طرح راستہ پہچان رہے تھے اور کس طرح راستے بدل کر چل رہے تھے۔ وہی خوب سمجھتے تھے۔

اگرچہ خسرو کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تاہم اچھی طرح نیند پوری کر لینے کے بعد وہ اور مین تارا ذہنی اور جسمانی طور پر تازہ دم ہو گئے تھے۔ وہ ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا خود کو ہر طرح سے مستعد پا رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ تاریکی میں اندازے سے ڈرائیو کرنے لگا۔ شاید وہ ہندوستانی سرحد پر پہنچ رہے تھے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد پیچھے سے رام اوتار نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ انجن کو بند کر دیا۔

مین تارا نے خسرو کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اوپر خدا تھا۔ نیچے اسی ایک ہاتھ کا سہارا تھا۔ چاروں طرف جھینگر بول رہے تھے اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔ وہ سب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ بس مطلب کہ سرحد پار کرنے کے ہتھکنڈوں کو وہی جانتے تھے۔

رام اوتار ٹرک کے پچھلے حصے سے اتر [illegible] طرف [illegible] چند قدم آگے [illegible] کر وہ بھی تاریکی میں گم ہو گئے۔ خسرو کے پاس بیٹھے ہوئے [illegible]

کہا: "اندھا دھونس چلاتا ہے۔"

خسرو نے پوچھا: "کون ہے؟"

"شش! ذرا دم آہستہ بولو۔ اندھیرے میں اور اس ویرانے میں تمہاری آواز تیر کی طرح دور تک جائے گی۔ میں رام اوتار کی بات کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے پینے سے منع کر دیا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ایسے جان جوکھم کے کاموں میں تھوڑی سی شراب کی مستی بھول جاتی ہے۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے ٹرک پر [illegible] تاراکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دف دیکھا۔ اندھیرے میں صاف طور سے نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن خسرو اس کی شرارتوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں جی۔ میرا نام بدھن ہے۔ نام تو فضل کریم ہے لیکن میرے کو سب بدھن بولتے ہیں۔"

"بدھن! یہ کیا بات ہے کہ ایسے وقت ہندو ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور تم مسلمان ہو کر ایک مسلمان عورت کی عزت کرنا نہیں چاہتے ہو؟"

"میں نے کیا کیا ہے جی؟ میں تو بڑی دیر سے چپ چاپ بیٹھا ہوا ہوں۔"

"کیا تم اپنی ماں اور بہن کے سامنے شراب پی کر ادھم کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میں تو پی کر جاتا ہوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی ماں اور بہنوں کی بھی پٹائی شروع کر دیتا ہوں۔ باؤ جی! تم نے کبھی پی ہو تو جانو۔ مردوں میں بھی شیر موت ہے پینے کے بعد سوا شیر ہو جاتا ہے۔ عورتوں پر بڑا رعب پڑتا ہے۔"

ٹرک کے قریب رام اوتار کی آواز سنائی دی: "بدھن! تمہیں کتنی بار کہا ہے اس جگہ پہنچ کر زبان بند رکھا کرو۔ آواز دور تک جاتی ہے۔"

"میں تو چپ ہوں۔ یہ بابو جی میرے سنگ بات..."

رام اوتار نے ڈانٹ کر کہا: "شٹ اپ!"

وہ چپ ہو گیا۔ رام اوتار [illegible]

[illegible]

کیا تھا۔ خواہ وہ بہاری ہوں یا بنگالی ہوں۔ اس سلسلے میں یقیناً بہت سے اسلامی ممالک کے اخبارات نے خبریں شائع کی ہوں گی۔ خسرو نہیں جانتا تھا کیونکہ باہر کے اخبارات پڑھنے کو ملتے نہیں تھے اور ریڈیو بھی کبھی سننے کا موقع ملتا تھا لیکن ایک بات جو سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی، وہ یہ تھی کہ عالم اسلام سے ایک بھی امدادی پارٹی بنگلہ دیش نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس عیسائیت کی تبلیغ کرنے والی جماعتیں بنگلہ دیش کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچی ہوئی تھیں۔ [illegible] انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس، [illegible] تیسری [illegible] اور چوتھی سالویشن آرمی تھی۔ یہ آخری پالیسیاں براہ راست عیسائیت کی تبلیغ نہیں کرتی تھیں لیکن [illegible] اخلاقی ثبوت پیش کرتی رہتی تھیں۔ وہ زبان سے احسان نہیں جتاتے تھے کہ دیکھو ہم عیسائی ہیں مگر تم مسلمانوں کی امداد کے لیے آئے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے متاثر کرتے تھے۔ بے شمار پڑھے لکھے اور جاہل آدمی ان سے متاثر کیوں نہ ہوں گے؟ جب آخری وقت حلق میں پانی ڈالنے والا عیسائی ہو۔ [illegible] بیماروں کو دوائیں دینے والا اور بھوک سے بچانے والا دشمنوں سے [illegible] ہو تو لوگ [illegible] کوئی بھی امدادی پارٹی [illegible] ملک میں [illegible] ایک دن سب کو چلے جانا تھا۔ صرف سالویشن آرمی ہمیشہ [illegible] رہ جاتی ہے اور یہ وہی وقت ہوتا ہے جب ماں باپ اپنے بچوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتیں [illegible] کسی کو دم توڑتے نہیں دیکھ سکتیں اور انہیں زندگی سے [illegible] ہوتی ہے تو وہ عیسائیت کی طرف [illegible] بنگلہ دیش [illegible] اسلامی امدادی پارٹی [illegible] نہیں تھی۔

خسرو [illegible] ایک بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی جو کبھی [illegible] تھی۔ رام اوتار کو دوسری طرف سے سگنل مل رہا تھا [illegible] میں ٹرک کے قریب ہی ایک ٹارچ جلنے بجھنے لگی۔ ادھر سے رام اوتار سگنل کا جواب دے رہا تھا [illegible] گاڑی اسٹارٹ ہوئی [illegible]

[illegible]

گاڑی کبھی کیچڑ میں دھنستی تھی پھر نکل جاتی تھی کبھی کسی جگہ پانی بھرا ہوتا تھا کہ پہیئے تک ڈوب جاتے تھے۔ کہیں ٹوٹا ہوا تھا۔ ٹرک زور سے اچھلتی تھی۔ نین تارا اور خسرو ایک دم سے بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتے تھے۔ [illegible] ڈرتے تھے۔ ایک دوسرے کو سنبھالتے تھے۔ کبھی گھنے درختوں کی شاخیں اچانک سامنے اطراف یوں آ رہی تھیں جیسے نہ معلوم کتنے عرصوں سے یک بارگی حملہ کر دیا ہو۔ وہ دونوں ایسے حالات سے کبھی نہیں گزرے تھے۔ اس لیے سہمے ہوئے تھے۔

گاڑی اسی طرح [illegible] ڈگمگاتی ہوئی اور جھٹکے کھاتی ہوئی چلتی رہی۔ وہ دونوں پریشان تھے۔ [illegible] سانس روکے بیٹھے رہے [illegible] ہوا۔ راستہ کسی طرح طے ہو جائے جھٹکے ہی کھا [illegible] سے لگا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑاتے تھے۔ سنبھلتے جاتے تھے [illegible] خوشبو بھی سے [illegible] بیٹھے رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ [illegible] انہیں روشنی کا جھلملا تھا۔ وہ [illegible] وقفے وقفے سے آتی ہی دور پھر روشنی کا سلسلہ ملتا تھا اور گاڑی اسی طرح بڑھتی جاتی تھی۔

تقریباً تین بجے وہ ایک جگہ رک گئی۔ قریب ہی کوئی دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی اور [illegible] لیے کھڑا ہوا تھا۔ رام اوتار گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آیا۔ پھر اس سے پوچھا "کیا تم مطمئن ہو؟ یا ڈر پولیس کو شبہ تو نہیں ہوگا؟"

اس دیہاتی نے جواب دیا "بالکل نا ہی رکھوالی پھیرا مارنے والی پارٹی بڑی ندی کے اس پار لگ گیا ہے بجے آئی تھی۔ پچھلی بار بھی آئے ساڑھے ایک بجے پھیرا مارنے آئی۔ ہم ابھی دن جاتے ہیں۔ اب صبح تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

رام اوتار نے اپنی جیب سے پانچ پانچ کے چار نوٹ نکال کر اسے دیئے۔ وہ بیس روپے لے کر ایک دم سے خوش ہو گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے دعائیں دینے لگا۔ اسی دوران ڈرائیور گاڑی کی ہیڈلائٹ [illegible] کر رہا تھا۔ اب وہ [illegible] موٹر [illegible] کے [illegible] کردہ نمبروں کے مطابق تھی۔ ٹرک کی پیشانی پر [illegible] لکھا ہوا تھا۔ وہ تختی ہٹا کر وہاں ہندی زبان میں لکھی ہوئی ایک تختی لگا دی گئی۔ [illegible] گاڑی پھر [illegible]۔

پھر وہی جھٹکے تھے۔ لیکن اتنی دیر میں خسرو نے سمجھ لیا تھا کہ وہ گاڑی [illegible] سے گزر رہی ہے۔ جب تک [illegible] پر نہیں پہنچے گی یونہی جھٹکے لگتے رہیں گے۔ ویسے بھی [illegible] بھی [illegible] تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ مصیبتیں آتی ہیں تو اپنا وقت پورا کر کے ہی جاتی ہیں۔

وقت پورا ہو گیا۔ جب گاڑی صحیح طرح سیدھے راستے پر چلنے لگی تو اس وقت صبح کی ہلکی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ بدھن نے رفتار تیز کر دی۔ موڈ میں آ کر سیٹی بجانے لگا کبھی کبھی ان آنکھوں سے نین تارا کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ خسرو نے یہ محسوس کر لیا تھا۔ پھر نین تارا کی طرف دیکھا۔ وہ بدھن کی حرکتوں سے بے خبر دوسری طرف کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ راستے میں کئی کئی میل کے فاصلوں پر چھوٹے چھوٹے دیہات نظر آ رہے تھے۔ ایسی کوئی پولیس پارٹی راستے میں نہیں ملی جو ان سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرتی۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے رام گڑھ پہنچ گئے۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق وہاں تلسی رام کے گودام میں لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرک کو دیکھتے ہی بڑا سا آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ ٹرک گودام کے اندر چلا گیا پھر اس گیٹ کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ نین تارا اور خسرو ٹرک سے اتر گئے۔ رام اوتار نے کہا "آپ دونوں یہاں بوریوں پر ذرا دیر آرام سے بیٹھیں۔ میں ابھی فارغ ہو کر آتا ہوں پھر آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔"

"کیا یہاں کچھ دن رہنا ہوگا؟"

"جی ہاں، آج ایک دن اور ایک رات رام گڑھ میں گزاریں گے پھر یہاں سے آگے جائیں گے۔ جب تک میں تلسی رام جی کا مال ٹھکانے لگا دوں گا۔"

خسرو نے چاول کی بوریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکی ہیں۔ کیا انہیں منڈی میں بیچنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے؟"

"میں اس مال کی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

"کیا اور بھی کچھ مال ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "بھائی جی! یہ ہمارے دھندے کی باتیں ہیں۔ آپ پوچھ کر کیا کریں گے۔ اپنے خدا کا شکر ادا کریں کہ یہاں تک خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ وہاں تک بھی پہنچ ہی جائیں گے۔"

وہ اپنے آدمیوں کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ بدھن نے اس سے کہا "اب میں جا رہا ہوں۔ جب تک بوتل کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ نیند نہیں آئے گی۔"

ایسا کہتے وقت وہ نین تارا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رام اوتار سے سو روپے لے کر وہ ان کے پاس آیا۔ ایک بار خسرو کو دیکھا پھر ایک بار نین تارا کو دیکھا پھر وہ وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ خسرو نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "یہ [illegible]

سے میرے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔

[illegible] گھنٹے میں رام اوتار انھیں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کے بیوی بچے تھے لیکن تارا اور خسرو تمام دن بڑے مطمئن رہے۔ انھیں عجیب ماحول ملا۔ رات کو رام اوتار ایک گٹھڑی لے کر آیا جسے ان کے سامنے کھولتے ہوئے بولا: "آپ لوگوں کے زیورات ہیں۔ ایک ایک کر کے دیکھ لیں۔ کوئی کمی ہو تو بتا دیں [illegible] مرزا لال جی کے [illegible] تمام زیورات اور [illegible] نقد مل گئے تھے۔ [illegible] نے کہا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں۔"

اس نے وہ رقم بھی ان کے سامنے رکھ دی۔ [illegible] نے کہا: "خسرو دیدی نے [illegible] یہ تمام زیورات ہمارے سامنے رکھ دیے تھے اور کہا تھا کہ یہ سب ہمارے ہیں۔ انھوں نے ان میں سے ایک سیٹ مجھے پہنایا تھا۔ باقی [illegible] سیٹ [illegible] رکھ دیے تھے [illegible] دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا [illegible] دوسری صبح ہم سے زیورات ملتے تو ہم [illegible] کر دیے [illegible] اس گٹھڑی کا [illegible] معلوم ہوتا۔ اب بھی ہم یہاں بیٹھ کر حساب [illegible] آپ نے ہمیں یہاں تک خیریت سے پہنچا دیا۔ یہ احسان کیا کم ہے؟"

[illegible]

[illegible] کر جا سکتے ہیں؟"

رام اوتار انھیں کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ رات انھوں [illegible] جانے کس وقت کیا ہو جائے۔

[illegible] وہ [illegible] رام اوتار [illegible] اپنے ساتھیوں کے سامنے نہیں آنے گا۔ [illegible] یہاں

سے لے جائے گا۔

لیکن رام اوتار دوسری صبح نہ دیکھ سکا۔ آدھی رات سے پہلے ہی اس کی لاش گھر لائی گئی۔ معلوم ہوا نشے کی حالت میں کسی شرابی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ شرابی بری طرح زخمی ہوا لیکن رام اوتار مارا گیا تھا۔ جس گھر میں ابھی تک سکون تھا، وہاں ماتم ہونے لگا۔ رونے پیٹنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ محلے پڑوس کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ عورتیں بھی گھروں سے [illegible] رہی تھیں۔ اس سے پہلے ہی رام اوتار کے بڑے لڑکے نے خسرو سے کہا: "بھائی صاحب! آپ اپنی دھرم پتنی کو لے کر پچھلے راستے سے نکل جائیں۔ میں کسی ہوٹل میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ یہاں عورتیں آئیں گی تو آپ لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔"

خسرو نے [illegible] تارا کا ہاتھ پکڑا پھر اس لڑکے کے ساتھ پچھلے دروازے سے نکل [illegible] [illegible] تک بھی وہاں [illegible] ہونے سے پہلے ہی [illegible] ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے تو ہمیں وہاں اپنا نام پتہ لکھوانا ہوگا۔ پولیس والے انکوائری کر سکتے ہیں۔"

لڑکے نے کہا: "ابھی مجھے پتا جی کی ارتھی اٹھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ [illegible] زیادہ وقت نہیں [illegible] ہوں۔ یہاں سے [illegible] سے گزرتی ہے۔ آپ وہاں سے [illegible] سے نیپال جا سکتے ہیں۔"

اس نے خسرو کا جواب سنے بغیر سامنے سے گزرنے والے ایک رکشے کو [illegible] جائیں گے۔ انھیں بس اسٹاپ تک پہنچا دو۔"

وہ دونوں رکشے پر سوار ہو گئے۔ لڑکا وہاں سے دوڑتا [illegible] طرف چلا گیا۔ [illegible] وہ رکشے میں بیٹھ [illegible]

اب ان کا کوئی رہنما نہیں تھا۔ پہلے ایک آسرا تھا کہ کوئی راستہ دکھانے والا ہے۔ [illegible] ان باتوں کا [illegible] تو پھر [illegible]

انھوں نے اب تک اس کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ وہ اب تک یہی سوچ کر مطمئن تھے کہ جو ہوگا اس سے راہو اوتار نمٹ لیا کرے گا۔

وہ دونوں اندر ہی اندر سہمے ہوئے تھے۔ وہ [illegible] تھے اور اب پہنچ بہار میں تھے۔ اس نے پہلے انھوں نے نہ تو بہار کا کوئی علاقہ دیکھا تھا اور نہ ہی بہار کے لوگوں سے کبھی ان کا سامنا ہوا تھا۔ وہ ہر گز وہاں کی بولی، وہاں کا لباس، وہاں کی تہذیب سب کچھ [illegible] اجنبی تھی۔ انھوں نے آج تک صرف اپنے والدین کی زبان سے بہار سے متعلق سنا تھا اس کے باوجود وہ بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان بلکہ بی بی سی تک سے بہاری کہلاتے تھے۔ ان کے آس پاس بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں علاقائی زبان میں باتیں کر رہی تھیں پیچھے بیٹھا ہوا ایک دیہاتی اپنے کسی مسافر ساتھی سے کہہ [illegible] ہو گئیا! آج بکار گئے۔ حالی پیٹ میں [illegible] کے [illegible] گھو [illegible]۔"

زین تارا نے خسرو کی طرف ذرا جھک کر آہستگی سے کہا۔ "ہمارے گھر والے بھی کچھ اسی قسم کی زبان بولتے تھے لیکن یہ زبان تو کچھ عجیب ہے۔ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کیا آپ بہاری بول جانتے ہیں؟"

"نہیں، میں تو بچپن ہی سے گھر چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ حاصل پور میں میری پرورش ہوئی۔ وہیں میں نے تعلیم حاصل کی۔ میں صرف بنگالی، اردو اور انگریزی جانتا ہوں۔"

"یہاں ہم انگریزی بول نہیں سکتے ہماری اردو زبان ایسی ہے کہ فوراً ہی پاکستانی کی حیثیت سے ہماری شناخت ہو جائے گی۔ ہندی زبان ہم جانتے نہیں ہیں اور ہماری علاقائی زبان بھی ہم بول نہیں سکتے بس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم بنگالی سنتے رہیں۔"

خسرو نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لہٰذا اب ہم بنگالی میں گفتگو کریں گے یہی ٹھیک ہے۔"

زین تارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ بس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

رات کے دو بجے وہ بس کسی آبادی میں پہنچ کر رک گئی۔ کچھ مسافر اترنے لگے کچھ چڑھنے لگے۔ نئے مسافروں میں ایک پولیس انسپکٹر نظر آیا۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور تھا۔ ہاتھ میں بید [illegible] ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ دہکتی تھیں۔ [illegible] ہوتی تھیں [illegible] تھا جیسے وہ کسی پر نظر ڈالتے ہی اس کے اندر کی بات معلوم کر لیتا ہے اور مجرموں کو اس طرح چھانٹ کر نکال لیتا ہے جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال لی جاتی ہے۔

اس نے بس کے اندر آتے ہی چاروں طرف گھور کر دیکھا ایک ایک مسافر پر نظر ڈالی پھر خسرو کو دیکھتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ راہداری کے ادھر خاتون تھا اور ادھر یہ جم تھے۔

انسپکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ اس ڈبیہ کو پہلے دو بار ایک انگلی سے بجایا پھر اس کا ڈھکن کھول کر ڈبیہ خسرو کی طرف بڑھا دی۔ اس ڈبیہ میں گل رکھا ہوا تھا۔ گل ایک قسم کا نشیلا سفوف ہوتا ہے۔ نسوار کی طرح [illegible] نام نشہ ہوتا ہے لیکن اس کی عادت پڑ جانے کے بعد پھر یہ منہ سے نہیں چھوٹتا۔

عادی لوگ گل کو ایک انگلی میں لے کر جبڑے کے اندر دبا لیتے ہیں اس عمل سے اتنی ہی تسکین ہوتی ہے جتنی کہ سگریٹ پینے والے یا پان کھانے والے کو ہو سکتی ہے۔ خسرو اکثر اسے استعمال کیا کرتا تھا لیکن وہ عادی نہیں تھا اگر یہ نہ ملے تو اس کی طلب نہیں ہوتی تھی اور جب مل جاتا اور سامنے آ جاتے تو ایک چٹکی لے کر منہ میں رکھنے کو دل مچلتا تھا۔

اس نے ڈبیہ کو دیکھا پھر انسپکٹر کو دیکھا۔ دماغ نے سمجھایا، قانون کا ایک محافظ دوستی کی پیشکش کر رہا ہے۔ اسے ٹھکرانا دانشمندی نہیں ہے۔ جب یہ اپنی طرف متوجہ ہو ہی گیا ہے تو اسے دوست بنا کر رکھنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے ڈبیہ قبول کی۔ اس میں انگلی ڈال کر تھوڑا سا سفوف نکالا اور اپنے جبڑے میں اسے رکھ لیا پھر ڈبیہ اسے واپس کر دی۔

انسپکٹر نے بھی اسی طرح گل کو استعمال کیا پھر ڈبیہ بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے خسرو سے پوچھا: "تو کیواں سے آئی لا ہو؟"

خسرو نے ہچکچاتے ہوئے بنگالی زبان میں کہا: "آمی آپنار بھاشا بوجھتے پاری نا۔"

انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا: "وہ تو تم بنگالی ہو۔"

خسرو نے ان ہی کے انداز میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے پوچھا: "اردو تو بول لیتے ہو گے؟"

"ہم اردو تھوڑا تھوڑا [illegible] آتا ہے۔"

وہ مسکرانے لگا پھر اس نے پوچھا: "[illegible] میں کیوں مسکرا رہا ہوں۔"

خسرو نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ "[illegible] ہوسے"

"آپ کا من کا بات آپ جانتا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا: "میں [illegible] ہوں۔ [illegible] کی [illegible] ہم پہچان [illegible] کہ ان میں سے کتنے [illegible] قتل [illegible] جب [illegible] پاکستان تھا تب [illegible] تھے [illegible] نے [illegible] کا [illegible] آج بھی [illegible] سکتے پھر تم بنگالی کیسے ہو گئے؟"

خسرو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ [illegible] پکڑ لیا تھا۔

◆

فوجی افسر نے قدموں کے پاس پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھایا اس کے چیمبر کو چیک کیا [illegible] دیکھا پھر [illegible] اس میں سے دو فائر ہوئے ہیں۔ چار گولیاں باقی ہیں۔ دو گولیوں سے کن لوگوں کو ہلاک کیا گیا ہے؟"

منعم باللہ کچھ [illegible] تھا اس سے پہلے [illegible] نے ان کی طرف [illegible] اشارہ کر کے [illegible] یہ ریوالور لے کر آیا تھا [illegible] باہر آنے پر مجبور کر رہا تھا پھر [illegible] میں آ گیا۔ اس نے ابھی تک کسی شخص کو ہلاک نہیں کیا ہے میں نے بھی انھیں دھمکانے کے لیے ہوائی فائر کیا تھا۔"

منعم باللہ نے ہنستے ہوئے کہا: "تم دھمکی دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ بزدل کے ہاتھ میں تلوار دے دی جائے تو وہ اسے کبھی نہیں چلا سکتا۔"

فوجی افسر نے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں پر [illegible]

"جی ہاں، میں بنگالی ہوں مگر ان کے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں جانا چاہتے ہو؟"

منعم باللہ نے کہا: "اس لیے کہ یہ اور اس کا پورا خاندان [illegible] سلیم الدین جوتیاں کا لڑکا ہے۔"

[illegible]

[illegible]

"[illegible] تو میرے خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل [illegible] دیا۔ ایک میں زندہ رہ گیا ہوں۔ یہاں رہوں گا تو ان کی یاد ستائے گی۔ میں یہاں کسی قیمت پر نہیں رہ سکتا اس لیے ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

منعم باللہ نے طنزیہ انداز میں کہا: "رہا ہوں نہیں رہا تھا کہو۔ کیا اب بھی تمھیں یقین ہے کہ یہاں سے زندہ جا سکو گے؟"

فوجی افسر نے منعم باللہ کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا "تم انھیں کیوں روک رہے ہو؟"

منعم باللہ نے تیوری سے فوجی افسر کی طرف دیکھا پھر پوچھا: "یہ آپ کیسا سوال کر رہے ہیں کیا ان غداروں کو یہاں سے ہم جانے دیں گے۔ ان بہاریوں نے ہمارے لوگوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں؟"

فوجی افسر نے کہا: "بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [illegible] کوئی نادان بچہ نہیں ہوں۔ پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب میری نظروں میں ہے [illegible] اعلان کیا جا چکا ہے کہ دیش میں [illegible] ہتھیار [illegible] واپس کر دیں [illegible] خود ہی [illegible] ان میں تم [illegible] بھی ہیں۔ بائی دی وے، تمھارا نام کیا ہے؟"

"منعم باللہ۔"

"[illegible] منعم باللہ! ہم مکتی باہنی [illegible] جوانوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش بنانے میں تم سب نے سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے لیکن [illegible] بنانے کے بعد اپنی ہی حکومت کے قانونوں کو تسلیم نہ کرنا [illegible] ان پر عمل نہ کرنا ٹھیک اسی طرح کی غداری ہے، جس طرح [illegible] سلیم الدین جوتیاں کے خاندان والوں نے غداری کی تھی۔ [illegible] ہیں جو دیش کو نقصان پہنچاتا ہے۔ [illegible]"

"تم ایک ریوالور لے کر ان سب کو ہلاک کر کے دیش کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو؟"

"میں انھیں اپنے ملک کے لاکھوں بنگالیوں کے قتل کی سزا دے رہا ہوں۔"

"جب تم نے یہ حکومت بنائی اور اس کا اپنا ایک [illegible] کو تم ہاتھ میں رکھو گے؟"

اس نے ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "تو یوں تو اب آپ کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ میں تو نہتا ہوں۔"

"صرف باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا۔ تم اور تمہارے دونوں ساتھی ہمارے ساتھ چلو گے اور [illegible] کہ تم لوگوں نے بنگلہ دیش کے قانون کے مطابق [illegible] کیوں نہیں کیے اور اپنی حاضری کی رپورٹ کیوں نہیں دی۔"

"وہ [illegible] ان ساتھیوں [illegible] سامنے نہیں [illegible] طرح فکر [illegible] اور یہ سب بے گناہ ہیں۔"

فوجی افسر نے کلیم الدین بھوئیاں [illegible] اور [illegible] پھر [illegible] بار منعم باللہ [illegible]

وہ ان لوگوں سے دور چلا گیا۔ منعم باللہ جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے پوچھا: "کیا [illegible] دنیا [illegible] کے جیسے ادارے ہیں، وہ سب اندھے ہو رہے ہیں اور [illegible] ہیں کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے [illegible] رہی ہے۔ کیا دنیا میں تمام پریس خاموش ہیں۔ [illegible] ہو گئے [illegible] ہیں؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ جو تم سمجھ نہیں پا رہے [illegible] میں پاکستان کا خاتمہ اس کی بدنامی کے ساتھ ہوا تو پریس [illegible] حمایت کر رہے تھے انھوں نے پاکستان کے خلاف ایک ایک خبر [illegible] ہم پر ہونے والے مظالم کی داستانوں کے [illegible] شائع کیں۔ اسی طرح جو پریس پاکستان کی حمایت میں ہیں، وہ ہمارے خلاف تصویری [illegible] شائع کر رہے ہیں۔"

"پاکستان کی حمایت کرنے والے پریس کہاں ہیں؟ [illegible] داستانیں شائع کر رہے ہیں؟"

"یہ [illegible] جب تھے کہ سب پاکستان [illegible] بنگلہ دیش [illegible] کے بعد [illegible] صرف ان ذرائع پر اعتماد کرنے لگے جو بالکل غیر جانبدار ہوتے ہیں [illegible] سیاق و سباق کے [illegible] اور [illegible] ہیں۔ تب ہم اپنی [illegible] ایک حقیقت [illegible] بنگلہ دیش کا آغاز [illegible] آخر میں [illegible]

میں کر رہے ہیں، پھر ہماری انتہا کیا ہوگی؟"

منعم باللہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے بسی سے کہنے لگا:

"آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ انھیں چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ انھیں یہاں سے جانے کا موقع دیں گے؟"

"دیکھو تم لوگوں نے بھی جی بھر کر انتقام لیا ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ اگر جا رہے ہیں تو [illegible] سے منہ پھیر لینا چاہیے۔ [illegible] بن جانا چاہیے۔ اچھا ہے، یہ ہماری زمین چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ یہ بنگال والے مختلف سرحدوں سے بہاریوں کو لے جا رہے ہیں۔ تو کیا ہم ان سے بے خبر ہیں؟ کیا یہ ہم سے زیادہ چالاک ہیں؟ نہیں، ہم ان کی طرف سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔"

منعم باللہ نے کہنا چاہا: "لیکن..."

فوجی افسر نے سخت لہجے میں کہا: "مجھ سے بحث نہ کرو! تم سمجھ لو کہ بہاریوں کو سرحد پار کرنے والے ہمارے [illegible] ہماری نظر میں [illegible] حرکت [illegible] ہمارے گھر کا کوڑا باہر جا کر پھینک رہے ہیں۔ دانشمندی یہی ہے کہ جب گھر کی صفائی ہو رہی ہو تو کچرے کو باہر جانے دو۔ بس اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرے ساتھ چلو۔"

پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو وہاں سے چلنے کا حکم دیا۔ منعم باللہ نے بھی اپنے ساتھیوں سے چلنے کے لیے کہا۔ کلیم الدین بھوئیاں اور دوسرے تمام ساتھی ان لوگوں کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور حیرانی سے سوچ رہے تھے: ہم غیر قانونی طور سے بنگلہ دیش کی سرحد کو پار کرنے کے لیے جا رہے ہیں پھر یہ ہمیں روکتے کیوں نہیں ہیں۔ کیوں چپ چاپ واپس [illegible] رہے ہیں۔

وہ لوگ دونوں جیپ گاڑیوں میں جا کر بیٹھنے لگے تو کلیم الدین بھوئیاں تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا تھا۔ اس نے فوجی افسر سے پوچھا: "کیا آپ نے ہمارے متعلق کچھ سوچا ہے؟"

گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ واپس گھومنے لگی [illegible] فوجی افسر [illegible] تم لوگوں کو [illegible] بھٹکتے رہو۔"

[illegible] کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ [illegible] اور [illegible] چلے گئے۔ کلیم الدین [illegible] کی طرف [illegible] آنے لگا۔ [illegible] آگے بڑھ کر پوچھا: "وہ کہاں گئے ہیں۔ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

[illegible] سے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے جھونپڑی کے برآمدے [illegible] منظر [illegible] میاں بھی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دلال نے یہی سوال کیا۔ کلیم الدین جھوتیاں نے [illegible] کہتے ہیں۔ قدرت کی [illegible] ہمیں ایک ملک سے [illegible] کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس موقع [illegible] جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔"

دلال نے [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اندھیرا ہو [illegible] بارش [illegible] ہوتے [illegible] ہم یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اس سے پہلے جنگلوں سے گزرنا مناسب نہیں ہے۔"

[illegible] میاں نے [illegible] "بارش میں ہم کیسے [illegible] اس وقت تو وہ کہیں پناہ لیتے ہیں؟"

[illegible] جنگل [illegible] اور سب [illegible] رہنے والے [illegible] کرتے ہیں۔ جب [illegible] بارش ہوتی ہے تو جنگل جانور اور [illegible] سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے رہتے ہیں [illegible] سے [illegible] جا سکتا ہے۔"

اس نے اونچی آواز میں اپنے ایک میزبان کو مخاطب کر کے [illegible] وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔"

کھانا ایک گھنٹے بعد تیار ہوا۔ وہ سب جھونپڑی کے اندر [illegible]

کھانے کے بعد بارش ہونے لگی جب [illegible] کی [illegible]

[illegible] سے کہا: "بڑے میاں! اسی لیے [illegible]

[illegible]

نے اپنے ایک میزبان سے کہا: "یا رام داؤ مجھے دے دو اور مجھ سے دو روپے لے لو۔"

اس نے انکار کیا۔ جھوتیاں نے [illegible] کی پھر سات روپے میں اس سے رام داؤ اس کے حوالے کر دیا۔ بابر نے بھی سات روپے دے کر ایک اور میزبان سے رام داؤ خرید لیا۔ تیسرا رام داؤ دلال کے پاس تھا [illegible] جھوتیاں نے اپنے چند کپڑے اور [illegible] میں رکھ لیا تھا۔ وہ بھی جھوتیاں نے [illegible] عورت کو دو روپے دے کر [illegible] لیے اوڑھ کر بارش سے کسی قدر محفوظ [illegible] نے اپنی لاٹھی سنبھالی اور فرسٹ ایڈ [illegible] اس کے کپڑے اور ضروری [illegible]

وہ لوگ جھونپڑی سے نکل کر [illegible] گہری تاریکی تھی [illegible] پڑتی تھی۔ کبھی بجلی چمک اٹھتی تھی [illegible] میرے پاس ہے مگر کوئی مجھے [illegible] گے۔ میں موقع دیکھ کر ٹارچ [illegible]

بڑے میاں نے پریشان ہو کر پوچھا: "مگر [illegible] اندھیرے میں راستہ کیسے معلوم ہو گا؟ راستے میں پانی ہو گا [illegible] دلدل ہو گی [illegible] گا؟"

[illegible]

ہمت اور اخلاق کو کھو لیا۔ [illegible] اس نے سہارا دینے کے لیے ان کا [illegible]

کلیم الدین جھوتیاں نے سوالیہ نظروں سے [illegible] کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے میاں کا ہاتھ جھوتیاں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ تب سمجھ میں آیا۔ اس نے کہا: "ماشاء اللہ! چچا میاں کو تو تیز بخار ہے۔ یہ کیسے سفر کریں گے؟"

[illegible]

شروع میں ہولے ہولے بڑے میاں عذاب جان [illegible] منصور نے آگے بڑھ کر ان کی کلائی تھام لی۔ نبض [illegible] آپ [illegible]

گئے اور آپ کی عمر بھی ایسی نہیں ہے کہ حوصلے سے کام لے سکیں۔ بہتر ہے آپ یہاں ٹھہر جائیں۔ میرا ایجنٹ انہیں سرحد پار پہنچانے کے بعد واپس آئے گا تو آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔"

بڑے میاں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں بیٹے نہیں۔ میں ساتھ جاؤں گا، مر جاؤں گا۔ میرا بیٹا، میری بہو، میرا پوتا مجھے سب یاد آتے ہیں۔ وہ میرے لیے پریشان ہوں گے۔ میں جب تک ان کے پاس نہیں جاؤں گا، میرے دکھ بیماریاں بڑھتی رہیں گی۔ میری دوا میرے بچے میرے پوتے پوتیاں ہیں۔"

دلال نے کہا: "نو بج رہے ہیں۔ جلدی فیصلہ کریں اگر یہاں دیر ہو گئی تو صبح سے پہلے جنگل کو پار نہیں کر سکیں گے۔ بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

منظور نے فرسٹ ایڈ بکس سے اسپرو کی دو گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ بڑے میاں کو کھلا دیں اور ان کے شانے تھپتھپا کر کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسے بیٹے بہو پوتے [illegible] ہیں جو برسوں پہلے آپ کو دوسرے رشتے داروں [illegible] چھوڑ کر مغربی پاکستان چلے گئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ ان کے پاس پہنچ جائیں۔ چلیے۔"

وہ ٹیلے کے بعد ٹیلے سے اتر کر آگے بڑھنے لگے۔ سب سے آگے دلال اور بابر تھے۔ ان کے پیچھے بھوتیاں [illegible] کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ بڑے میاں لبوریا اور ڈھولیا کی [illegible] کے سہارے [illegible] پیچھے چلے [illegible] سب سے پیچھے منصور تھا۔ [illegible] کے متعلق نہیں [illegible] آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا لاٹھی ٹیکتا ہوا چل رہا تھا۔ [illegible] سڑک پر اسکوڈ کے پاس آئے۔ [illegible] آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور [illegible] سے نظر آنے والا [illegible] ختم ہو گیا۔ وہ [illegible] سامنے کسی [illegible] تاریکی میں اور [illegible]

[illegible] تھے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے [illegible] کچھ ہے۔ انہیں [illegible] سمجھ رہا تھا کہ اسے کس طرف سے [illegible] ہے۔ اس کے پیچھے چلنے والے [illegible] بڑھتے تھے کبھی کبھی [illegible]

چمکتی تھی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ ورنہ پہلے سے زیادہ گہری تاریکی چھا جاتی تھی۔ اب وہ جہاں سے گزر رہے تھے، وہاں ان کا کوئی انسانی دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دشمنوں کو پیچھے چھوڑ کر آ گئے تھے۔ اب جنگلی درندوں اور سانپ بچھوؤں سے خوف آ رہا تھا۔ ویسے دلال نے تسلی دی تھی کہ جب تک بارش ہوتی رہے گی، حشرات الارض یا درندے ان کے راستے میں نہیں آئیں گے۔ سب اپنی پناہ گاہوں میں چھپے ہوں گے۔

کلیم الدین بھوتیاں نے آہستگی سے دلال کو مخاطب کیا۔ "صدرالدین، ذرا رک جاؤ۔ شاید بڑے میاں اور منظور بھائی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔"

پھر اس نے پلٹ کر آواز دی: "چچا میاں! آپ کہاں ہیں؟"

وہ یقیناً کراہتے ہوئے آ رہے ہوں گے لیکن بارش کی آواز اتنی تیز تھی کہ ان کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا۔ "ٹارچ روشن کر کے دیکھو۔ یہ لوگ کہاں رہ گئے ہیں؟"

صدرالدین نے کہا: "بڑی مصیبت ہے۔ میں موقع بے موقع ٹارچ روشن نہیں کر سکتا۔ ذرا ٹھہرو۔ مجھے سوچنے دو۔"

وہ سوچنے لگا۔ منظور بھوتیاں کا بازو تھامے آنکھیں

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں کچھ [illegible] کام [illegible] قسمت [illegible] ہے۔

پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے [illegible] بڑے میاں اور منظور کسی طرح بھی اس تاریکی میں نظر نہیں آ سکتے تھے۔ پھر دلال صدرالدین نے اپنی ٹارچ کے شیشے پر چند انگلیاں رکھ کر اسے روشن کیا تاکہ کم سے کم روشنی ہو اور آنے والے نظر آ جائیں۔

بڑے میاں نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیک کر آ رہے تھے مگر منظور نظر نہیں آیا۔ بھوتیاں نے کہا "صدرالدین! ٹارچ مجھے دو۔ میں پیچھے جا کر دیکھتا ہوں۔"

اس نے ٹارچ لے لی۔ عظمیٰ کو وہیں چھوڑ کر اسی طرح شیشے پر انگلیاں رکھ کر ٹارچ کو روشن کرتے ہوئے جانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس تاریکی میں منظور بہت زیادہ پیچھے رہ جانے سے راستے سے بھٹک گیا ہوگا لیکن تھوڑی دور جا کر ہی وہ نظر آ گیا۔ وہ صحیح راستے پر چلا آ رہا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز دیکھ کر اس پر ترس آتا تھا۔ بڑی آہستگی سے پاؤں رکھ کر اپنے جسم کو آگے کی طرف لے جا کر لاٹھی ٹیک کر پھر دوسرا پاؤں اتنی ہی آہستگی سے زمین پر رکھتا تھا اور اس طرح قدم قدم کچھوے کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا۔

بابر نے کہا: "مسٹر کلیم الدین بھوتیاں! یہ انسانی ہمدردی بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ جو ساتھ چل رہے ہیں، انھیں چلنے دو۔ جو پیچھے رہ جاتے ہیں، انھیں چھوڑتے چلو۔"

بھوتیاں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں تیزی سے چلتا ہوا منظور کی طرف جانے لگا۔ بابر نے بڑے میاں سے کہا: "مسٹر احسان الحق! آپ بھی ہم پر بڑا احسان کر رہے ہیں۔ اسے ابھی یاد آیا۔ ابھی دن کے وقت آپ نے کہا تھا کہ آپ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ بیٹے ہیں، بہو ہے، پوتے ہیں، پوتیاں ہیں۔ اس بڑھاپے میں جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

بڑے میاں نے ہانپتے ہوئے کہا: "دیکھو مجھے پریشان نہ کرو۔ میں آہستہ آہستہ چل رہا ہوں۔ تم لوگ میرے پیچھے آ رہے ہو تو مجھے آنے دو۔"

"آپ ایک بات بتائیں۔ اگر آپ کے بیٹے اور پوتے [illegible] جاتے؟"

بڑے میاں ہانپتے ہوئے تاریکی میں [illegible]

ہوئے کہا: "میرا یہ سوال احمقانہ ہے؟ اگر انھیں لے جانا ہی ہوتا تو ہمارے لیے مصیبت بنا کر کیوں چھوڑ جاتے؟"

عظمیٰ نے سخت لہجے میں کہا: "تم کیسے آدمی ہو؟ بزرگوں کو حوصلہ دینا چاہیے۔ ان کی مدد کرنا چاہیے لیکن تم اپنی طنزیہ باتوں سے انھیں ہلکان کر رہے ہو۔ تم سے اچھی تو موت ہے جو یکبارگی آتی ہے۔ تمھاری طنزیہ باتوں کی طرح نہ آدھا مارتی ہے نہ آدھا زندہ رکھتی ہے۔"

بابر نے کہا: "پتا نہیں کیا بات ہے؟ بولتی جاتی ہو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے [illegible] کے جسم میں اسٹارٹ ہو گیا ہو۔ سارا رومانس غارت ہو جاتا ہے۔ میں تمھاری طرف دیکھا کروں تو تم چپ رہا کرو۔ صرف مسکراتی رہا کرو۔"

عظمیٰ سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر اس کی باتوں کو برداشت کر رہی تھی۔ پہلے تو جی چاہتا تھا کہ بھوتیاں سے شکایت کرے پھر عقل آئی کہ دونوں مردوں میں تو تو میں میں ہوگی [illegible] یا دونوں میں ٹھن جائے گی۔ [illegible] کی طرف چلتے ہوئے صرف پاؤں میں کانٹے نہیں چبھتے، دل اور دماغ میں بھی چبھتے ہیں۔ انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بھوتیاں منظور کو سہارا دے کر لے آیا۔ صدرالدین نے کہا۔ "ایسے ہم سفر جاری نہیں رکھ سکیں گے۔"

بھوتیاں نے کہا: "کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم منظور بھائی کے لیے اتنی دیر ٹھہر گئے۔ اگر اپنی رفتار ذرا سست کریں تو یہ منظور بھائی ہمارے ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔"

بابر نے جھلا کر کہا: "رفتار سست نہیں ہوگی۔ میں صدرالدین کو لے کر آگے بڑھتا جاؤں گا۔ جسے ہمارے ساتھ آنا ہو، آ جائے۔"

"صدرالدین کو صرف تم نے رقم نہیں دی ہے۔ ہم سب نے دی ہے۔ لہٰذا وہ سب کے ساتھ چلے گا۔ تم اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا خیال چھوڑ دو۔"

بابر نے بھوتیاں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے پوچھا [illegible]

[illegible]

"دوسری بار یہ دوستوں کی طرح ہاتھ لگانا [illegible]

[illegible]

چاہتے تھے [illegible] حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے

کا ایک [illegible] دو [illegible] کے پھیل [illegible] روشنی میں [illegible] بارش میں خون کے چھینٹے اڑتے [illegible]

[illegible] منظور لاٹھی ٹیکتا ہوا گرتا پڑتا ان کی طرف آیا۔ بڑے میاں بھی ان کے ساتھ ہی [illegible] دونوں ہاتھ ہلا کر کہنے لگے "رک جاؤ [illegible] یہ کوئی ملک نہیں ہے۔ یہاں کوئی سیاست نہیں [illegible] یہ خونریزی ہم کیوں نہیں [illegible] مان لو کہ صرف ایک انسان دوسرے انسان سے لڑتا ہے جیسے ایک جانور دوسرے جانور سے لڑتا ہے ورنہ [illegible] سے نہیں لڑتا۔ لڑائی انسان [illegible] اپنی لڑائی کو جائز ثابت کرنے [illegible] سیاسی پالیسیوں کا سہارا لیتا [illegible] دیر کے لیے اپنے انسان ہونے پر شرمندہ [illegible] ہو گے"

* * *

[illegible] مسافر ان کی طرف متوجہ ہو گئے [illegible] انسپکٹر کو اور کبھی خسرو کو دیکھ رہے تھے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] مسافر کو گھورتے ہوئے [illegible] نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ [illegible] وہ تو ہم نے [illegible] پاکستانی ہیں [illegible] آئے ہیں [illegible]

[illegible] پیش ہوتی [illegible] ہوئے اس سے کہا "ہم یہ [illegible] یاد ہے۔ ہم تو یہ جانتے [illegible] تمہارے ملک کے بیچ پاسپورٹ اور ویزا کی [illegible] کون راستے سے آئے ہو؟"

[illegible] نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا [illegible] ہو سکتا [illegible]

[illegible] تائید میں سر ہلا کر کہا "ہو سکتا ہے [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] کے ساتھ [illegible] بھی ہے۔ ہم دونوں کا [illegible]

جائی کے لاک اپ میں ڈال دے گا۔"

نین تارا نے پریشان ہو کر خسرو کو دیکھا۔ وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ تسلی ہی دے سکتا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا "پریشان ہوتے رہنے سے دماغ پر بوجھ پڑتا ہے۔ یہ کیا ہے آپ کو تسلی دو کہ ہم انتہا پسند ہندوؤں کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ہمیں کبھی زندہ نہ چھوڑتے۔ اچھا ہوا قانون کی گرفت میں آئے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ ہمیں جیل میں ڈال دیں گے کسی بھی ملک کا قانون غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کو موت کی سزا نہیں دے سکتا۔ ہمیں [illegible] پریشانی ہوئی لیکن نہ تو ہماری عزت پر آنچ آئے گی۔ نہ ہی جانی نقصان ہوگا۔"

وہ چار بجے اسٹیشن پہنچ گئے۔ مسافر بس سے [illegible] انسپکٹر نے چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم دونوں میرے پیچھے آؤ۔"

وہ اچھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نین تارا اس کے پیچھے چلنے لگی۔ ابھی چار بجے تھے۔ رات کا اندھیرا باقی تھا۔ ایسے وقت سارا عالم سوتا ہے لیکن بس اسٹاپ پر بڑی رونق تھی۔ مسافر مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اپنی اپنی منزلوں کی طرف جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایک ہوٹل کا مالک [illegible] دیکھتے ہی دھوتی سنبھالتا ہوا باہر آیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "حضور [illegible] صاحب۔ گرم گرم چائے حلوا پوری ہے۔"

داروغہ نے کہا "تم تو جانتے ہو میں اپنی جیب سے ہوٹل میں [illegible] کھاتا [illegible] کراتا ہوں تو کہتا ہوں مگر [illegible] ساتھ [illegible] سہارا دو [illegible] پاکستانی مہاراج ہوٹل میں بیٹھ کر نہیں کھاتا ہے۔ اس لیے [illegible]"

وہ آگے بڑھ گیا۔ خسرو اور نین تارا اس کے ساتھ چلنے لگے۔ [illegible] انسپکٹر نے اس کی [illegible] اپنی چھڑی سے [illegible] کرتے ہوئے بولا "اس میں کیا ہے؟"

"ہماری ضرورت کے پیسے اور کچھ ضروری کاغذات ہیں۔"

[illegible]

نین تارا نے چلتے چلتے چپکے سے خسرو کے ہاتھ دبا دیا۔ اس نے کہا "ایک ہزار روپے ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ کچھ اور بڑھاؤ۔"

[illegible] جتاتے ہوئے کہا [illegible] ہزار [illegible] میں اور یہ پانچ سو [illegible] کے پاس ہیں۔"

"[illegible] سچے۔"

خسرو [illegible] نکالا [illegible]

[illegible] کرمنز کے پیچھے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "اپنی [illegible] کے [illegible] رکھ دو اور سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

[illegible] نے حکم کی تعمیل کی۔ اپنی کو اس کے سامنے میز پر [illegible] کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا: "جب سکندر نے [illegible] تھا تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو [illegible] مجھے معلوم ہے تمہارا کیا جواب ہے۔"

خسرو نے شوخی سے ہوتے لہجے میں کہا: "وہی سلوک جو [illegible] کسی کمزور کے ساتھ کرتا ہے۔"

اس نے [illegible] سپاہی کو آواز [illegible] [illegible] [illegible]

خسرو نے یہ سنتے ہی [illegible] طرف [illegible] [illegible] [illegible] جب یہ کھل ہی چکی ہے [illegible]

وہ اور [illegible] پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

[illegible] [illegible] سکتے ہیں۔

اس نے سر ہلا کر کہا: "ہوں۔ دیکھا جائے گا۔ ابھی [illegible] پہلے کھانا پینے دو۔"

[illegible]

سپاہی نے جواب دیا: "چار روپے پچاس پیسے۔"

"یہاں کتنے سپاہی ہیں؟"

"چار ہیں۔"

"اچھا پانچ روپے پچاس پیسے رکھ لو اور دس روپے [illegible] بہت تھک جاتا ہے۔ ان پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔"

[illegible]

خسرو نے اپنی درد بھری داستان شروع کی تاکہ اسے کچھ ترس آئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "مجھ سے کسی کا دکھ سنا نہیں جاتا۔ کھاتے کھاتے رونے لگتا ہوں۔ مجھے کھا لینے دو۔"

وہ دونوں خاموش بیٹھے اس کے کھانے کا منظر دیکھنے لگے۔ جتنی پوریاں تھیں، وہ صاف کر گیا۔ ڈکار لینے کے بعد بولا: "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ [illegible] کے بعد چائے ضروری ہوتی ہے۔"

اس نے پھر سپاہی کو آواز دی۔ خسرو نے جیب سے [illegible] روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف [illegible] [illegible] گرما گرم چائے [illegible]

سپاہی کے جانے کے بعد اس نے پوچھا: "کیا تمہارے ماں باپ بھارت سے پاکستان گئے تھے؟"

"ہاں، جب پاکستان بنا تو ہمارے خاندان کے کتنے ہی افراد بھاگل پور سے پاکستان سید پور چلے گئے۔"

[illegible] بھاگ کر آنے کے لیے گئے تھے؟"

خسرو نے جواب دیا: "آدمی کا گھر، زمین اور جائداد سب چھن جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"تمہارے مسلم لیڈروں نے ہندوستان تقسیم کرنے کے [illegible] ان کا خمیازہ تم لوگ بھگت رہے ہو۔"

[illegible] نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو [illegible] کی طرف ہجرت نہ کرتے۔"

[illegible]

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"ہم یہاں سے نیپال تک کے حالات جانتے ہیں۔ گزشتہ [illegible] ہزاروں بہاری کسمپرسی کی زندگی [illegible] بنگلہ حکومت کا قانون ہے [illegible] بہاریوں کے [illegible]

مغربی پاکستان میں ہیں، انھیں وہاں بلایا جائے گا باقی بہاریوں کو ان کے پاکستان میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"یہی کہ مغربی پاکستان والوں کے رشتے داروں کو یہاں سے بلایا جا رہا ہے اور جو لاکھوں بہاری مشرقی پاکستان گئے تھے، ان کا تو شاید ہی کوئی رشتے دار مغربی پاکستان میں ہوگا یعنی ان بہاریوں کا وہاں جانے کے لیے پاکستانی ہونا ضروری نہیں ہے، کسی مغربی پاکستانی کا رشتے دار ہونا ضروری ہے۔"

اس کے لیے چائے آگئی۔ وہ پینے لگا۔ خسرو پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ اگر نیپال پہنچنے کے بعد ایسی رکاوٹیں پیدا ہوں گی تو بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ اس نے نین تارا کی طرف دیکھا۔ بس ایک ہی آسرا تھا۔ نین تارا کے بھائی وہاں موجود تھے اگر وہ تحریری بیان دیتے تو انھیں مغربی پاکستان جانے کے لیے کلیرنس مل سکتا تھا۔

اس نے چائے پینے کے بعد کہا: "اگر میں تم دونوں کے خلاف رپورٹ لکھوں تو اس رپورٹ کے مطابق تم لوگ غیر ملکی جاسوس کہلاؤ گے اور تمھیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ پتا نہیں کتنے برس تک وہاں سڑتے رہو گے اور یہ تمھاری اٹیچی میں جو کچھ ہے وہ سب ہمارا ہوگا۔ اب تم بتاؤ نیپال جانے کے لیے ہمیں کیا دے سکتے ہو؟ اگر یہ چاہتے ہو کہ اٹیچی کی تلاشی نہ لی جائے تو اس کی فیس الگ ہوگی۔"

"داروغہ صاحب! ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم نے بتا دیا آپ ہمارے ڈیڑھ ہزار روپے میں سے جو لینا چاہیں لے لیں مگر ہمیں چھوڑ دیں۔ ہم بہت پریشان ہیں۔"

"میں آدمی ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ تم لوگوں کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں، اسی لیے تو حوالات میں نہیں بھیجا ہے۔ اپنے سامنے کرسیوں پر بٹھا رکھا ہے۔ ایسا کرو پہلے سو کا ایک پتا نکالو۔"

خسرو نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا "اب [illegible] کی تلاشی نہیں لوں گا [illegible] نیپال جانے کے لیے [illegible]"

[illegible]

[illegible] اور دو سو [illegible] کر دے [illegible]

سو روپے لینے کے بعد اس نے سپاہی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "ارے جا کے دیکھ ریل کتنے بجے آتی ہے۔ یہ بے چارے سیدھے لوگ ہیں۔ انھیں بھیک بھاک اڈے تک پہنچا دینا۔"

پھر اس نے خسرو سے پوچھا: "کیا پہلے تم کبھی ادھر آئے ہو؟"

"ہم پہلی بار ہندوستان آئے ہیں۔"

"دیکھو، یہاں سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر بھید پور تھنہ چلے جانا۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا: "کیا آپ ہمیں کسی اور تھانے بھیج رہے ہیں؟"

"ارے نہیں۔ بھید پور تھنہ ایک ریلوے اسٹیشن کا نام ہے۔ وہ جنکشن بھی ہے۔ وہاں سے دوسری گاڑی پکڑ کے منیاری گھاٹ چلے جاؤ۔ گھاٹ کے اوپر ایک ٹرین ملے گی۔ اس ٹرین میں بیٹھ کے بھاگل پور پہنچ جاؤ گے۔ وہاں تاتارپور پولیس اسٹیشن میں شیر علی داروغہ ہے۔ اس نے تم جیسے بہاریوں کے لیے ایک ریلیف کیمپ قائم کی ہے۔ وہاں سے تم لوگوں کو نیپال پہنچا دیا جاتا ہے۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا: "کیا بھارتی حکومت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ غیر قانونی طور پر آئے ہوئے مہاجرین کو یہاں برداشت کیا جائے اور ریلیف کیمپ قائم کی جائے؟"

"ہماری سرکار تم لوگوں کو برداشت کرنا ہی نہیں چاہتی اسی لیے تو تم لوگ ادھر آتے ہو ادھر تمھیں نیپال پہنچا دیا جاتا ہے۔ اپنے ہاں رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ رہ گئی ریلیف کیمپ کی بات تو یہ تمھارے مسلمان بھائی بھاگل پور میں [illegible] کر رہے ہیں۔ یہ سرکار کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے۔"

"ابھی آپ کہہ رہے تھے، ہم مہاجروں کو جاسوس سمجھ کر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔"

"یہ تو ہماری رپورٹ پر ہے اگر میں یہ لکھ دوں کہ تم دونوں میاں بیوی کو رام گڑھ کی فوجی چھاؤنی کے آس پاس منڈلاتے ہوئے [illegible] کیا ہے تو زندگی بھر ہماری جیل سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ [illegible] خوشی سے تم لوگوں پر مہربانی کر رہا ہوں۔ تم [illegible] وہاں بھی نہیں ٹھہرو گے۔

ایک بات یاد رکھنا۔ شیر علی داروغہ میرا یار ہے۔ اسے مت بتانا کہ میں نے تم سے کوئی رقم لی ہے۔"

"میں نہیں بتاؤں گا۔"

"[illegible] پوچھے تو کہنا میں نے تم لوگوں کی جس طرح

[illegible] تھی۔ [illegible] وابستہ [illegible] تھی۔

اچھی بات [illegible] نہیں گے۔

[illegible] ہو گئے تو بات نہیں چھپ [illegible]

[illegible] ہیں تو [illegible]

[illegible] سے [illegible] کو یہاں سے جانے [illegible]

دوں گا، جیل میں سڑا دوں گا!

[illegible] کے [illegible] سے کچھ [illegible] چھوڑ دیا۔ وہ [illegible] سے [illegible] میں بیٹھ کر [illegible] پہنچے۔ وہاں سے [illegible] سفر سے [illegible] سے آ رہا ہے [illegible] سے [illegible] طرح کے سوالات [illegible] جواب [illegible] حالات [illegible] کی طرف [illegible]

[illegible] کام [illegible] کسی [illegible] کے [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] کے [illegible] نے [illegible] اپنے دفتر کی طرف [illegible] دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] ایک [illegible] سے بنگلہ دیش سے [illegible] یہاں پہنچ جاتے ہیں [illegible] جواب لینے دینے [illegible] کیا ہوں [illegible] آنے والوں کا مجھ سے [illegible] ہے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔

[illegible] آپ [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو۔ یہ ریلیف کمیٹی کوئی قانونی نہیں ہے۔ یہاں کے ہندو عوام سے ان معاملات کو راز میں رکھا جاتا ہے۔ جو لوگ آتے ہیں انہیں دوسرے مسلمان گھروں میں یہ کہہ کر بھیج دیا جاتا ہے کہ ان کے رشتے دار ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں لیکن سی آئی ڈی اور پولیس والے سب جانتے ہیں۔ اس لیے وہ تحقیقات نہیں کرتے مجھے سمجھا دیتے ہیں کہ جلد سے جلد یہاں آنے والوں کو نیپال کی طرف روانہ کر دوں۔"

"جب قانون کے تمام متعلقہ افسران یہ حقیقت جانتے ہیں تو پھر آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟"

"پریشانی یہ ہوتی ہے کہ مجھے ان کی زبان سے قصے سننے پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں [illegible] ہیں پہلے ان کے مکانات یہاں تھے۔ یہاں [illegible] تھیں۔ کھیت تھے کاروبار تھا۔ مگر [illegible] نہیں تھیں [illegible] صرف ان کی نہیں ہے۔ میں ہر وقت اس [illegible] میں [illegible] کہیں ہندو مسلم فساد [illegible] کریں گے کہ جو مسلمان ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیل کر پاکستان گئے تھے آج وہی پاکستان سے واپس آ کر پھر وہی خون کی ہولی کھیل رہے ہیں [illegible] میں [illegible] پاکستانی جاسوس ہوں گے۔ جب [illegible] پاکستان کی طرف سے [illegible] بھی کہا جا سکتا ہے۔ جب یہاں کے ہندو عوام کو [illegible] کے متعلق پتہ چلتا ہے تو وہ [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] لاکھوں کی تعداد میں بنگالی وہاں سے فرار ہو کر [illegible] آئے اور یہاں [illegible] پر [illegible] ان کے جانے کے بعد بہاری آ رہے ہیں۔"

خسرو نے کہا "۱۹۷۱ء میں جب لاکھوں بنگالی [illegible] کر کے یہاں آئے تو بھارتی حکومت نے ان کے [illegible] تھے [illegible] سخت خلاف [illegible] ہمیں شانتی [illegible] مسلم [illegible] کچھ [illegible] کی جاری [illegible] نیپال تک پہنچنے کا راستہ صاف کر دیا ہے۔ یہ [illegible] نہیں ہے۔ ہم [illegible] جا سکتے ہیں آپ صرف [illegible] کریں۔"

[illegible] سے [illegible] ہوئے [illegible] سے [illegible] ہو کر [illegible] کے قریب [illegible]

[illegible]

بھی ہے۔ باہر سے آنے والوں کے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات چیک کیے جاتے ہیں۔ خسرو اور زمین تارا غیر قانونی طور پر آئے تھے۔ اس نے رکشا والے سے پوچھا: ”کیا وہ ہمیں یہاں سے گزرنے دیں گے؟“

رکشا والے نے کہا: ”صاحب! پانچ روپے دے دیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے پانچ روپے دے دیے۔ رکشا والے نے کہا۔ ”آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر جھکائے رہیے۔“

انھوں نے رکشا والے کی ہدایت پر عمل کیا لیکن کن انکھیوں سے آس پاس دیکھتے رہے۔ ایک جگہ بڑے سے بورڈ پر لکھا ہوا تھا: ”پورٹ آف انٹری امیگریشن آفس“ لیکن کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ رکشا میں اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر ایک لڑکی لیے کہاں جا رہے ہو؟

آفس کے باہر غیر ملکی سیاح نظر آ رہے تھے۔ ان میں ہپیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب نیپال میں داخل ہونے کے سلسلے میں ضروری کارروائیوں سے گزر رہے تھے۔ ان کے رکشے کی طرف کسی نے نہیں دیکھا۔ دیکھا بھی ہو تو رکنے کے لیے نہیں کہا۔ جب وہ لوگ دفتر سے بہت دور نکل گئے تو خسرو نے حیران ہو کر پوچھا: ”کیا بات ہے ہمیں کیوں نہیں روکا گیا؟“

وہ رکشا چلاتے ہوئے ہانپتے ہوئے بولا: ”آپ لوگوں کا حلیہ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بنگلہ دیش سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔ نیپال کے راجہ نے آپ لوگوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔“

اس نے بس اسٹینڈ تک انھیں پہنچا دیا۔ وہاں سے بس کھٹمنڈو جاتی تھی۔ کرنسی تبدیل کرنے والے کتنے ہی لوگ گھومتے پھرتے سودے کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے خسرو کے پاس آ کر کہا: ”جو کچھ تبدیل کرنا ہو یہاں کر لیں۔“

اس نے پوچھا: ”کیا کسی بینک کے ذریعے کرنسی تبدیل نہیں ہو سکتی؟“

اس نے خسرو کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر زمین تارا کو [illegible] تم لوگوں کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ ہم یہاں آنے جانے والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ تم لوگوں [illegible] آئے ہو یہ بتانا کیا ضروری ہے۔ بس اتنا کہوں گا۔ کھٹمنڈو میں [illegible] میں کرنسی تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے [illegible] ایپلیکیشن فارم پُر کرنا پڑتا ہے اور پاسپورٹ وغیرہ دکھانا پڑتا ہے اور تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔“

خسرو نے اسی ایجنٹ سے معاملات طے کر لیے۔ انڈیا کے سو روپے دینے سے قانوناً نیپال کے ایک سو ستائیس روپے ملتے تھے لیکن ایجنٹ نے سو پر صرف دس روپے زیادہ دیے۔ خسرو کے پاس جتنی رقم تھی، اس نے تبدیل کرا لی۔ صبح آٹھ بجے وہ بس میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بس پہاڑ کی بلندیوں پر جانے لگی۔ کھٹمنڈو سطح سمندر سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور بیرگنج سے دو سو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جب انھوں نے سفر کا آغاز کیا تو موسم معتدل تھا۔ نہ زیادہ سردی تھی نہ گرمی۔ جیسے جیسے وہ بلندی پر پہنچنے لگے سردی بڑھنے لگی۔ یوں دیکھا جائے تو سید پور سے یہاں تک انھیں کسی خاص مصیبت سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔ رام اوتار حفاظت ہندوستان تک لے آیا تھا۔ کشن گنج میں داروغہ دین دیال ان کے لیے ذرا پریشانی کا سبب بنا لیکن اس نے بھی شیر علی داروغہ تک ان کی رہنمائی کر دی۔ نیپال کے چیک پوسٹ سے بھی وہ کسی روک ٹوک کے بغیر گزر گئے۔ اب اسے فکر تھی کہ کھٹمنڈو میں زمین تارا کے ساتھ کہاں قیام کرے گا؟ کوئی مناسب جگہ مل سکے گی یا نہیں؟

وہاں ہزاروں کی تعداد میں بہاری اپنی بیوی بچوں کے ساتھ موجود تھے۔ چند بہاریوں نے رہائشی مسئلہ حل کرنے کے لیے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مقامی باشندوں سے بڑے بڑے ہال نما کمرے کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔ اب ان کمروں میں ایسے بہاری مہاجروں کے رہنے کی جگہ بن جاتی تھی جن کے ساتھ بیوی بچے نہیں ہوتے تھے۔ ایک ایک ہال میں دو سو ڈھائی سو افراد رات کو سوتے تھے اور ایک رات کا کرایہ ایک روپیہ ادا کرتے تھے۔ دن کو رہنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے شہر میں مارے مارے پھرتے تھے۔ جو اچھی خاصی رقمیں لے کر آئے تھے وہ ہوٹلوں اور پارکوں میں وقت گزارتے تھے۔ کھٹمنڈو ایک نہایت ہی صاف ستھرا شہر ہے۔ وہاں کے قانون کے مطابق وقت بے وقت پارکوں اور چوراہوں پر بیٹھنا یا کھڑے رہنا ممنوع ہے۔ بہاریوں کو کئی بار وارننگ دی جا چکی تھی کہ وہ اس طرح راستے کے کنارے اور چوراہوں پر جمع نہ رہا کریں۔ بہت سے مسلمان وہاں کے ہوٹلوں میں کھانے سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ کئی ہوٹلوں میں سور کا گوشت پکتا تھا اور شراب ہر جگہ عام تھی۔ نیپالی مرد عورتیں چرس کا دم لگاتے تھے۔ پولیس جب پکڑنے آتی تو وہ بھاگ کر چھوٹی گلیوں یا [illegible] میں چھپ جاتے تھے۔

خسرو اور زمین تارا نے بس سے اتر کر دیکھا، انھیں لگتے

ہی ہماری نظر آئے۔ وہ بس سے اترنے والے مسافروں سے کہہ رہے تھے: "ہمارے ساتھ آئیے۔ ہم آپ کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیں گے" جو کچھ بتا رہے تھے ان کے لیے باغ بازار کے علاقے میں رات کو ایک بستر سونے کے لیے مل سکتا ہے۔ ایک بستر کا ایک روپیہ اور جو بیوی بچے والے ہیں، انھیں پانی پور کی کے علاقے میں رہنا چاہیے۔ وہاں پاکستانی سفارت خانہ سے آنے جانے میں آسانی ہوگی۔"

خسرو اور زمین تارا کو کتنے ہی لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ ان کے درمیان ایک عورت آگئی۔ اس نے زمین تارا کا ہاتھ تھام کر کہا: "تم میرے ساتھ چلو۔ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پانی پور کی میں رہتی ہوں۔ وہاں ہم نے ایک کمرہ کرائے پر لیا ہے لیکن اب ہمارے پیسے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اس کمرے کا پورا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ بہن! ہم بڑی مصیبت میں ہیں۔ اگر تم اس کمرے میں حصے دار بن کر ہو آدھا کرایہ تم دے دیا کرو تو ہم پر بڑا احسان ہوگا۔ مصیبت کے یہ دن کسی طرح کٹ جائیں گے۔"

اس عورت نے کچھ اس انداز میں اپنی مصیبتیں بیان کیں کہ خسرو اور زمین تارا اس کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے۔ راستے میں اس عورت نے بتایا: "کمرے کا کرایہ روزانہ پانچ روپے لیے جاتے ہیں۔ [illegible] کا خرچ الگ ہے۔"

خسرو نے کہا: "اگر دو چار دن کی بات ہوتی تو ہم کسی ہوٹل میں رہ جاتے۔ پتا نہیں ہمیں سفارت خانے [illegible] کب پاکستان پہنچایا جائے گا۔"

اس عورت نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "[illegible] انتظار میں ایک مہینے سے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ [illegible] جو رقم تھی وہ ختم ہو گئی۔ باغ بازار کے ایک کمرے میں [illegible] رہتے ہیں [illegible] پانی [illegible] کسی طرح [illegible] کر رہے ہیں۔"

[illegible] پہنچ گئے۔ [illegible] اس نے ایک کمرہ انھیں کرائے پر دے دیا تھا [illegible] زمین تارا نے پوچھا: "آپ لوگوں کو پاکستان جانے میں کیا [illegible]"

[illegible] ایک [illegible] ہو [illegible]

طرح طرح کے سوالات کیے جاتے ہیں؟ پہلے پوچھا جاتا ہے: "ہم پاکستانی ہیں بھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے ہم ہندوستان کے کسی شہر سے بھاگ کر آئے ہوں یا برما سے چلے آئے ہوں۔"

ان دنوں شناختی کارڈ کا رواج نہیں تھا۔ سرکاری ملازمین اپنے کاغذات کے ذریعے پاکستانی ہونے کا ثبوت دے سکتے تھے۔ کاروباری حضرات مغربی پاکستان میں اپنے دوستوں رشتے داروں کو خط لکھتے تھے۔ وہاں سے ان کی تصدیق ہوتی رہتی تھی لیکن ہزاروں افراد ایسے تھے جن کے پاس کوئی شناختی کارڈ یا کوئی سرکاری کاغذ نہیں تھا۔ ان کے رشتے دار بھی مغربی پاکستان میں نہیں تھے ایسے میں وہ کیا ثبوت پیش کر سکتے تھے؟

اس عورت نے کہا: "اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اردو بولتے ہیں اور پاکستان سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی اور ہماری زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی اردو زبان میں ہندی شامل ہوتی ہے۔ ہماری زبان ان سے مختلف ہے پھر ہمارا رہن سہن، ہمارا لباس، ہماری تہذیب، ہمارا لب و لہجہ سب یہ گواہی دیتا ہے کہ ہم مشرقی پاکستانی ہیں اور اب بنگلہ دیش بننے کے بعد یہاں آئے ہیں لیکن ایسے ثبوت سفارت خانے میں تسلیم نہیں کیے جا رہے ہیں۔"

باہر شام کی زردی مائل روشنی تھی۔ کمرے میں [illegible] پھیلی ہوئی تھی۔ وہ عورت سر جھکائے اداس بیٹھی ہوئی تھی [illegible] مسلمانوں کے قول و فعل میں تضاد کیوں ہے؟ پاکستان [illegible] پاکستانی مسلمانوں [illegible]

[illegible]

[illegible] تم کیا ہو گئے؟

◆

[illegible] ان کے راستے واضح تھا [illegible] اور بڑے میاں ان کے درمیان [illegible] رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ آسمان کی سیاہی بتا رہی تھی کہ بہت دیر تک بارش ہوتی رہے گی۔

صدرالدین نے آگے بڑھ کر کہا: "اگر تم لوگ آپس میں اس طرح لڑتے رہو گے تو اسی جنگل میں مارے جاؤ گے۔"

بابر نے غصے سے پوچھا: "صدرالدین! تم کس کے ساتھ چلو گے؟"

"میں سب کے ساتھ چلوں گا اور تم بھی سب کے ساتھ ہی چلو گے۔ آؤ۔"

بابر مجبور تھا۔ جنگل کا راستہ نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو تنہا آگے نکل جاتا۔ مجبور ہو کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اب ان کی رفتار پہلے سے سست تھی۔ منظور اور بڑے میاں کی وجہ سے وہ لوگ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

منظور نے کہا: "صدرالدین! اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ کس طرح اندھیرے میں راستہ پہچان کر چل رہے ہو۔ تو میں بڑے میاں کو اپنے ساتھ لے کر آہستہ آہستہ چلا آؤں گا۔ تم باقی لوگوں کو لے کر آگے نکل جاؤ۔"

اس نے کہا: "جہاں تک بانسوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں مجھے راستہ معلوم ہوتا ہے گا۔ میں رات دن یہاں سے گزرتا ہوں ان راستوں کو بھول نہیں سکتا۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ آگے کن راستوں سے گزرنا ہے۔ تم تنہا یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔ جنگل میں بھٹک جاؤ گے۔"

وہ سب کتنی دور چلے آئے ہیں؟ ان میں سے کسی نے صدرالدین سے نہیں پوچھا۔ فاصلوں کا حساب کیا ہے، دور منزل دور بہت دور تک بھی نظر نہ آئے تو مایوسی ہوتی ہے۔ وہ گرتے پڑتے اور بھیگتے جا رہے تھے۔ راستہ ناہموار تھا۔ کہیں گڑھے تھے اور کہیں کٹے ہوئے بانسوں کی جڑیں تھیں۔ جن سے ٹھوکریں لگتی تھیں۔ کلیم الدین بھوئیاں نے عظمیٰ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بری طرح بھیگ رہی ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنا کوٹ اتار کر اس کے سر پر ڈال دیا۔ عظمیٰ نے اسے بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ اندھیرے میں وہ ایک سیاہ دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بولی: "تم مجھے بارش سے بچانے کے لیے خود بھیگ رہے ہو۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے کہا: "شاید تم کہہ رہی ہو کہ میں بھیگ جاؤں گا۔"

عظمیٰ نے کہا: "ہاں۔"

"شاید تم درست کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری خاطر بھیگ سکتا ہوں میں چاہتا ہوں، تمہاری زندگی کی تمام برساتیں میرے نام ہو جائیں۔"

آگے آگے چلنے والے بابر نے کہا: "میاں جان پھر بھی

متحرک تصویر

ایک شخص: نرس! کیا میری بیوی کے جڑوے کا ایکسرے لیا گیا ہے؟

نرس: کوشش تو بہت کی گئی لیکن صرف "متحرک تصویر" ہی ملی۔

مرسلہ: جمیل احمد اللہ گلہ (پنڈی)

ہے اور لیلیٰ مجنوں رومانس فرماتے چلے آ رہے ہیں۔"

کلیم الدین بھوئیاں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ عظمیٰ کا ساتھ یوں لگ رہا تھا جیسے جنگل کے تاریک راستوں پر کہکشاں بچھی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے بڑے میاں ہانپتے کانپتے آ رہے تھے۔ پہلے وہ کبھی کبھی کراہتے تھے لیکن اب ان کے منہ سے عجیب بے ہنگم سی آواز نکلتی جا رہی تھی۔ کلیم الدین بھوئیاں نے پلٹ کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا۔ تب پتا چلا بخار تیز ہے۔ دو اسپرو کی گولیاں بھلا کیا اثر کر سکتی تھیں جبکہ وہ مسلسل بارش میں بھیگتے آ رہے تھے۔

اس نے آہستگی سے کہا: "چچا میاں! آپ کیسے سفر کر سکیں گے۔ اگر میں ان لوگوں کو بتا دوں کہ آپ کا بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔ آپ چلنے کے قابل نہیں ہیں تو بابر غصے میں واہی تباہی بکنے لگے گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولے: "بیٹا! مجھے ذرا سہارا دو شاید تھوڑی دیر میں بارش ختم ہو جائے۔ شاید تھوڑی دور جا کر یہ جنگل بھی ختم ہو جائے۔ اگر راستے میں کوئی جھونپڑی مل جائے ایک ذرا کمر سیدھی کرنے کا موقع مل جائے تو میری طبیعت سنبھل جائے گی۔"

عظمیٰ نے ان کے دوسرے بازو کو تھام لیا۔ وہ دونوں سہارا دے کر انہیں لے جانے لگے۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جنگل ختم نہیں ہو رہا تھا۔ سر چھپانے کے لیے کوئی جھونپڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ بری طرح کانپ رہے تھے۔ شاید وہ بابر سے سہمے ہوئے تھے۔ خاموش رہنا چاہتے تھے لیکن ہزار ضبط کے باوجود ان کے منہ سے آوازیں نکلتی تھیں۔

پتا نہیں، وہ لوگ کب تک چلتے رہے۔ آدھی رات گزر گئی ہوگی ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئے۔ صدرالدین نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، آگے دریا کی طرح پانی بہہ رہا تھا۔ اس کا پاٹ چوڑا [illegible] میں تھا ٹارچ کی روشنی [illegible]

[illegible] تھا اس نے کہا، یہ ندی نہیں نالے کی طرح ہے۔ زیادہ [illegible] نہیں ہے۔ ہم اس میں اتر کر پار ہو سکتے ہیں۔ [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] تک ہوگی۔

[illegible] ہو کر [illegible] کو دیکھنے لگی۔ دیکھنے سے پتا [illegible] تھا۔ [illegible] دیکھ رہے تھے [illegible]

[illegible] میں آگے چلتا ہوں۔

[illegible]

[illegible] ایک ہاتھ میں [illegible] دوسرے [illegible] جا رہا تھا۔

[illegible] کو سہارا دے کر لے جاؤں گا۔

[illegible] کے ساتھ پانی میں اتر گیا۔ اس نے بڑے میاں کی لاٹھی لے لی تھی اور اسے [illegible] کے پیچھے [illegible] پانی [illegible] تیز تھا۔ [illegible]

[illegible] علیم الدین [illegible] بڑے میاں [illegible]

[illegible] بہہ رہا تھا [illegible]

[illegible] نے [illegible] علیم الدین [illegible] بڑے میاں کو سہارا دے کر لا رہا تھا [illegible] ان کی سلامتی کے لیے [illegible] تیز ہوا نے گزر کرائی تھی۔ بھی

طرح بھٹکتی تھی اگر سوتیاں کے قدم اکھڑ گئے تو بڑے میاں بھی نہیں بچیں گے۔ دونوں ہی بہہ کر کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔ لیکن دعا قبول ہو گئی۔ وہ بڑے میاں کو لے کر صحیح سلامت دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

وہ تھوڑی دیر [illegible] بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ بڑے میاں ایک تو اتنی دیر سے پانی میں بھیگ رہے تھے۔ دوسرے کمر تک پانی میں ڈوب کر آئے تھے۔ بخار نے اور شدت اختیار کر لی۔ [illegible] رہے تھے [illegible] حساب [illegible] تھا۔

[illegible] نے بڑے میاں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ [illegible] کے قابل بھی نہیں رہے تھے لیکن [illegible]

[illegible]

[illegible] اور چل سکیں گے پھر گر پڑیں گے۔

آگے بڑھنا ہو تو گاڑی کے پہیے پڑے دل اور آدمی کے لیے حوصلہ لازمی ہوتا ہے۔ منظور [illegible] بڑے میاں کے دوسرے بازو کو تھام کر ان کے ساتھ [illegible] ہم آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ [illegible] آپ یہ سوچیے کہ اپنے بیٹے اور پوتے [illegible] رہے ہیں۔ دیکھیے سامنے دیکھتے ہوئے چلیے۔ آپ کو اپنے بچوں کی [illegible] نظر آئے گی۔

وہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہے تھے۔ ان کے [illegible] ہوئے تھے۔ [illegible] کے لیے [illegible] ہوئی تھیں۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے سہارا لیتے ہوئے کراہنے لگے۔ بولے

سے بچوں؟ پاکستان! اے میرے خوابوں کی سرزمین! تو اور کتنی دور ہے؟ تیرا راستہ تو ہمارے لیے بہت آسان تھا۔ ہم چاٹگام سے بحری جہاز کے ذریعے جا سکتے تھے۔ طیارے کے ذریعے راستہ اور آسان ہو جاتا۔ اگر ہندوستان کی سرحدیں کھول دی جاتیں تو ہم ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچ جاتے۔ جتنے آسان ذرائع ہیں، جتنے انسانی ذرائع ہیں، ان پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ صرف چند [illegible] کھول دیے گئے ہیں۔ یہ کیسا ناقابلِ فہم انسانی رویہ ہے [illegible] لگانے کے لیے چور دروازوں سے جانے کی [illegible] رہی ہے لیکن ضمیر کا کوئی راستہ نہیں کھل رہا ہے!"

[illegible] چلتے چلتے ایکدم سے گر پڑے۔ سلمیٰ نے گھبرا کر پوچھا۔

"[illegible] ہوا؟"

صدرالدین اور کلیم الدین بھوئیاں ان پر جھک گئے۔ بابر نے ناگواری سے پوچھا: "کیا ان کا ایندھن ختم ہو گیا ہے؟"

صدرالدین نے ٹارچ روشن کی۔ وہ گھاس پر چاروں شانے چت پڑے ہوئے تھے۔ بُری طرح کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں سکوڑ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ملیریا بخار جیسی شدید سردی کا حملہ تھا۔ ان کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔ بات نہیں نکل رہی تھی۔

شاید وہ کچھ اوڑھنے کے لیے مانگ رہے تھے۔ کسی کے پاس کمبل یا لحاف نہیں تھا۔ سب مختصر سا سامان لے کر نکلے تھے۔ چٹائی اور فرسٹ ایڈ بکس کے اندرونی سامان کے علاوہ جو کچھ تھا، وہ بارش میں تر بتر ہو چکا تھا۔ ان چیزوں سے کسی بیمار کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اچانک ہی سلمیٰ تمام لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بڑے میاں پر جھک گئی۔ وہ ایک بیٹی کے مقدس جذبے سے اپنے بزرگ کو حرارت دینا چاہتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے چیخ مار کر الگ ہو گئی۔ ایک انگلی سے ان کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ سب نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ بڑے میاں کی گردن اور ہاتھوں سے جونکیں چپکی ہوئی تھیں اور ان کا خون چوس رہی تھیں۔

جونکیں عام طور پر سیاہ یا بھورے رنگ کی ہوتی ہیں۔ جسامت میں مٹی کے اندر رینگنے والے کیچوے کی طرح پتلی اور دو ڈھائی انچ لانبی ہوتی ہیں لیکن بڑے میاں سے چمٹی ہوئی خون آشام جونکیں [illegible] لانبی اور رسی کی طرح موٹی تھیں۔ تتلیوں کی طرح رنگ بدل رہی تھیں۔ اگر بچوں کے کھیلنے کی چیزیں ہوتیں تو ان کی رنگینیوں کو بوتل میں بند کر کے رکھ لیا جاتا مگر انھیں دیکھتے ہی بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارا ہی لہو چوس رہی ہوں۔

صدرالدین انھیں چٹکی سے پکڑ پکڑ کر بڑے میاں کے جسم سے الگ کرنے لگا۔ انھیں دور پھینکنے لگا۔ وہ الگ ہو رہی تھیں مگر اپنے پیچھے زخم چھوڑ رہی تھیں۔ بڑے میاں کی گردن اور ہاتھوں کا کچھ حصہ سوج گیا تھا اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ منظور فرسٹ ایڈ بکس کھول کر زخموں پر مرہم کرنے لگا۔ اب بابر کی طرح صدرالدین بھی بیزار ہو رہا تھا۔ اس نے کہا: "میں تو صاف بات کہتا ہوں، ایسے تو ہم کبھی سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ چچا میاں سے ہمدردی ہے تو انھیں اٹھا کر لے چلو۔"

سوال پیدا ہوا کون اٹھا کر لے جائے گا؟ بڑے میاں بچے نہیں تھے، اچھے ڈیل ڈول کے وزنی بزرگ تھے۔ کلیم الدین بھوئیاں کتنی دور تک کاندھے پر لاد کر لے جا سکتا تھا؟ منظور دونوں پاؤں سے مجبور تھا۔ صدرالدین دھان پان سا آدمی تھا۔ بڑے میاں کو اٹھاتے ہی ان کے نیچے دب جاتا۔ بابر نے غصے سے کہا: "ہٹ جاؤ، دور ہو جاؤ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا اور ہم سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ ہم واپس نہیں جا سکتے، یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے آگے۔"

یہ کہتے ہی اس نے بڑے میاں کے ہاتھ کو پکڑ کر کھینچا۔ وہ بیچارے زمین پر پڑے ہوئے تھے، ایک جھٹکے سے بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ اس ظالمانہ حرکت پر کوئی اعتراض کرتا، بابر نے پلک جھپکتے ہی انھیں اٹھا کر کھڑا کیا اور اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے کہا: "صدرالدین چلو۔ راستہ دکھاؤ۔"

وہ لوگ پھر آگے بڑھ گئے۔ بابر اور صدرالدین تیزی سے چل رہے تھے۔ کچھ دور جا کر کلیم الدین بھوئیاں نے کہا: "منظور بھائی کا کچھ خیال کرو۔ وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"تم منظور بھائی کو کاندھے پر بٹھا لو۔ ہماری رفتار تیز رہے گی۔"

بابر نے بڑے میاں کے بوجھ سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بوجھ اٹھانے والے مزدور ہمیشہ تیز چلتے ہیں۔ کھڑے رہنے سے وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یقین نہ ہو تو مسٹر منظور کو اٹھا کر چلو، پتا چل جائے گا۔"

اس وقت تک منظور ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اس نے کہا: "میں معذور ہوں، مجبور نہیں ہوں۔ کسی کے کاندھے پر نہیں جاؤں گا۔ تم لوگ آگے بڑھتے رہو۔ میں بہت زیادہ پیچھے نہیں رہوں گا۔"

وہ پھر چلنے لگا۔ اب بابر کی تیز رفتاری میں فرق پڑ گیا تھا۔ کچھ دور جا کر اس کی رفتار سست ہو گئی۔ [illegible] اس نے بڑے میاں کو گھاس پر بٹھا دیا۔ ہانپتے ہوئے بولا: "واہ آپ نے تو [illegible] کچھ دور تو چلیں

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "اب میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ مگر پہلے تو دیکھ لیں بخار کچھ کم ہوا ہے یا نہیں؟"

صدرالدین نے ٹارچ روشن کی۔ وہ روشنی ٹھیک بڑے میاں کی آنکھوں پر پڑی۔ ان کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔ سب ان کے قریب چلے آئے۔ منظور نے [illegible] مخاطب کیا۔ منظور نبض ٹٹولنے لگا۔ بھوتیاں ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ بابر نے کہا: "بہتر تو یہ ہے انھیں ٹٹولنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھتے نہیں، انھیں اب مرے ہوئے بہت دیر ہو گئی۔ یہ پلک نہیں جھپک رہے ہیں۔"

منظور نے ان کی آنکھوں پر ہتھیلی رکھی۔ تب اسے بتایا تو آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ روتے بلکتے سبھی کے سر جھک گئے۔ وہ ایک منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر صدرالدین نے [illegible] جو تقدیر کو منظور تھا۔ اب چلنا چاہیے۔"

منظور نے [illegible] جیسے ہی کلیم الدین بھوتیاں کو دیکھا۔ بھوتیاں نے کہا: "انھیں دفن کرنے کے بعد آگے بڑھنا چاہیے۔"

"کیا دماغ چل گیا ہے۔ قبر کھودنے اور دفن کرنے تک [illegible] بارش ختم ہو جائے گی تو [illegible] پہاڑ [illegible] ساتھ [illegible] قبر کھود لینا چاہیے۔"

قریب ہی ایک گھنی شاخ درخت سے ٹوٹ کر [illegible] پڑی ہوئی تھی۔ [illegible] گھسیٹ کر لاتے ہوئے کہا: "نہیں [illegible] اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ سب [illegible] تھے مگر خاموشی میں بھی [illegible]

[illegible] کوئی نہیں جانتا تھا کہ [illegible]

[illegible] بوڑھوں کے پاس قصبہ میں پہنچتے پہنچتے زندہ [illegible]

[illegible] وہ پلٹ کر گھنے پتوں کی قبر کو دیکھنے لگے

بادل گرج رہے تھے۔ درختوں کی شاخیں اپنے پتوں کی رگڑ سے شور مچا رہی تھیں۔ اتنے شور میں بھی انھوں نے پتوں کے نیچے سے کوئی آواز سنی۔ منظور نے کہا: "شاید ہم موت کی تصدیق نہ کر سکے۔ شاید وہ زندہ ہیں۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "ہاں۔ میں نے انسانی آواز سنی ہے۔"

بابر نے کہا: "تمھارے کان بج رہے ہیں۔"

اسی لمحے گھنے پتوں کی تہ سے آواز ابھری: "میں آ۔آ۔ آ رہا ہوں، عتیق! بیوی، گڑیا، منی، مم۔مم میں آ۔آ۔آ۔۔"

بابر نے صدرالدین کے ہاتھ سے ٹارچ جھپٹ لی۔ دوڑتا ہوا اس ٹوٹی ہوئی گھنی شاخ کے پاس گیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اسے ذرا دور پھینک دیا۔ ٹارچ روشن کی۔ بڑے میاں نظر آئے۔ اگرچہ منظور نے ایک بار ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کھلی ہوئی نظر آئیں۔ پھر ان کے دیدے پھیل گئے تھے اور وہ پلکیں نہیں جھپک رہے تھے۔ بابر نے کہا: "آؤ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ یہ مر چکے ہیں۔"

وہ سب اپنے اپنے طور پر گہری توجہ سے ان کا معائنہ کرنے لگے جیسے وہ بخار میں تپ رہے تھے۔ اب جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نبض نہیں چل رہی تھی۔ موت کا یقین ہو رہا تھا مگر وہ یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بابر نے ٹارچ بجھا دی [illegible] بڑے میاں کی آنکھیں بند کر دیں۔ ان کی ناک پر ہاتھ رکھا۔ سانس کی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے [illegible] ہوا ٹھوڑی تک آیا: "وہ زندہ ہیں؟ نہیں ہیں؟ ہیں؟ نہیں ہیں؟"

اس نے بڑے جذبے سے انھیں ٹھکرا کر کہا تھا: [illegible] جا سکتے تھے اور نہ ہی بڑے میاں آگے جانے کا موقع دے رہے تھے: "وہ زندہ ہیں؟ نہیں ہیں؟ ہیں؟ نہیں ہیں؟"

اس کا ہاتھ ٹھوڑی [illegible] پر آ گیا۔ اس کی مٹھی [illegible] انگوٹھے [illegible] پوچھا [illegible] دی؟ [illegible] کوشش کرو۔"

اسی لمحے [illegible] بڑے میاں کے ساکت جسم میں [illegible] بجلی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ اس کی [illegible] روشنی میں منظور نے دیکھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ؟

وہ جیسے [illegible] بھی [illegible] تھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور وحشت زدہ ہو کر [illegible] چیخے جا رہی تھی۔

ایسے وقت نفسیاتی علاج یہی ہے کہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہونے والے کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کیا جاتا ہے تو وہ یک لخت ساکت ہو جاتا ہے۔ چیخنا بھول جاتا ہے لیکن اس علاج میں سراسر سنگدلی ہے۔ کلیم الدین [illegible] گلاب کے پھول کو محبت کی انگلیوں سے چھو سکتا

[illegible]

[illegible] الجھن [illegible]

[illegible] مر گئی تھی [illegible]

[illegible] اپنے رونے جا رہا ہے۔ وہاں جانے کے بعد بھی ذرا دیر تک اس کی

[illegible]

[illegible] پہاڑ [illegible]

[illegible] اس کے باوجود [illegible]

[illegible] نظر آتی ہو تو اسے دیکھنے کے لیے

[illegible] پہاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

[illegible] بے ہوش تھا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بابر کے منہ سے بے اختیار نکلا: گلا دبا دو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اے پاگل لڑکی۔ تو کیوں چلا رہی ہے؟

مسکن وہ تو چپ ہو گئی تھی۔ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی
جیسے [illegible] تاریکی میں ان کی خاموشی کر رہی تھی۔

لیجیے یہ آپ کا حکم زبان بندی قبول
آپ نے پہرہ بٹھائیں میرے احساسات پر
بے نیاز مصلحت بن کر جنوں ہے کامیاب
عقل پیش کر رہی ہے خود امکانات پر

[illegible]

اسی طرح وقت [illegible] رکیں گے:

[illegible]

کیا تم نے اس کا کاروبار لیا ہے؟

منظور نے کہا: صدرالدین! ذرا اپنی ٹارچ روشن کرو۔

[illegible]

[illegible] لمبا جاتا ہے:

[illegible]

تم پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی تھیں؟

[illegible]

محکمۂ موسمیات کے ماہرین بھی اس سلسلے میں کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتے۔ اس لیے [illegible] ختم ہو رہی تھی ہوائیں اسی طرح تیزی سے چل رہی تھیں۔ [illegible] تو جا رہے تھے اور تاریک راہوں سے وہ مسافر بھٹکے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

[illegible]

[illegible] کی خواہش نہیں بتانا چاہیے:

صدرالدین سمیاں اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی دلچسپی [illegible]

[illegible]

وہ جنگل کسی ڈراؤنے خواب کی طرح ان کے ساتھ دور تک چلا جا رہا تھا۔ لیکن کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، ایک دن اس کا اختتامی سرا آ ہی جاتا [illegible] بارش اور زور پکڑ چکی تھی۔ درختوں کے شور مچاتے ہوئے پتے [illegible]

[illegible]

پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ملا صدرالدین نے کہا: یہ سامنے کی پہاڑیاں ہیں تیسری پار کرنے کے بعد ہم [illegible] پہنچ جائیں گے:

پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان کی بلندی کو آسانی سے سر [illegible]

نظر آ رہے تھے [illegible] بھی جکڑی ہوئی تھی۔ پہلے بابر نے چڑھنے کی کوشش کی اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے پاؤں اس مٹی پر جماتے ہوئے دو قدم اوپر گیا پھر سنبھل کر چلنے کے باوجود پھسل کر گر پڑا۔

صدر الدین کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کلیم الدین بھوتیاں بھی مسکرانے لگا۔ بابر نے عظمیٰ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر زمین پر سے اٹھتے ہوئے، اپنے کپڑوں کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا — تم مجھے گھور کر کیوں دیکھتی ہو؟

بھوتیاں نے پوچھا: تم اپنے گرنے کا غصہ عظمیٰ پر کیوں اتار رہے ہو؟

عظمیٰ اسے مسلسل گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا: دیکھو یہ اب بھی مجھے گھور رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ مجھے ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔

کلیم الدین بھوتیاں نے عظمیٰ کے شانے کو چھوتے ہوئے پوچھا: کیا بات ہے عظمیٰ؟

آں؟ وہ چونک گئی جیسے کہیں دور پہنچ گئی تھی۔ جیسے آپے میں نہیں تھی۔ پھر اس نے انکار میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ کوئی بات نہیں ہے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

صدر الدین نے کہا: پہلے ایک آدمی اوپر جائے گا۔ [illegible] کیسے جائے گا؟ [illegible] دوسرے آسانی سے پہنچ سکیں گے؟ اس نے بابر سے کہا: اپنا رام داؤ مجھے دو۔

اس نے کہا: تمہارے پاس اپنا ہے۔ میرا کیوں مانگ رہے ہو؟

میں دونوں ہاتھوں میں رام داؤ پکڑوں گا۔ اوپر چڑھنے کے لیے ایک کے بعد دوسرے رام داؤ کو [illegible] ہم سیڑھی کی طرح اوپر جا سکتے ہیں۔

بھوتیاں نے کہا: ہم تینوں مرد ہیں۔ ہتھیار کو اس ترتیب سے [illegible] اوپر چڑھ جائیں گے لیکن عظمیٰ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

بابر نے کہا: بھوتیاں! تم اپنا رام داؤ صدر الدین کو دے دو اور اس کی طرح اوپر چلے جاؤ۔ [illegible] بھی نہیں لگا دوں گا۔

اس نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ہم دونوں کے پاس ہتھیار نہیں رہیں گے۔ تینوں رام داؤ صدر الدین لے کر اوپر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد [illegible] منظور بھائی کے بعد عظمیٰ کو چھوڑ کر جانے کا [illegible] تم؟

وہ غصے سے بولا: کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟ مجھے یہاں چھوڑ کر بھاگ جانے کی پلاننگ کر رہے ہو۔ ہرگز نہیں۔ سب سے پہلے میں جاؤں گا۔

منظور نے کہا: چلو پہلے تم ہی جاؤ لیکن ترتیب یہ ہو گی کہ پہلے تم جاؤ گے۔ پھر میں۔ میرے بعد بھوتیاں۔ بھوتیاں کے بعد عظمیٰ کو اوپر لایا جائے گا۔ آخر میں صدر الدین اوپر آئے گا۔ بولو منظور ہے؟

بھوتیاں نے کہا: مجھے منظور نہیں ہے۔ یہ دو رام داؤ لے کر پہاڑی پر چڑھے گا۔ اوپر چڑھتے ہی بھاگ جائے گا۔ برما کی سرحد پر پہنچ چکا ہے آگے راستہ معلوم کرنا اس کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔

صدر الدین نے ہنستے ہوئے کہا: یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ برما کی سرحد پر جو پہلا گاؤں ہے اس کا نام کاچی ہے۔ میں بابر کی اطلاع کے لیے تفصیل بتا رہا ہوں۔ اس میں بھاگنے کا حوصلہ ہے تو بھاگ جائے۔ کاچی کے بعد ہم لانچ کے ذریعے مونڈو پہنچیں گے۔ مونڈو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں سے ہم کسی موٹر گاڑی یا ٹرک کے ذریعے بوتھی ڈانگ پہنچیں گے۔ پھر وہاں سے بڑی لانچ کے ذریعے اکیاب جائیں گے۔ اکیاب میں پاکستانی سفارت خانہ ہے۔ یہ سب [illegible] ڈویژن میں ہیں۔ میرے بغیر ان تمام مقامات سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔ جگہ جگہ میرے دوست ہیں اور کئی جگہ ایسے لوگ بھی ہیں جو مجھے چہرے سے نہیں پہچانتے ہم کوڈ ورڈز کے ذریعے یا کسی نشانی کے ذریعے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ بابر کے پاس نہیں ہے۔ یہ لو میں اپنا رام داؤ تمہیں دے رہا ہوں۔

صدر الدین نے اپنا ہتھیار اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے چند لمحوں تک اس ہتھیار کو دیکھا۔ پھر اپنا رام داؤ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: نہیں، پہلے تم جاؤ۔ میں آخر میں آؤں گا۔

کلیم الدین بھوتیاں نے بابر کی تسلی کے لیے اپنا ہتھیار صدر الدین کو دے دیا۔ پھر اس نے اٹیچی کھولی۔ اس کے اپنے کپڑوں کے علاوہ وہاں عظمیٰ کی چھ ساڑیاں تھیں۔ ہر ساڑی ساڑھے پانچ گز کی تھی۔ اس نے ایک ساڑی کے سرے کو دوسری ساڑی کے سرے سے [illegible] صدر الدین! تم اس کے پہلے سرے کو پکڑ کر [illegible] اوپر جاؤ [illegible] پہنچنے کے بعد [illegible] مٹی سے پاؤں جما کر کھڑے [illegible]۔ تمہارے بعد منظور بھائی اسی ساڑی کو پکڑ کر اوپر پہنچیں گے اس کے پاؤں [illegible] رام داؤ کے ذریعے اوپر نہیں چڑھ سکیں گے۔ اس کے بعد [illegible]

وہ اسی تدبیر پر عمل کرنے لگے۔ صدر الدین نے ساڑی [illegible] لے کر بعد دونوں رام داؤ انہیں جکڑی مٹی میں پیوست کرتے ہوئے ان کے بل پر اوپر چڑھنے لگا۔ بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ مٹی میں پاؤں جما کر اوپر کی طرف [illegible] اور پھسل جاتا تھا۔ عظمیٰ، کلیم الدین بھوتیاں، منظور اور بابر اسے [illegible]

[illegible]

وہ چاروں تقریباً بیس یا پینتالیس فٹ اونچی ہولی۔ ناظم نے فاصلہ بڑی مشکل سے پندرہ منٹ میں طے کیا۔ آخر بلندی پر پہنچ ہی گیا۔ کمر سے بندھی ہوئی ساری کا پلّو سرا جو تیاں کی طرف اچھال کر منظور نے تھام لیا۔ پھر وہ چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابتدا میں دشواری ہوئی۔ وہ پاؤں ٹیک نہیں سکتا تھا گھٹنے ٹیکنا چاہتا تو پھسل جاتا تھا۔ صدرالدین نے کہا: منظور بھائی! اس طرح اوپر آؤ جیسے رسی پر چڑھتے ہیں۔ رسی کو تھام کر صرف ہاتھوں کی قوت سے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت پاؤں کام نہیں آتے۔

منظور اپنے ہاتھوں کی قوت سے ہی ساری کو تھام کر اوپر چڑھنے لگا۔ کلیم الدین جو تیاں سے [illegible] پوچھا۔ کیا تم اس طرح اوپر چڑھ سکو گی؟

وہ پریشان ہو کر منظور کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اثبات کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا: میں بھی کوشش کروں گی۔

پھر اس کی باری آئی وہ ساری کو تھام کر چڑھنے لگی۔ ہاتھوں کی قوت سے چڑھتے ہوئے [illegible]

[illegible]

کیا کر رہے ہو؟

منظور بھائی اور صدرالدین! آپ دونوں خاموش رہیں اور ہماری باتیں سنتے رہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ساری کو اوپر کھینچتے ہوئے کہا: میں تمہیں اوپر آنے دوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ جنگلی تمہیں گھور کر کیوں دیکھتی ہے؟

وہ بوکھلا کر سر اٹھاتے ہوئے بلندی پر کھڑی ہوئی جنگلی کو دیکھنے لگا۔ وہ اس وقت بھی اسی کو گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر کہا: نہیں، نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ پتا نہیں۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے خواہ مخواہ دشمنوں کی طرح دیکھ رہی ہے۔

جو تیاں نے کہا: تعجب ہے یہ دشمنوں کی طرح دیکھتی ہے لیکن میں دوستوں کی طرح تمہیں یہاں نہیں آنے دوں گا۔

منظور نے حیران ہو کر پوچھا: آخر بات کیا ہے؟ یار تم چلتے کیوں نہیں ہو؟

جو تیاں نے کہا: کل رات جنگلی جھونپڑی [illegible] ساری تھی اس پر منظور پڑا تھا۔ وہ کیوں پڑا تھا؟ اسے کیا ہو گیا تھا؟ [illegible] گویا تو یہ جوانی ہے یا پھر [illegible]

[illegible]

"یاد ستا ہے [illegible] دھوپ نہیں نکلے گی۔ پھر بارش ہوگی۔ ہمارے برما پہنچنے [illegible] ہم ان مقامات سے بھی گزر سکیں گے جن کا ذکر [illegible] ہماری جولائی [illegible] بتا دو مجھے [illegible] نہیں [illegible]؟"

[illegible] کردی۔ وہ چڑھتے چڑھتے [illegible] نالے کے پانی میں [illegible] کی طرح چیختے ہوئے کہنے لگا: میں نہیں، میں نے نہیں مارا۔ یہ جھوٹ بولتی ہے۔"

[illegible] قتل کیا ہے اور یہ [illegible] ہیبت کیوں طاری [illegible] ہو گئی۔"

خاک [illegible] میں بیٹھ گیا [illegible] کہنے لگا: [illegible] کیا ہے: [illegible] کے بعد ایک [illegible] ایک دم سے [illegible] میں، اسے ذکر [illegible] اپنے جرم کا اقرار کرتا [illegible] میں نے کوئی جرم نہیں کیا [illegible] یار باندھے [illegible] تو اس کا ساتھ دیا لیکن تمہارے [illegible] جنگل کو اتنے ہوئے رہتے [illegible] جائیں گے؟"

[illegible] کی حالت میں [illegible] چلے [illegible] سے چھپا [illegible] تمہارے [illegible] رہنے والے ہیں تو جلد ہی مر جاتی ہیں؟"

[illegible] نے سر کو جھکا لیا۔ پھر آہستگی سے کہا: میں [illegible] کا خیال رکھا ہو [illegible] پھر میں [illegible] بوڑھوں کو [illegible] اپنے ساتھ لیے جاتے، انہیں لے جانے [illegible] نقصان [illegible] ہیں اور ایسے میں کوئی [illegible] سوچتے ہیں کہ سے چھوڑ دیا جائے یا اسی طرح واپس بھیج دیا جائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں" بڑے میاں میرے

مکتبہ والا آفاقی تحفے پیش کر کے انسانی زندگی کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے حکم سے روشناس کرا رہا ہے۔

۱۔ کلام پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ "روشن چراغ" عربی نہ جاننے والے اردو داں حضرات کے لئے قدرتی تحفہ ہے مکمل تیس پارے۔ اس میں عربی متن نہیں ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی "روشن چراغ" کے ذریعہ کلام پاک کو سمجھ کر زندگی سنوار سکتا ہے۔ ہدیہ بیس روپے

۲۔ مکمل قرآن پاک۔ جس کا طول ایک انچ عرض پون انچ، موٹائی نصف انچ تیس پارے، حروف روشن، مکمل مجلد بمعہ ڈبیہ، وزن صرف دس گرام، ہدیہ صرف دس روپیہ۔

۳۔ الگ الگ کلام پاک کے تیس پارے جلی حروف، عکسی طباعت، خوبصورت جلد چوڑائی ساڑھے سات انچ، لمبائی دس انچ، ہدیہ مکمل سیٹ ساٹھ روپے۔

۴۔ جلی حروف میں کلام پاک۔ سفید کاغذ، عمدہ کتابت، عکسی طباعت بہترین جلد، سائز ساڑھے سات انچ چوڑا دس انچ لمبا۔ اور ہدیہ صرف پچیس روپیہ

جو مصیبت بن گئے تھے:

بچّے سے [illegible] شمار کرکے [illegible] بس بابا ، تم [illegible] سب [illegible] سے پوچھتا ہوں ، وہ بھی خدا کو حاضر و ناظر [illegible] ، جب ہم نے سفر شروع کیا ، اس وقت بڑے میاں [illegible] بیمار ہو گئے تھے ۔ ان کا بخار دیکھ کر ، انھیں اسپرو [illegible] کھلاتے وقت کیا آپ کے دل میں یہ بات نہیں تھی کہ بڑے میاں [illegible] ساتھ [illegible] چلنا ہے ۔ انھیں کسی طرح چاٹگام واپس چلا جانا چاہیے یا پھر [illegible] میں ہمیں چھوڑ دیا جانا چاہیے ؟

سعد نے ایک گہری سانس لے کر کہا ۔ ہاں ، میرے دل میں یہ بات تھی لیکن اگر وہ مصیبت بن گئے تھے ، تو میں خود مر جاتا ، انھیں مارنے کے متعلق کبھی نہ سوچتا :

بابا [illegible] ہاتھ [illegible] کہا ، [illegible] نہیں ، میں مارنے ، قتل کرنے [illegible] نہیں کر رہا ہوں ۔ صرف اس بات کا اعتراف کرو کہ وہ بوجھ بن گئے تھے :

اس نے [illegible] کی طرف ، اشارہ کیا ، اب تم بتاؤ کیا پوری [illegible] زندگی میں ایک وقت نہیں آیا ، جب ہم نے دل سے دعا مانگی ہے کہ [illegible] بہنیں اور بیٹیاں عزت سے مر جائیں ۔ دشمنوں کے [illegible] کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی بہنوں اور [illegible] کے مکان پر [illegible] باپ سے [illegible] تم نے اپنی [illegible] ہاتھوں سے [illegible] ڈالتے ۔

[illegible] کہا ۔ [illegible] بھی وقت بھی [illegible]

[illegible] تم [illegible] اور تم [illegible] بڑے میاں [illegible] [illegible] لوگ اسی جنگل میں چھپے رہتے :

[illegible] طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ مجھے دشمن کی نظر سے [illegible] کیا [illegible] وہ کسی صورت [illegible] انھیں [illegible] کر [illegible] پاؤں سے اتار کر

یہ سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے تھے جو انسانوں کی بھری آبادی میں چھوڑ کر انھیں چلے گئے ، اگر وہ جنگل میں ان کے ہم سفر ہوتے تو کیا اپنے باپ کا ، یا اپنے دادا کا ساتھ دیتے یا اسی طرح انھیں جنگل میں چھوڑ کر چلے جاتے ؟ میں دعوے سے کہتا ہوں اخوت کا رشتہ بھی نہیں [illegible] کسی طرح اپنے کاندھے سے اتار پھینکنے کی کوشش کرتا ۔ میں نے تم سب کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا :

اس نے سینے پر ہاتھ [illegible] ہوئے کہا : ہاں میں قاتل ہوں [illegible] مجسم ہوں ۔ مجھے کیا سزا دو گے ؟ کیا یہاں چھوڑ کر چلے جاؤ گے [illegible] اوپر آؤں گا تو [illegible] قتل کر دو گے ؟ تم انسانی آبادی میں پہنچ [illegible] کے سامنے کیا جواب دو گے کہ میں [illegible] کس کا قاتل تھا ؟ [illegible] پہلے میں نے بنگالیوں کو قتل کیا ۔ کسی نے مجھے سزا نہیں دی ۔ کوئی قانون میرے خلاف نہیں تھا [illegible] کے دوران جنگل میں اپنا بوجھ ہلکا [illegible] دم توڑتے ہوئے بیماری بڈھے کو ہلاک کر دیا تو میں قاتل [illegible] ہم سب کس دنیا میں ، کس ملک میں ، کس [illegible] میں رہتے ہیں ؟ اگر بنگلہ دیش میں [illegible] مقدمہ چلے تو میں بنگالیوں کا قاتل [illegible] جس نے [illegible] میں [illegible] دم توڑتے ہوئے بڈھے [illegible] کیا جائے گا [illegible] اپنے شکنجے میں [illegible] مجھ مار ڈالو ، میں مرنے کے لیے تیار ہوں ۔ [illegible] رہوں گا ، جہاں [illegible] ہیں ، جس پار پھانسی کا پھندا لگایا جاتا ہے :

[illegible] کی باتیں [illegible] [illegible] اپنے ضمیر کے آئینے میں جھانک [illegible] کر دیکھا جائے تو ایسی باتوں کا [illegible] ہو گئے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ وہ [illegible] چاہتے تھے ۔ [illegible] نہیں تھی [illegible] انھیں [illegible] کر دیا تو وہ مرنے سے [illegible] کے نیچے ڈال دیے گئے تھے ۔ ان کی موت [illegible] ہمت سے [illegible] وہ کسی طرح بھی ساتھ چلنے کے قابل نہیں تھے [illegible]

صرف [illegible] تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن [illegible] میں یہ بات تھی [illegible] [illegible]

علم الدین جوتیاں سے بچے اس پاس کھڑے ہوئے ساتھیوں پر [illegible] ڈالی۔ بدقسمتی کی ساری کے آخری سرے کو ڈھیل دیتے ہوئے [illegible] سے بستی کی طرف جھوٹنے لگا۔

⁂

[illegible] میں [illegible] کی بھیڑ لگی [illegible] تھی۔ [illegible] وہ بیٹھے تھے [illegible] ایک [illegible] بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک بوڑھا کلرک [illegible] پاکستان [illegible] تھے۔ ان کے نام [illegible] بے شمار سارے جو [illegible] پاکستان میں نہیں ہے۔

[illegible]

[illegible] کہا: تمہاری [illegible] کلیئرنس بھیج دیں [illegible]

[illegible]

[illegible] ساتھ لپٹے کر کے [illegible] کر یہ [illegible] وقت گزار [illegible] مسلمان اور ایک پاکستانی کی [illegible] میں [illegible] جب [illegible] نیچے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

طارق سلطان خان
حیدرآباد

① کتاب لکھنی ہو تو مصنف ایک منصوبہ بناتا ہے یہ بات منصوبے کے سب سے آخر میں دریافت ہوتی ہے کہ کتاب کہاں سے شروع کی جائے۔

[illegible]

② جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے، ان کے پاس سوچنے کے لیے بہت کم باتیں ہوتی ہیں اور بولنے کے لیے بالکل نہیں۔

[illegible]

③ علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے ثمر اور بے ثمر ہے۔

[illegible]

④ خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام دیتی ہیں

[illegible]

⑤ تعلیم ایک صلاحیت کا نام ہے، اس کی بدولت تم اپنے آپے سے نکلے بغیر اور خود اعتمادی کھوئے بغیر ہر طبقے کی ہر بات سن سکتے ہو۔

[illegible]

⑥ پڑھا لکھا احمق، جاہل احمق سے بڑا احمق ہوتا ہے

[illegible]

⑦ [illegible] یہ نہیں جاننی کہ ہم مکمل بن جائیں بلکہ یہ جاننی ہے کہ ہماری نشو و نما ہوتی رہے۔

[illegible]

[illegible] ہمیں پاکستان جانے سے کیوں روکا جا رہا ہے؟ کیوں ہمیں اپنے جائز حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے؟

[illegible] سعادت [illegible]

[illegible] کیوں [illegible]

[illegible] کلیئرنس سرٹیفیکیٹ [illegible]

[illegible] مسلمان [illegible]

[illegible] پاکستان نہیں جانا چاہیے [illegible]

[illegible] مشرقی پاکستان [illegible]

عمارت خانہ کے سامنے دروازہ [illegible] اپنی تقریریں کر رہی تھیں بلکہ [illegible] لگ گیا تھا۔ اچانک ہی چاروں طرف سے [illegible] پولیس نے گھیر لیا۔ پولیس آفیسر نے آکر وارننگ دی "یہاں کسی کو تقریر [illegible] نہیں [illegible] کسی جلسے جلوس کی اجازت ہے۔ آئندہ [illegible] تقریریں کی گئیں تو سب کو یہاں سے [illegible] دیا جائے گا [illegible] جب ہی [illegible] سے [illegible] پہلے [illegible] بھی [illegible] تو [illegible] جاتے۔ چاروں طرف جیسے سمندر تھا۔ وہ [illegible] تھے۔ [illegible] راستہ روک دیا گیا تھا۔

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

شام کے وقت [illegible] کرنے کے [illegible] بیٹھے ہوئے تھے [illegible] میں [illegible] دوسرا دن تھا۔ [illegible] نہیں [illegible] تھا۔ [illegible] دیکھنے کی [illegible] نہیں تھی [illegible] مضطرب تھا کہ پاکستان سے کسی طرح جلدی کلیرنس آ جائے۔

[illegible] بیٹھے تھے [illegible] چاندنی کی طرح تھا [illegible] جاتا ہے [illegible] نہیں [illegible] دوسرے [illegible] بھی تھے [illegible] کی چاندنی [illegible] یقین [illegible] ہوا [illegible] چاند کو [illegible] وطن کی مٹی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

[illegible] کی [illegible] تھے [illegible] ہوئے تھے [illegible] کیا [illegible] آپ کو بھی یقین ہے؟

[illegible] ہیں۔

[illegible] آپ کی موجودگی وہاں ضروری ہے:

[illegible] سے بند کر دو:

[illegible]

میں آپ سب کی توجہ چاہتا ہوں۔ میں [illegible] تقریر نہیں کر سکتا، کیونکہ یہاں ہم پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر خود کو پاکستانی ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر لی، لیکن ہمارے زبانی ثبوت حکومتِ پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ایک مسلمان سے پوچھا جائے کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اس کے ثبوت میں وہ صرف کلمہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ ہمارے [illegible] مسلمان [illegible] سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا جاتا۔ پاکستانیوں کی بھی شناخت کے لیے آج تک سرکار کی طرف سے کوئی قانون نہیں بنایا گیا [illegible] اور نہ [illegible] پاکستان نے عوام کے لیے شناختی کارڈ ضروری سمجھا [illegible] ہے کہ ہم صرف ایک دوسرے کے [illegible] پاکستان [illegible] ہمارے ذہن میں ایک تجویز ہے:

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ [illegible] کہا۔ [illegible] کے [illegible] کیا جا سکتا ہے [illegible] پاکستان [illegible] ہیں، وہ [illegible] کام [illegible] ہیں۔ [illegible] پاکستان [illegible] ہمارے [illegible] ہیں۔

[illegible] تحریک چل سکے گی؟

آپ [illegible] تنظیموں کو اس مقصد کے لیے آمادہ کریں۔

[illegible] ہے۔ [illegible]؟

[illegible] پاکستان [illegible]

[illegible] تو ہم خود جا کے کلیرنس لیں گے:

[illegible] وہ [illegible]

[illegible]

چلا جائیں گے۔ اپنے رشتے داروں اور دیگر پاکستانی بھائیوں کے۔ یہ کلیرنس بھیجتے رہیں گے۔

اجلاس کے اختتام پر لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں [illegible] مکان سے نکل کر جانے لگے۔ خسرو کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شخص [illegible] تھا۔ اس نے کہا: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کون کرتا ہے؟ کون تحریک چلائے گا؟ پاکستان پہنچتے ہی سب کو روزگار اور دال روٹی کی فکر ہو گی۔ بچوں کی تعلیم اور رہائش کا مسئلہ ہو گا۔ نئی جگہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے میں کون تحریک چلائے گا؟

خسرو کو اس کی بات بری لگی۔ [illegible] ہی ہے ہر آدمی پہلے اپنا فرض [illegible] آنسو پونچھے اور [illegible]

[illegible]

[illegible] حکومت پاکستان کے [illegible]

[illegible]

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی [illegible]

[illegible]

رو کے ہوئے ہچکیاں لیتے ہوئے بولی: ”بھائی جان! [illegible]

ابھی اٹھاؤ...!“

وہ بہت [illegible] اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا: ”ہاں، ہاں۔ تم نے تو خط میں لکھا تھا۔ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ ہم ناچیز بندے کیا کر سکتے ہیں۔ اوہ گاڈ! آنسو تو پونچھ لو۔ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں!“

وہ چونکتے ہوئے حیرت سے بھائی کو دیکھنے لگی۔ [illegible] جس ماں نے جنم دیا اور دودھ پلایا۔ جس باپ نے محنت کی چھاؤں میں شفقت سے [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ طارق بھائی ہیں نا [illegible]؟

”میں طارق ہوں۔“ اس نے مصافحہ کیا پھر فوراً ہی ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: ”سامان اٹھاؤ اور میرے پیچھے آؤ!“

[illegible]

[illegible] غیر ضروری سامان رکھ کر پھیلا جاتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] قبرستان کے قریب [illegible] طارق نے ایک مکان کا [illegible]

چلو۔ میں ابھی آتا ہوں:

وہ تالا کھولنے گیا۔ یہ دونوں اندر آ گئے۔ وہ ایک پختہ مکان تھا۔ دو کمرے، [illegible] اور باتھ روم کے علاوہ سامنے چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے بہت چھوٹا سا آنگن تھا۔ کمروں میں روزمرہ ضروریات کا مختصر سا سامان تھا۔ [illegible] نین تارا: یہ تو خالی مکان ہے۔ تمہاری بھابی اور بچے کہاں ہیں؟

یہ بات وہ طارق سے پوچھنا چاہتی تھی۔ طارق نے اندر آتے ہی کہا: یہ تم لوگوں نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ بنگلہ دیش سے آنے والے مہاجر اپنے لباس اور گفتگو سے صاف پہچانے جاتے ہیں:

نین تارا نے کہا: بھائی جان! ہر صوبے کے لوگ اپنے لباس اور لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہم پہچان لیے جائیں تو آپ کے لیے پریشانی کی کیا بات ہے؟

ہاں، وہ بات یہ ہے کہ بنگلہ دیش سے آنے والوں کو یہاں والے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے انہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر اپنی شکست یاد آتی ہے۔ ذلت سی ہوتی ہے۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان شکست کھانے کے بعد کیا دنیا والوں سے منہ چھپا رہا ہے؟ نہیں، وہ تو شکست کے بعد نئی قوت سے محنت کر کے دنیا کا ایک بہت بڑا صنعتی ملک بن گیا ہے۔ یہ لوگ شکست سے سبق کیوں نہیں سیکھتے؟ کیا شہسوار میدان جنگ میں گر کر نہیں سنبھلتے؟ اگر سنبھلتے ہیں تو ذلت کیسی؟

بات ہماری ہمت کی نہیں بلکہ یہاں رہنے بسنے والوں [illegible] کی سوچ [illegible] باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے ہم [illegible] کے گھر میں چوری کرنے آئے ہیں۔ ہم اپنا کماتے کھاتے اور اپنا ہی پہنتے ہیں۔ کوئی ہمیں دیتا ہے تو ہم بدلے میں محنت دیتے ہیں۔ [illegible] اپنے لیے ہی [illegible] طلب کرے گا۔ [illegible] کیوں رہتا ہے؟ جب سے یہ ملک آباد ہوا ہے، روٹی، کپڑا اور مکان [illegible] ہی [illegible] دیتے آئے ہیں۔

نین تارا [illegible] دونوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے وطن میں [illegible] ان کے [illegible] بھائی [illegible] کسی مالک مکان کے گھر [illegible] ہوں۔ نین تارا نے کہا: آپ بھی [illegible] آپ تو ہم سے صرف دو برس پہلے [illegible] آئے ہیں:

ہم ابھی کسی کو نہیں بتا سکتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ [illegible] بڑا بھائی مہاجر ہے:

آپ بڑے [illegible] مہاجر [illegible] گئے؟

[illegible]

طارق سلطان اعوان - حیدرآباد

لڑکا	◑ بلینک چیک
لڑکی	◑ [illegible] چیک
یونیورسٹی	◑ [illegible]
علم و تعلیم	◑ میرج بیورو
سچی محبت	◑ ڈکشنری کا ایک خوبصورت لفظ
محبت	◑ اندھا پن
شادی	◑ اندھے پن کا آپریشن
شوہر	◑ جو بیوی کے پاؤں کے درد کو اپنے سر کے درد سے اہم سمجھے۔
بیوی	◑ سابق حسینہ
عادی [illegible]	◑ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
[illegible]	◑ سگریٹ کی [illegible]
دادا جان	◑ پرانا کمبل
نانا جان	◑ پرانی رضائی
بڑھاپا	◑ جسے ملک الموت نے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا

ان کے والدین میری اصلیت جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان والوں کو یقین دلایا ہے کہ میرے والدین دہلی سے یہاں آئے تھے، پھر ہندوستان چلے گئے۔ وہاں والدین کا انتقال ہو گیا۔ صرف ایک بہن ہے، وہ اپنے شوہر کے ساتھ آنے والی ہے۔ اور تم آ گئی ہو:

نین تارا نے پوچھا: بھابی اور بچے کہاں ہیں؟

اسی شہر میں ہیں۔ کسی دن ان سے ملاؤں گا:

کسی دن کیوں؟ آج کیوں نہیں؟

پہلے تم دونوں اس محلے میں رہو۔ تم لوگوں کی زبان میں بنگالی اور بہاری لہجے کی [illegible] ہے۔ [illegible] دہلی [illegible] سیکھو۔ میں تم دونوں کے لیے دو [illegible] سلوا دوں گا۔ جب تم لوگ یہاں کے ماحول میں ڈھل جاؤ گے تو میں اپنے سسرال والوں سے تمہیں ملاؤں گا۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ [illegible] بہت ہی اچھے علاقے میں ایک [illegible] رہتے ہیں۔ [illegible] سوسائٹی میں [illegible] لوگوں کو بھی [illegible] ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ ٹریننگ کے بغیر وہاں والوں کا [illegible] مشکل ہوگی:

نین تارا چونک پڑی: آپ کی شکل ہوگی؟ آپ اپنی [illegible] کو اپنے سسرال والوں سے ملاتے تو آپ کی

تسلی ہو گی؟ کیا ہم جنگل سے آئے ہیں کہ آپ انسانوں کی سوسائٹی میں لے جانے سے پہلے ہمیں ٹریننگ دیں گے؟"

طارق نے خسرو سے کہا: "خواہ مخواہ خفت دکھا رہی ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔ مختلف سوسائٹی کے مختلف آداب ہوتے ہیں۔ ابتدا ہی سے مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرزِ رہائش میں نمایاں فرق رہا ہے۔ تمہیں یہ فرق سمجھنا چاہیے۔ اگر میں ٹریننگ کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم دونوں کو جنگلی سمجھتا ہوں۔ نہیں، تم دونوں میرے اپنے ہو۔ میں نے ایک بہاری سے دلّی والے کا روپ اختیار کیا ہے اسے برقرار رکھنے کے لیے سمجھا رہا ہوں مگر یہ ناراض ہو رہی ہے۔"

خسرو کچھ کہنا چاہتا تھا اس سے پہلے ہی وہ بولی: "ہاں، مجھے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ دشمنوں نے میری امی اور ابو کو مجھ سے چھین لیا۔ میں ناراض ہو کر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ پھر آپ کا کیا بگاڑوں گی۔ میں تو صرف ایک ہی خواب دیکھتی آئی ہوں کہ وہاں گھر لٹ گیا، یہاں گھر کا ماحول ملے گا۔ بھائی، بھابیاں، بھتیجی، بھتیجے ملیں گے لیکن آپ لوگ تو اعلیٰ کوالٹی کے انسان نکلے۔ آپ تک پہنچنے کے لیے ہم ادنیٰ لوگ کئی سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں مگر ایک بات یاد رکھیے ہماری اپنے لہو کی لکیریں کھینچتے ہوئے مشرقی پاکستان گئے اور اب لہو کی لکیریں نقش کرتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں۔ ہم مر سکتے ہیں، مگر اپنی شناخت کو نہیں مٹا سکتے۔ ہم آپ کو تو چھوڑ سکتے ہیں، مگر اپنے آبا و اجداد کی تہذیب سے منہ نہیں موڑ سکتے۔"

خسرو نے کہا: "بھائی جان! عورت نکاح کے بعد اپنے شوہر کے گھر آتی ہے۔ بھابی نے ایک بہاری سے شادی کی ہے۔ انہیں آپ کے ہاں آ کر رہنا چاہیے۔ اگر آپ وہاں جا کر اپنی شناخت بدل رہے ہیں تو یہ نادانی ہم نہیں کریں گے۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ اس مکان میں رہو گے؟ جانتے ہو کراچی کتنا بڑا شہر ہے؟ یہاں قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔"

"آپ مہاجروں کو زندگی کی ٹھوکروں سے ڈرا رہے ہیں۔ بھائی جان! ہمیں طوفانوں میں بھی تنکے جمع کر کے آشیانہ بنانے کا سلیقہ آتا ہے۔"

نین تارا نے کہا: "تو آپ کے مکان کا تالا چابی کے بغیر بند ہو جاتا ہے؟ آپ چابی لے جائیں۔ بھابی اور بچوں کو لے کر آئیں۔ ہم یہاں دو گھنٹے تک انتظار کریں گے۔ اگر یہاں گھر کا ماحول اور رشتہ داری نہیں ملے گی تو آپ کے مکان میں تالا ڈال کر چلے جائیں گے۔"

"کیوں فضول باتیں کر رہی ہو؟"

"میں سیدھی سی بات کہہ رہی ہوں۔ ہم اپنا تہذیبی ورثہ چھوڑ کر آپ کی ضد پر نہیں جا سکتے۔ بھابی صرف ملاقات کرنے یہاں آ سکتی ہیں اور آپ اگر سمجھائیں گے تو وہ ضرور آئیں گی۔"

اس نے بہن اور بہنوئی کو بے بسی سے دیکھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ گھر چھوڑ کر ایک بار پھر کٹھن مراحل پر چل سکتے ہیں۔ اس نے کہا: "میں جا رہا ہوں۔ تمہاری بھابی کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

وہ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے سوچنے لگا۔ کیا کرے؟ اپنی نازنین بیگم کو کیسے سمجھائے؟ وہ سسرال میں ایک طرح سے گھر داماد تھا۔ لیکن اسے گھر داماد سمجھا نہیں جاتا تھا۔ سسر کا تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ نازنین اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے داماد کو بیٹے کی طرح سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا لیکن انہیں دلّی کی تہذیب اور خصوصاً دلّی کی زبان بہت عزیز تھی۔ اگر ان کے سامنے کوئی بچہ اور تلفظ کی ذرا بھی غلطی کرتا تو وہ غلطی ان کے مزاج پر گراں گزرتی تھی۔ بدحالی سے گزر کر آنے والے کو بھی نہیں سمجھتے تھے کہ وہ خوش حال گھرانہ کھانے اور پہننے کے معاملات میں صرف نفاست پسند ہی نہیں، حد سے زیادہ نازک مزاج بھی ہے۔ جب بہار سے نین تارا کا پہلا خط موصول ہوا تھا تب ہی نازنین نے کہہ دیا تھا: "دیکھو طارق، اپنی بہن اور بہنوئی کو ہمارے ہاں نہ لانا۔ میں سمجھتی ہوں وہ بے چارے کتنی مصیبتیں اٹھا کر یہاں آ رہے ہیں۔ ہم ان کی بھرپور مدد کریں گے۔۔۔ مصیبت زدہ رشتے داروں کی مدد کی جاتی ہے۔ انہیں سر پر نہیں بٹھایا جاتا۔ تم پاپوش والا مکان انہیں رہنے کے لیے دے دو۔ اپنے بہنوئی کو کوئی چھوٹا سا کاروبار کرا دو۔ میں بھی سوشل ورک کے بہانے ادھر جاؤں گی تو نین تارا سے ملاقات کر لوں گی۔"

طارق اپنی بیوی کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ بڑی بڑی بیگمات کی طرح سوشل ورکر بن کر غریبوں کی جھگیوں میں جایا کرتی تھی۔ مگر غریبوں کا وجود اپنی عالی شان کوٹھی میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے یہ بات صرف بڑی بڑی بیگمات کی نہیں تھی۔ پوری قوم، بنگلہ دیش سے آنے والے مہاجروں کو نظر انداز کر رہی تھی۔ آج چودہ برس گزر جانے کے باوجود یہاں کے لوگ المیۂ مشرقی پاکستان سے آنکھیں چار کرنے، اس سے موزوں نتائج اخذ کرنے اور ان کی ذمہ داری کا تعین کرنے سے کترا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور صحافی اور وقت کے نباض جناب ارشاد احمد حقانی صاحب فرماتے ہیں۔

"المیۂ مشرقی پاکستان کے بارے میں باقی پاکستانی قوم یعنی ہم مغربی پاکستانیوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ایک انتہائی خوفناک مریضانہ ذہنیت سامنے آتی ہے۔ بطور قوم ہمارے اندر حقائق کو جاننے اور ان کا سامنا کرنے کی جرأت کا ایسا شرمناک فقدان ثابت ہوتا ہے کہ انفرادی اور ذاتی زندگی میں کوئی شخص اپنے خاندانی یا کاروباری سانحات کے بارے میں ایسی غفلت اور بزدلی کا رویہ اختیار کرے تو لوگ اسے پاگل قرار دیں۔ ظاہر ہے جب ہم نے سانحے کے اسباب کا تجزیہ ہی نہیں کیا تھا تو اس سے سبق سیکھتے!!

آئندہ اس کے خسارے سے بچنے کا امکان کس طرح ابھر سکتا ہے ؟"

ایک حساس دانشور نے جس مریضانہ ذہنیت کا ذکر کیا ہے وہ پوری قوم کے لیے باعث تشویش ہے۔ طارق اپنی بیوی کو اور سسرال والوں کو ایسی ذہنیت سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف نین تارا کو، وہ اپنے سینیئر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چار گھنٹے تک دفتری کاموں میں معروف رہا اور کوئی تدبیر سوچتا رہا۔ پھر دفتر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھے ہوئے سوچنے لگا۔ "مجھے تو جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ کسی طرح یہ بتانا کہ چند دنوں تک اس مکان میں رہنے پر مجبور کیا ہوگا۔ نہیں بتانا ہوگا کہ اجنبی شہر میں میرے سہارے کے بغیر انہیں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر ایک بہن کے شوہر ہونے سے ایک بھائی کو بڑی ندامت ہوگی:

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بالاپوش والے مکان کے سامنے پہنچا تو اسے اترنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دور ہی سے مکان کے دروازے پر لگا ہوا تالا نظر آگیا۔ وہ تالا ان کی خودداری کا مظہر تھا۔ ایک بہن ہزاروں میل سے کانٹوں پر چلتے ہوئے اپنے بھائی اور بھابی سے محبت کا حق مانگنے آئی تھی۔ محبت کو خیرات کے طور پر حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اپنے جیون ساتھی کے ساتھ جا چکی تھی۔

* * *

جنگلوں سے گزرنے والے پہاڑوں کو عبور کرنے والے سرخ بنگلہ دیش کی سرحد کو پار کر کے برما پہنچ گئے۔ سب سے پہلے وہ اراکان ڈویژن کے شہر اکیاب پہنچے۔ اکیاب میں پاکستانی سفارت خانہ تھا۔ انہیں کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ وہ کیمپ برمی فوج کی نگرانی میں تھا اور یہ مہاجر کیمپ کہلاتا تھا۔ بنگلہ دیش سے [illegible] ہو کر آنے والوں کے لیے وہاں بھی یہ مسئلہ تھا، وہ یہ تھا کہ ان کی پاکستانی شناخت پر بھی جانی تھی، کوئی ثبوت طلب کیا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا تھا۔ ہزاروں افراد کیمپ میں پڑے ہوئے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے لیے دن رات دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ [illegible] اپنے وطن سے نکل کر اپنے ہی وطن پہنچنے کے لیے [illegible] رہ گیا تھا۔

عظمیٰ و کلیم الدین سموتیاں کے ساتھ آنے والے منظور [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] اس سلسلے کے اہم کاغذات تھے۔ ان کے ذریعے [illegible] [illegible] تھے اس نے وعدہ کیا کہ اپنے [illegible] [illegible] [illegible] کے لیے بھی کوششیں کرے گا۔ [illegible] پاکستان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پاکستانی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

تم دونوں پرانے پاکستانی ہو۔ نئے پاکستان میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ تمہارے لیے جگہ کیسے نکلے گی؟ مجھے افسوس ہے۔"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ دن اور ہفتے گزرنے لگے۔ عظمیٰ اور کلیم الدین سموتیاں خالی خالی نظروں سے دروازے کو تکتے رہتے تھے۔ شاید کوئی انہیں لینے آجائے، شاید منظور بھائی وہاں سے کلیرنس بھجوا دیں۔ وہاں ایسے بے شمار خاندان تھے، جن کے افراد اسی طرح آس لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ویسے کیمپ میں انہیں تین وقت کا بہت ہی لذیذ کھانا ملتا تھا۔ سبزی بھاجی ایک الگ سی ڈش ہوتی تھی۔ بڑا گوشت، مچھلی اور مرغ وغیرہ کا سالن ہر روز کھانے کے لیے دیا جاتا تھا۔ ہر ہفتے فی خاندان بیس روپے دیے جاتے تھے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ بس ایک کرب تھا کہ وطن میں بے وطن ہو گئے۔ اپنا گھر اپنے وطن کی زمین پر ہو اور وہاں روکھی سوکھی کھانے کو ملے تو کیمپ کے لذیذ کھانوں سے زیادہ لذت اور آسودگی ملتی ہے۔

ان دنوں جناب ریاض پراچہ صاحب برما میں پاکستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ایک سفیر کی حیثیت سے اپنی فرض شناسی کی مثال قائم کر دی۔ وہ بنگلہ دیشی مہاجروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ دکھ، مصیبتیں اور صدمے اٹھا کر آئے ہیں۔ ان کے زخموں پر اپنی کوششوں کی حد تک مرہم رکھا جائے۔ اس کے باوجود لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔ لیڈر قسم کے حضرات لوگوں کو جمع کر کے ان کے خلاف تقریریں کرتے رہتے تھے۔ یہ باتیں سفیر صاحب کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں لیکن وہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ جو شخص کام کرنے والا ہو وہ نام حاصل کرنے کے پیچھے نہیں دوڑتا، اپنی لگن میں مست رہتا ہے اور ان کی کوشش یہی تھی کہ کیمپ میں ایک مہاجر بھی نہ رہنے پائے۔ کسی طرح سب لوگ پاکستان پہنچ جائیں۔

ایک روز کیمپ کے سامنے ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں ریاض پراچہ صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں ان کے سامنے لیڈر حضرات نے طرح طرح کے الزامات لگائے۔ ایک نے کہا، "ہمیں یہاں مرغن غذائیں کھلائی جا رہی ہیں۔ ہفتے میں بیس روپے دیے جاتے ہیں۔ ہم کہتے تھے کہ ہمیں یہاں برباد کر کے [illegible] پر امداد دی جا رہی ہے اور ہمیں جلد سے جلد پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ لیکن یہاں تو یہ سلسلہ ایسا ہے جیسے ہمیں امداد پر ہی ساری زندگی گزار دینا ہے۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم بنگلہ دیش کو چھوڑ کر خیرات مانگنے نہیں آئے ہیں۔ ہم اپنے وطن جانا چاہتے ہیں۔"

لوگ اپنی دانست میں جوشیلی تقریریں کر رہے تھے۔ آخر میں ریاض پراچہ صاحب نے [illegible] کر کہا "آپ جو کہتے ہیں، کیا میں نے آپ تمام لوگوں کو یہاں روک رکھا ہے؟ مجھے اتنے اختیارات [illegible] [illegible] چاہتا ہوں آپ لوگ [illegible] [illegible] [illegible]

روانہ کر دوں۔ میرے پاس کیا اختیارات ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں؟

اگر نہیں جانتے تو سن لیجیے۔ یہ جو ہفتے میں بیس روپے آپ کو ملتے ہیں اور روزانہ مرغن غذائیں کھانے کو ملتی ہیں تو یہ حکومت پاکستان کی طرف سے نہیں ہے۔ ہماری حکومت اگر اتنے مہنگے کھانے کھلا سکتی اور ہفتے میں نقد رقم دے سکتی تو بہت پہلے ہی آپ لوگوں کا بلاوا آ جاتا۔ جو کثیر رقم یہاں خرچ ہو رہی ہے اس رقم سے ایک ایک خاندان کو اتنی رقم پاکستان میں دی جا سکتی ہے کہ وہ چھوٹی سی پان سگریٹ کی دکان لگا لے۔ کوئی ریڑھے پر دکان سجا لے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ روزانہ آپ لوگوں پر کتنی رقم خرچ کر رہا ہوں۔

لیکن میں یہ کثیر رقم کہاں سے لاتا ہوں؟ میرے پاس کوئی خزانہ گڑا ہوا تو نہیں ہے کہ زمین کھودتا رہوں اور آپ لوگوں کے لیے نکال کر خرچ کرتا رہوں۔ آج آپ سن لیں، جب سے آپ لوگ آئے ہیں میں دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتا ہوں۔ سکھ کا سانس لینا بھول گیا ہوں۔ آپ لوگوں کی خاطر میں برما کے جنوب میں رنگون جاتا ہوں، مشرق میں مولمین پہنچتا ہوں، شمال میں منڈالے کی طرف سفر کرتا ہوں۔ برما کے تمام دولت مند مسلمانوں سے میرا رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ میں ان سے آپ لوگوں کے لیے چندہ وصول کرتا ہوں۔ وہ بڑی بڑی رقمیں آپ لوگوں کو دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ میں ان کی دی ہوئی رقموں کو خود ہاتھ نہیں لگاتا۔ برما کے مخیر حضرات نے خود ہی آدمی مقرر کیے ہیں جو آپ لوگوں کے لیے پکاتے ہیں اور کھلاتے ہیں۔ ان کا ہی ایک خاص آدمی آپ لوگوں کو بیس روپے فی خاندان کے حساب سے دیتا ہے۔

آپ میرے مسائل تو نہیں سمجھ سکتے۔ ایک طرف میں غیر ملک میں پاکستان کے وقار اور اس کی ساکھ کو برقرار رکھنے والا ایک ذمہ دار سفیر ہوں۔ حکومت وقت کی پالیسی پر عمل کرنا میرا فرض ہے اور میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ جب تک کلیرنس نہیں آ جاتا، میں آپ لوگوں کو یہاں سے بھیج نہیں سکتا۔ دوسری طرف حکومت برما کبھی نرمی سے اور کبھی سختی سے کہتی ہے کہ ان کے ملک میں غیر ملکیوں کا اضافہ تشویشناک ہے۔ آنے والے مہاجروں کو جلد سے جلد بھیجا جائے اور کیمپ خالی کرایا جائے۔ مجھے انہیں بھی سمجھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہاں کے ہمدرد مسلمان ہیں۔ وہ کوششیں کر رہے ہیں کہ جہاں اتنی رقمیں دیتے ہیں وہاں بیرونی ممالک میں اپنے رشتے داروں کو خطوط لکھ کر آپ لوگوں کے لیے کلیرنس بھیج سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں ایک ایک، دو دو خاندان یہاں سے روانہ ہوتے ہیں۔ جن کا مغربی پاکستان میں کوئی نہیں ہے لیکن غیر متوقع طور پر ان کے لیے کلیرنس آ جاتا ہے۔ میں کن حالات میں اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں، یہ نہ آپ سمجھ سکتے ہیں، نہ میں تفصیل سے آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔"

یہ باتیں سن کر سب لوگوں کو چپ لگ گئی۔ کچھ لوگ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ کچھ آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ سفیر صاحب نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، آپ لوگوں نے بنگلہ دیش میں قیامت کا وہ منظر دیکھا ہے جو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ایسے بدترین حالات سے گزرنے والے پاگل ہو جاتے ہیں۔ ذہنی طور پر کسی حد تک نارمل نہیں رہتے۔ مزاجاً چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت آپ لوگوں کی ہے۔ آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھتے۔ صرف اپنی مجبوریوں کو دیکھ کر مجھ پر جھنجھلاتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہوں۔ اس لیے آپ لوگوں کی ضد، ہٹ اور میرے خلاف ہونے والی باتوں کا برا نہیں مانتا اور نہ مانوں گا۔ آپ سب میرے پاکستانی بھائی ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، جب تک اس کیمپ کا ایک ایک فرد پاکستان نہیں پہنچے گا اس وقت تک میں بھی اپنے وطن کی زمین پر قدم نہیں رکھوں گا۔"

کیمپ کے لوگ اُن سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے وہاں کے خود ساختہ لیڈروں کو لعن طعن کی اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ ان کی سیاست میں نہیں آئیں گے۔ وہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ سونے کے لیے بستر، اوڑھنے کے لیے کمبل، سب کچھ دستیاب تھا۔ بیماروں کو دوائیں مل جاتی تھیں۔ دن ہفتے اور مہینے گزر رہے تھے۔ کیمپ میں لوگوں کی تعداد کم ہو رہی تھی، اس کے باوجود عظمیٰ اور کلیم الدین بھویاں کے نام کلیرنس نہیں آ رہا تھا۔

وہاں کئی لوگوں نے ان سے ان کے رشتے کے متعلق پوچھا۔ پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بزرگوں نے سمجھایا، "جب ساتھ ہی رہنا ہے تو نکاح کیوں نہیں پڑھوا لیتے؟"

بھویاں نے عظمیٰ سے پوچھا: "کیا تمہیں منظور ہے؟"

اس نے سر کو جھکا لیا۔ اب اتنی بڑی دنیا میں نہ تو بھویاں کا کوئی رہا تھا اور نہ ہی عظمیٰ کا۔ وہی ایک دوسرے کے بن کر اس دنیا میں اپنے رشتے کو مستحکم رکھ سکتے تھے۔ برما کے ایک قاضی نکاح پڑھانے کے لیے آئے۔ انہوں نے پوچھا: "بیٹی! کیا تمہیں کلیم الدین بھویاں سے نکاح قبول ہے؟"

عظمیٰ نے ہولے سے سر کو ہلا دیا۔ قاضی صاحب نے کہا: "اپنی زبان سے بولو۔ کیا قبول ہے؟"

وہ چپ رہی۔ آس پاس بیٹھی ہوئی عورتوں نے کہا: "بول دو۔ شرمانے کی کیا بات ہے؟"

عظمیٰ نے ان کے اصرار پر کہا: "قبول ہے۔"

قاضی صاحب کے ابرو حیرت سے پھیل گئے۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا: "تم کیا بول رہی ہو۔ پھر سے بولو۔"

اس نے پھر نکاح قبول کیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا: "یہ کون سی زبان ہے؟"

وہاں بیٹھی ہوئی ایک تعلیم یافتہ لڑکی نے کہا: "یہ نفرت سے کہی ہوئی زبان ہے جو محبت سے نکاح قبول کر رہی ہے۔"

نکاح ہو گیا۔ وہ میاں بیوی بن گئے۔ ایک ہفتے بعد بابر کا ایک خط موصول ہوا۔ بڑا سا لفافہ تھا۔ اس نے کلیرنس فارم کے ساتھ ایک خط لکھا تھا۔ "مسز کلیم الدین بھوتیاں! عظمیٰ سے دور ہونے کے بعد میں نے اپنے آپ پر غور کیا۔ میں نے کوشش کی کہ جانوں میں برما کیمپ میں ہمیشہ تمہاری مخالفت کیوں کرتا رہا۔ میرے دل نے کہا، میں عظمیٰ کو چاہتا ہوں۔ اسے تمہارے قریب دیکھ کر اور تمہاری طرف مائل دیکھ کر میرے اندر نامعلوم سی جلن پیدا ہو جاتی تھی۔ اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عظمیٰ مجھے اچھی تو لگتی تھی لیکن میں اسے اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے حالات ہی ایسے تھے اور آئندہ کن حالات سے گزرنے والا ہوں، یہ سمجھے بغیر کسی لڑکی کو اپنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہاں پاکستان پہنچ کر میرا دل میرے سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر دھڑکنوں کی زبان سے یہی کہہ رہا ہے: 'چاہیے، عظمیٰ چاہیے۔'

پہلے تو جی میں آیا کہ صرف عظمیٰ کے نام کلیرنس بھیجوں اور تمہیں وہیں کیمپ میں سڑتے رہنے کے لیے چھوڑ دوں۔ پھر مجھے تمہارا وہ احسان یاد آیا۔ برما کی جنگلی پہاڑی پر اگر تم میری مدد نہ کرتے تو میں کبھی اس کی چوٹی تک نہ پہنچ سکتا اور یہاں تک نہ آتا۔ تمہاری دشمنی مجھے مہنگی پڑی لیکن تم نے انسان دوستی کا ثبوت دیا۔ میں بھی انسان ہوں۔ جواباً تمہارے نام بھی کلیرنس بھیج رہا ہوں۔

مسٹر بھوتیاں! تم دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ نہیں ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو بھائی بہن بنا کر کلیرنس بھیج رہا ہوں۔ اس کے مطابق تم بھائی بہن ہو لیکن عظمیٰ میری ہونے والی ہے۔ اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے اپنی بہن سمجھو اور یہاں لے آؤ۔ میں اسے شریکِ حیات بنا کر عزت آبرو سے رکھوں گا۔"

عظمیٰ خط پڑھنا جانتی تھی۔ بھوتیاں نے اسے پڑھ کر سنایا تو وہ تڑپ گئی۔ کہنے لگی: "اس کلیرنس کو پھاڑ کر پھینک دو۔ یہ ہمارے ازدواجی رشتے کے لیے ایک گالی ہے۔"

کیمپ کے ایک سب سے بڑے افسر سے کہ یہ غیرت کرنے کی [illegible] جب یہاں ہو گئے ہیں کلیرنس آیا ہے لیکن وہ بھائی بہن کے لیے ہے مجھے وہ استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ ان کے پاس آنے لگے۔ کوئی [illegible] کہتی تھی [illegible] ان جانے دو تم [illegible] کسی طرح دوسرا کلیرنس بھیج دوں گی۔"

کوئی کہتا تھا۔ "ہم سے دس ہزار لے لو۔ چار سو لے لو۔ ہزار روپے لے لو اور یہ ہمیں دے دو۔"

[illegible] دیا تھا۔ یہ ہماری عمر بھر کی [illegible] ہو جائے گی۔ ہم [illegible] کر دوں گا۔ [illegible] سب دکھی تھے۔ اپنا گھر اس

طرح روتے تھے کہ ہر ایک پر ترس آتا تھا۔ سب ہی کے لیے کام آنے کو جی چاہتا تھا۔ اس رات عظمیٰ اور کلیم الدین بھوتیاں سو نہ سکے۔ ان کے سرہانے وہ کلیرنس رکھا ہوا تھا۔ اس وقت کیمپ والوں کے لیے وہ دنیا کی سب سے بڑی دولت تھا۔ اتنا قیمتی ہیرا تھا، جسے کوئی بھی خرید کر لے جا سکتا تھا۔

رات کے دو بجے عظمیٰ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کلیم الدین بھوتیاں نے کہا: "مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، کل سفیر صاحب سے ملاقات کروں گا۔ یہ پوچھوں گا، کیا اس کلیرنس میں رشتہ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کم بخت بابر نے ہماری ولدیت ایک ہی لکھی ہے۔"

عظمیٰ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ بھوتیاں نے خود ہی کہا: "لیکن نہیں، ہمارے سفیر صاحب قانون کے بڑے پابند ہیں۔ وہ کوئی غیر قانونی کام نہیں کریں گے۔ جیسا کلیرنس ہے، ویسا ہی استعمال کرنے کے لیے کہیں گے۔ یا پھر اسے واپس کرنے کا مشورہ دیں گے۔"

وہ سوچ رہی تھی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس کلیرنس کو اچھے داموں فروخت کرنے کے بعد کوئی دوسرا کلیرنس منگوایا جا سکتا تو وہ ایسا ضرور کرتے۔ بھوتیاں نے کہا: "سوچ سوچ کر دماغ تھک جائے گا۔ بہتر ہے سونے کی کوشش کرو۔"

وہ بولی: "یہ کلیرنس ہمارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا ہے نہ نگل سکتے ہیں نہ اگل سکتے ہیں۔"

ایک شخص اپنے عزیز کی قبر پر پھول سجا رہا تھا۔ اس نے برابر ہی کی قبر پر ایک شخص کو دیکھا جو قبر پر پکے ہوئے چاول چھڑک رہا تھا۔ اس پہلے شخص نے طنز سے پوچھا: "تمہارے خیال میں کس وقت تمہارا عزیز قبر سے باہر آ کر یہ چاول کھائے گا؟"

اس نے چاول چھڑکتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا: "جس وقت تمہارا عزیز قبر سے باہر آ کر پھولوں کی خوشبو سونگھے گا۔"

نوجوان اور خوبصورت لڑکی نے اپنے بوڑھے پڑوسی کو اپنی سالگرہ میں شرکت کرنے کی دعوت دی اور اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے کہا:

"انکل آپ جب پانچویں منزل پر پہنچیں تو تم دروازے پر اگر اپنی کہنی سے دستک دینا۔"

بوڑھے پڑوسی نے حیرانی سے پوچھا: "کہنی سے کیوں؟ ہاتھ سے کیوں نہیں؟"

حسینہ نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "تو کیا تم خالی ہاتھ میری سالگرہ میں شرکت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وہ اپنی گڑبڑ زبان میں بول رہی تھی۔ لیکن بھوئیاں اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے لگا تھا۔ اس نے کہا: "شیطان آخر شیطان ہوتا ہے۔ یہاں ہزاروں میل دور چلے آنے کے باوجود ہم سے دشمنی کر رہا ہے۔ کہنے کو اس نے میرے احسان کا جواب دیا ہے لیکن ایسا جواب جو ہم دونوں کو اور زیادہ کرب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔"

وہ بڑی دیر تک دھیمی آواز میں گفتگو کرتے رہے۔ آس پاس بلکہ دُور تک دوسرے مہاجرین اپنی اپنی چادروں اور چار دیواری میں سو رہے تھے۔ جب وہ سنبھلے وہ بھی سونا چاہتے تھے۔ اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ انہوں نے چادر کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکی ایک نوجوان مرد کے ساتھ ان کی طرف آ رہی تھی۔ جہاں پہنچتے ہی مرد نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کلیم الدین بھوئیاں نے کہا: "اندر آ جاؤ۔"

وہ دونوں اندر آ گئے۔ پھر آنے والے نے کہا: "میرا نام علی امام ہے اور یہ میری بہن فرزانہ ہے۔ میں تمام دن شہر میں رہتا ہوں۔ میں پیشے کے اعتبار سے مصور ہوں۔ لوگوں کی تصویریں بناتا ہوں تاکہ کسی بُرے وقت کے لیے ہمارے پاس چار پیسے ہوں۔ ابھی رات کو دیر سے آیا تو فرزانہ نے مجھے آپ کے پرابلم کے متعلق بتایا۔ میں نے سوچا رات زیادہ ہو گئی ہے۔ صبح آپ سے بات کروں گا۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ آپ سے اس کلیرنس کا سودا کر رہے ہیں۔"

"کیا آپ بھی سودا کرنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں، ہمارے پاس کلیرنس آ گیا ہے۔ کل ہم سفارت خانے جائیں گے۔ سوچا کیوں نہ آپ سے باتیں کریں۔ دیکھیے، میں اور فرزانہ سگے بھائی بہن ہیں۔ آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اگر آپ کی بیوی میری بہن فرزانہ بن جائے تو یہ بہن فرزانہ کلیرنس کے مطابق آپ کی بہن بن جائے گی۔ کیا نام ہے آپ کی شریکِ حیات کا؟"

"عظمیٰ! اور میرا نام کلیم الدین بھوئیاں ہے۔"

"مسٹر بھوئیاں! اگر میری بہن عظمیٰ بن کر آپ کے ساتھ جائے گی تو آپ بلا جھجک اس فرضی عظمیٰ کو اپنی بہن کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہزاروں لڑکیوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف بیوی کو بہن نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح آپ کی شریکِ حیات میری بہن بن کر میرے کلیرنس میں جائے گی۔ کیسا مشورہ ہے؟"

کلیم الدین بھوئیاں نے فرطِ عقیدت سے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "بھائی صاحب! آپ نے ہمارے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ اس کلیرنس کی وجہ سے ہماری نیند اڑ گئی تھی۔ ہم ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"آپ آرام سے سو جائیں۔ صبح دس بجے تک ہم سفارت خانے جائیں گے اور وہاں سے روانگی کی تیاری کریں گے۔"

آپس میں بھائی چارگی سے کوئی بات بن جائے تو کام بھی بن جاتا ہے۔ وہ ایک ہفتے کے اندر ہی رملے پاکستان کے شہر لاہور پہنچ گئے۔ وہاں علی امام کے ایک دوست نے ان کا استقبال کیا۔ انہیں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر وہ مغل پورہ کی طرف جانے لگا۔ راستے میں ٹیکسی میں خرابی ہو گئی۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلنے لگے۔ کلیم الدین بھوئیاں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی ملک میں آ گیا ہے۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا ادھر ہی دیواروں پر جلی حرفوں میں اردو زبان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک بنگلہ زبان اس کے دماغ میں نقش رہی تھی۔ دیناج پور ہو یا ڈھاکہ، ہر جگہ اس نے بنگالی زبان کو جلی حرفوں میں دیکھا تھا۔ پھر وہ تانگے کی سواری بھی نئی تھی۔ مغل پورہ کے ایک مکان تک پہنچتے پہنچتے اس نے بے شمار لوگوں کو پنجابی زبان بولتے سنا تھا۔ اس نے اپنے میزبان سے پوچھا: "کیا یہاں تمام لوگ صرف پنجابی بولتے ہیں؟"

میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا: "یہاں کے لوگ صرف اپنے گھروں میں اور آپس کی محفلوں میں پنجابی بولتے ہیں ورنہ ان کے گھروں میں، ان کے شہروں میں جو مہمان آئے، اسی مہمان کی بولی بولتے ہیں۔ یہ اردو پڑھتے ہیں، اردو لکھتے ہیں۔ شہر لاہور اردو کی اشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔"

اس رات عظمیٰ اور بھوئیاں کو ایک الگ کمرا سونے کے لیے دیا گیا۔ تنہائی ملتے ہی بھوئیاں نے پریشان ہو کر کہا: "یہ جگہ بالکل اجنبی سی لگتی ہے۔ ہم نے وہاں کوئی اور پاکستان دیکھا تھا۔ یہاں کوئی اور ملک سا نظر آتا ہے۔ ہم اپنے میزبان پر بوجھ نہیں بن سکتے۔ ہم کل ہی یہاں سے چلے جائیں گے لیکن کہاں جائیں گے؟ پہلے مجھے کوئی کام تلاش کرنا ہوگا لیکن کام کہاں تلاش کروں؟ اپنے میزبان سے ہی مشورہ کرنا ہوگا۔"

دوسرے دن میزبان نے مشورہ دیا: "ہماری عظمیٰ بہن یہاں گھر کی عورتوں کے ساتھ رہیں گی۔ آپ دو چار دن لاہور کی سیر کریں۔ لوگوں سے ملتے جلتے رہیں اور اپنے تعلقات بڑھاتے رہیں۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔"

اس نے مشورے پر عمل کیا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ عظمیٰ کو چھوڑ کر اجنبی شہر میں کہاں کہاں بھٹکتا رہتا۔ بہرحال وہ تنہا لاہور کی سڑکوں کو ناپنے کے لیے نکلا۔ وہ کسی کو اپنے حالات کیا بتاتا۔ اس کی گفتگو اور اس کے لہجے سے ہی لوگ سمجھ لیتے تھے کہ بنگال سے آیا ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو جاتا تو اس سے ہمدردی کی جاتی تھی۔ کم از کم ایک کپ چائے یا ایک گلاس لسی پینے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ لاہور والوں کی زندہ دلی اور مہمان نوازی مشہور ہے۔ وہ مہمان نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ملتے تھے جو اسے بنگالی سمجھنے کے بعد طنزیہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہی ہوتا کہ تم جیسے بنگالیوں نے مشرقی پاکستان کو ڈبو دیا ہے۔

وہ روز اس شہر کی خاک چھانتے رہنے کے بعد انارکلی کی ایک

مت بڑی دکان میں سیلز مین کی ملازمت مل گئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے انگلش میں ایم اے کیا تھا اور انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ [illegible] ایک [illegible] رہائشی طور پر دکان میں رکھا گیا۔ اس نے سب سے تمام [illegible] نے والے غیر ملکی گاہکوں کو بڑی خوبصورتی سے ہینڈل کیا۔ [illegible] [illegible] گفتگو کرتا رہا۔ دکان کے مالک نے خوش ہو کر اسے پانچ سو روپے ماہانہ پر رکھ لیا۔

وہ اپنی تعلیمی [illegible] کے پیش نظر بہت آگے پہنچے خواب دیکھتا [illegible] [illegible] سے مستقل کیا جاگ جاتا۔ پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا تھا۔ اب وہ اپنے میزبان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ جب سے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے پورے پانچ سو اپنے میزبان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میزبان نے پوچھا: یہ کیا؟

اس نے جواب دیا: آپ مجھے مداد آنے جانے کا کرایہ دیتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا دکان کے مالک کے ساتھ کھاتا ہوں۔ بقیہ دو وقت کا کھانا اور منظمی کے تین وقت کا کھانا یہ سارے اخراجات آپ ہی برداشت کرتے ہیں۔

اس نے ان پانچ سو روپوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ یہاں سو روپے میں ایک کمرے کا مکان کرائے پر مل جائے گا۔ آپ باقی رقم سے گھر [illegible] کا سامان خرید لیں۔ اپنا الگ گھر بسائیے۔ اس سلسلے میں کچھ رقم [illegible] قرض دے رہا ہوں۔ جب آپ کی تنخواہ بڑھے گی تو قرض [illegible] کر دیجیے گا۔

یہ مشورہ مناسب تھا۔ اسی محلے میں ایک کمرے کا مکان مل گیا اس کا کرایہ سو روپے تھا۔ باقی رقم سے انہوں نے اپنے گھر کی ضروریات کا سامان خریدا۔ [illegible] سو روپے آنے جانے کے کرائے کے لیے اس کے علاوہ [illegible] رکھ لیے۔ اس نے منظمی کی شلوار قمیص کے لیے کپڑا خرید لیا۔ [illegible] عورتیں منظمی کو ساڑھی میں دیکھ کر مسکراتی تھیں یا آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ پھر ان کے گھر والوں نے بتایا کہ یہاں [illegible] ساڑھی [illegible] بھی نہیں پہنتیں۔ یا پھر اپنے طبقے کی عورتیں خاص تقریبات میں پہنتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ساڑھی کو ہندوؤں کا لباس سمجھتے ہیں۔

منظمی کو یہ بات بری لگی۔ بچپن سے اب تک اس نے بنگال [illegible] کو ساڑھی پہنتے دیکھا تھا۔ ہندوستان کی مشرقی سرحد تک ساڑھی پہنی جاتی ہے۔ [illegible] شریف عورتوں کا کوئی [illegible] نہیں [illegible] [illegible] لیکن سمجھ سکی ہیں۔

[illegible] سلسلے میں کسی سے بحث نہ کر سکا۔ جب باپ منظمی کے [illegible] [illegible] کے مطابق زندگی گزار سکے۔ جب کسی دکان [illegible] محلے والوں کے سامنے بنگلہ دیش کے بہاریوں کا ذکر کرتا [illegible] [illegible] کے سلسلے میں کوئی تجویز پیش کرتا تو سب سے پہلے دکان کا مالک اعتراض کرتا تھا: دیکھو بھئی! یہاں صرف دکانداری کرو۔ یہاں سیاست نہیں چلے گی۔ سیاست کرنا ہے تو ملازمت چھوڑ دو۔

محلے کے لوگ بنگلہ دیش کے بہاریوں سے ہمدردی کرتے تھے لیکن انہیں یہاں بلانے کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟ وہ نہیں جانتے تھے اور نہ ہی حکومت تک اپنی آواز پہنچانا جانتے تھے۔ کلیم الدین جو باتیں انہیں [illegible] کہتا تھا: کیا حکومت نہیں جانتی ہے کہ وہاں تک آواز پہنچائی جائے جنگی قیدی واپس آ چکے ہیں۔ ہندوستان کی جیلوں میں مقید رہنے والے کئی ہزار سپاہیوں کو یہاں لایا گیا ہے لیکن بنگلہ دیش کے محصورین کو اس طرح بھلا دیا گیا ہے جیسے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں اور اب کسی کے متعلق سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔

چھ ماہ بعد اس کی تنخواہ سات سو روپے ہو گئی۔ ایک سال بعد منظمی نے ایک بہت ہی خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ بیٹی کو دیکھ کر [illegible] کو احساس ہوا کہ وہ سات سو روپے ماہوار پر اکتفا کر رہا ہے جبکہ ایک باپ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی جہیز کے لیے سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے دن اس نے وزارت داخلہ کے چیف سیکرٹری کو ایک خط لکھا ـــــ

جناب عالی! میرا نام کلیم الدین محبوب ہے اور میں سابقہ مشرقی پاکستان دیناج پور کے ایک معزز مجسٹریٹ سلیم الدین محبوب کا بڑا بیٹا ہوں۔ میرے والد والدہ اور کنبے کے تمام افراد پاکستان کی [illegible] میں ثابت قدم رہے اور آخر میں دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ میں بڑی مشکلوں سے

جہنم کی آزادی

ایک بار برطانیہ کے وزیراعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ہم ڈنمارک اور ناروے کی آزادی کے لیے لڑیں گے۔ بیلجیم کی آزادی کی خاطر لڑیں گے۔ ہم سوئٹزرلینڈ کی آزادی کے لیے لڑیں گے ہم [illegible] وزیراعظم کی پرجوش تقریر ہو رہی تھی۔ سب نے [illegible] [illegible] حزب اختلاف کے ایک ممبر نے جل کر کہا۔ اور ہم جہنم کی آزادی کی خاطر لڑیں گے:

وزیراعظم نے مسکراتے ہوئے اس فقرے کا جواب دیا:

"ضرور، ضرور! ہر شخص کو اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑنا چاہیے:"

ن بچا کر اپنی شریکِ حیات کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بنگالی میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے لیکن انگلش لینگویج میں ایم اے کیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرے والد مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک اچھی سی ملازمت عطا کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھے میرے والد کی طرح پاکستان کا وفادار پائیں گے۔"

اسے امید تھی، جواب "ہاں یا نہ" میں ضرور موصول ہوگا۔ ایک ماہ گزر گیا پھر دو ماہ گزر گئے، جواب نہیں ملا۔ اس نے یاد دہانی کے طور پر خط لکھا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ انتظار کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا کہ کب تک ہوگا۔ ایک برس گزر گیا۔ پھر دوسرا برس ختم ہونے والا تھا کہ اسے جوابی خط موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا۔ "مسٹر کلیم الدین بھوئیاں! آپ اپنی شناخت کے لیے مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں سے تعلق رکھنے والے اہم کاغذات لے کر دفتر میں حاضر ہو جائیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے وہ خط عظمیٰ کو دکھایا اور کہا: "یہ لوگ ہم سے ضروری کاغذات طلب کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے خط میں تفصیل سے لکھ دیا تھا کہ کس طرح ہمارا سارا کنبہ قتل ہو گیا اور گھر برباد ہو گیا ہے۔ میں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر آیا ہوں۔ ایسی صورت میں ضروری کاغذات کیسے سنبھال رکھ سکتا ہوں۔"

عظمیٰ نے کہا: "آپ وہاں جا کر انہیں سمجھائیں۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

اس نے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اب وہ ڈھائی برس کی ہو گئی تھی۔ ماں باپ کے درمیان بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اس نے اسے گود میں لیتے ہوئے کہا: "اسلام آباد جانے اور آنے میں دو دن ضرور لگیں گے۔ کام بنتا نظر آیا تو اور کچھ دن لگ جائیں گے۔ میں اپنی بچی کے بغیر کیسے رہوں گا۔"

"پھر مجھے اور بیبی کو بھی ساتھ لے چلو۔ ہماری تفریح ہو جائے گی۔ میں نے بہت سے پیسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اتنی رقم ہے کہ ہم گھوم پھر کر بھی آ سکتے ہیں۔"

اس نے دکان سے چار دنوں کی چھٹی لی۔ پھر عظمیٰ اور بیبی کے ساتھ پنڈی پہنچ گیا۔ وہاں ایک سستے سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ دوسری صبح بیوی اور بیٹی کو ہوٹل میں چھوڑ کر اسلام آباد چلا گیا۔ جس دفتر میں اسے طلب کیا گیا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے اپنی مجبوریاں بیان کیں۔ جواب ملا: "مسٹر! آپ کی مجبوریاں درست ہو سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ہمیں بخوبی علم ہے لیکن کوئی بھی شخص آ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کا بیٹا ہے تو ہم کیسے تسلیم کر لیں گے؟"

"ٹھیک ہے، آپ تسلیم نہ کریں لیکن ایک بنگالی مہاجر کی حیثیت سے، جو محبِ وطن ہے، جو اپنی علمی صلاحیتوں کو پاکستان کے لیے کام میں لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ ہزاروں میل دور سے آیا ہے، تو اس کے جذبوں کو دیکھیے۔ آپ مجھے کوئی سی ملازمت دے سکتے ہیں۔"

"ایسے جذبے اور علمی صلاحیتیں رکھنے والے پاکستان میں بے شمار نوجوان ہیں۔ ہمارے ہاں اگر ویکینسی ہوتی تو ضرور رکھ لیا جاتا۔ وہ تو مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں کی خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر کسی شعبے میں کوئی اسامی نکالنے والے تھے۔ دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔"

"اگر آئندہ کوئی ویکینسی ہو تو میں امید رکھوں؟"

"مسٹر! یہاں کوٹہ سسٹم ہے۔ پنجاب والوں کے لیے، سندھ والوں کے لیے، سرحد والوں کے لیے، بلوچستان والوں کے لیے الگ الگ کوٹہ مقرر ہے۔ اس کے مطابق وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔"

"یعنی ایک شخص جو بہترین علمی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ایسے شخص کو اس لیے سرکاری طور پر ملازم نہیں رکھا جائے گا کہ اس کا تعلق پنجاب، سندھ، سرحد یا بلوچستان سے نہیں ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کی ابتدا سے یہاں ایسے لاکھوں افراد ہیں جن کا تعلق چاروں صوبوں میں کسی سے نہیں ہے۔ وہ صرف پاکستانی ہیں اور ہم بنگلہ دیش سے آنے والے بھی کسی صوبے سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ ہم کس کوٹے والے کے کھاتے میں جائیں گے؟"

"مسٹر! آپ فضول بحث کر رہے ہیں۔"

"اگر یہ بحث فضول ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لیجیے کہ کوئی بھی ملک اسی وقت ترقی کرتا ہے جب نوجوانوں کو تعلیمی اور علمی صلاحیتوں کی بنا پر ملکی مشینری کا اہم پرزہ بنایا جاتا ہے اور جہاں کوٹہ سسٹم کے مطابق نوجوانوں کو اسکولوں، کالجوں میں داخلہ دیا جاتا ہے اور سرکاری شعبوں میں ملازمتیں دی جاتی ہیں۔ ایسے ملکوں میں بہترین صلاحیتیں پس پشت رہ جاتی ہیں، اور ناکارہ لوگ سفارش کے بل بوتے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

"یہ سرکاری دفتر ہے، کوئی جلسہ گاہ نہیں ہے جہاں آپ تقریر فرما رہے ہیں۔ ہم نے کہہ دیا، آپ کو ملازمت نہیں دے سکتے۔ اگر آپ واقعی مجسٹریٹ سلیم الدین بھوئیاں مرحوم کے صاحبزادے ہیں تو ثبوت پیش کریں۔ بس اب چلے جائیں۔ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔"

وہ جب دفتر سے باہر آیا تو بہت بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے؟ کیا ساری عمر ایک دکان کا سیلزمین بن کر گزارے؟ کیا اسی کے لیے اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی؟ مایوسی، ناکامی، غصے اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے وہ بس میں سوار نہیں ہوا۔ وہاں سے پیدل چلتا ہوا اور سوچتا ہوا زیرو پوائنٹ تک آیا۔ پھر وہاں سے بس میں سوار ہو کر پنڈی کے جنرل پوسٹ آفس پہنچا۔ وہاں سے

پچاس عدد لفافے خریدے۔ بازار سے ایک پیڈ خریدا۔ پھر ہوٹل میں آ بیٹھ گیا۔ عظمیٰ نے اس سے سوال کیا۔ اس نے مختصراً اپنا کام کی داستان سنا دی۔ پھر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا: یہ خط کسے لکھ رہے ہو؟

پاکستان کے تو سارے اداروں کو لکھ رہا ہوں۔ بڑے بڑے شہروں میں جتنے وکیل، بیرسٹر اور جج صاحبان ہیں۔ ان سب کے نام یہ خط پوسٹ کروں گا:

ان سب کے نام اور پتے کس طرح حاصل کرو گے؟

میں کسی کے اصلی نام اور پتے پر خط ارسال نہیں کروں گا۔ یہ تمام خطوط تمام شہروں کے سٹی کورٹ اور ہائی کورٹ وغیرہ کے تمام جج صاحبان اور [illegible] تمام وکیلوں اور بیرسٹروں کے پاس پہنچیں گے۔ ان تک پہنچانے کے لیے اصلی نام اور پتے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وہ تمام دن خط لکھتا رہا۔ کبھی عظمیٰ سے دل بہلاتا رہا۔ شام ہوئی تو اس نے تقریباً پچیس خطوط لکھے۔ تمام لفافوں کو ایک تھیلے میں ڈالا۔ پھر عظمیٰ اور بچی کے ساتھ تفریح کے لیے نکل گیا۔ اس نے پوسٹ آفس پہنچ کر وہ لفافے پوسٹ کر دیے۔ وہ رات انہوں نے [illegible] دوسرے دن [illegible] سے فارغ ہوئے۔ تمام کے [illegible] تو عظمیٰ نے [illegible] یادگارِ پاکستان [illegible] کہا۔ ہم وہاں جائیں گے۔ پھر شاہی قلعہ اور شاہی مسجد بھی دیکھیں گے۔

وہ پہنچے تو شام کا وقت تھا۔ یادگارِ پاکستان کے [illegible] باغیچے میں بڑی چہل پہل تھی۔ مین گیٹ پر [illegible] ایسے شخص [illegible] ہوئی نظروں سے [illegible] عظمیٰ کو دیکھا تو اس پر نظریں جم کر رہ گئیں۔ وہ [illegible] کے بعد [illegible] تھی۔ [illegible] امرتسر [illegible] فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ان فلموں کا اثر [illegible] لڑکیاں [illegible] لگی تھیں۔ [illegible] ماتھے پر بندیا سجانے لگی تھیں۔ عظمیٰ کے ماتھے پر بھی [illegible] تھی۔ [illegible] باندھا تھا کہ دور ہی سے [illegible] پنجابن ہو جاتی تھی۔

بنگال کی زمین پر کہیں بھی قدم رکھو ہر طرف [illegible] ہر طرف پھولوں کی [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] پسند تھا۔ اسے مختلف [illegible] گلاب [illegible] نہیں چاہتا تھا۔ وہ لاہور کے گلابوں کا

شہر کی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے یادگارِ پاکستان کے اوپر کی بلندی پر پہنچے۔ وہاں سے شہر کو دُور دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ حدِ نظر تک نئے اور پرانے مکانات دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخی عمارتوں کے علاوہ صدیوں پرانے اونچے نیچے شکستہ مکانات ہیں۔ ایسی پرانی اور بوسیدہ عمارتیں بھی ہیں جو آگے کی طرف جھکی جا رہی ہیں جیسے تاریخ کی کمر جھکی جا رہی ہو۔

ہر دور میں شاہوں اور دولت مندوں کو نوازا جاتا ہے۔ آج کے دور میں بھی تاریخی عمارتوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ ان کو خوب سے خوب تر بنا کر رکھا جاتا ہے لیکن وہ بوسیدہ مکانات [illegible] عمارتیں جو عوام کی ملکیت میں ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ [illegible] کے لیے ان عمارتوں کی بھی مرمت کی جاتی [illegible] عمارتوں سے حوالی تاریخ کے مختلف باب کھولے جاتے تو تباہیوں کی جگہ [illegible] یادگارِ پاکستان [illegible] شاہی مسجد کے [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] گلبرگ اور [illegible] کالونی جیسے مہنگے علاقوں کی طرف بنایا [illegible] جا رہا ہے [illegible] جہاں غربت ہے [illegible] لوگ [illegible] بات بات پر شکر کرتے ہوئے زندہ دلانِ لاہور [illegible] کہتے ہیں۔

عظمیٰ اور بچوں [illegible] یادگارِ پاکستان کے احاطے سے نکل کر شاہی مسجد کی طرف گئے۔ [illegible] بچی [illegible] اس کی گود سے بچی کو لیتے ہوئے کہا۔ رات کو قلعے میں [illegible] ہو سکتی [illegible] گے۔ اب چلتے ہیں:

وہ شاہی مسجد کے دوسری طرف پہنچے۔ دوسری طرف ہیرا منڈی تھی۔ [illegible] عظمیٰ کو ادھر لے جانا نہیں چاہتا تھا ——— درمیان سے ایک اور راستہ [illegible] کی طرف جاتا تھا۔ وہاں سے گزر کر وہ کسی بس یا تانگے میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن تک جانا چاہتے تھے۔ وہاں سے پھر انہیں [illegible] کے لیے بس مل جاتی۔ [illegible] ایک زبردست غلطی ہوئی۔ وہ عظمیٰ کو ہیرا منڈی کے [illegible] بازار سے بچا رہا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا [illegible] تنگ اور تاریک راستوں سے گزر کر بھی اسی بازار تک پہنچتے ہیں۔

وہ اس ویران اور تنگ [illegible] راستے سے گزر رہے تھے۔ چاروں طرف سے [illegible] پہلے [illegible] سے [illegible] وہ چونک گیا۔ اس کی [illegible] لگے۔ [illegible] اس سے پہلے ہی کسی [illegible] اس کی [illegible] ہوا۔ [illegible] وہ اپنی ماں اور اپنے باپ کو پکارتی ہو۔ عظمیٰ کی چیخ بھی سنائی دی۔ وہ [illegible] تمام [illegible] قوتوں [illegible] چاہتا تھا۔ [illegible] اور بچی کو [illegible] چاہتا تھا لیکن [illegible] زمین پر گر پڑا۔ [illegible]

ہوگئیں۔ دماغ بے حس ہوگیا۔

جب سے ہوش آیا تو اس نے خود کو کسی چٹان پر محسوس کیا۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ واقعی وہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر اسے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا: عظمیٰ کہاں ہے؟ بلی میری بچی؟

نرس نے آ کر کہا: شور نہ مچائیں۔ دوسرے مریض سو رہے ہیں۔

میری بیوی اور میری بچی کہاں ہیں؟

تمہارے ساتھ ایک عورت یہاں لائی گئی تھی۔ وہ اب زنانہ وارڈ میں ہے۔

وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ زنانہ وارڈ کہاں ہے؟ پلیز مجھے راستہ دکھا دو۔

نرس نے اس کی رہنمائی کی۔ اس وارڈ تک جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے ہی عظمیٰ دکھائی دی۔ اس کا سر اور چہرہ پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی: میں کچھ نہیں جانتی۔ میری بچی کہاں ہے مجھے بتاؤ؟

بھوتیاں دوڑتا ہوا عظمیٰ کے پاس پہنچا۔ اس کی کٹی ہوئی زبان کوئی نہیں سمجھ رہا تھا: بھوتیاں! ہماری بچی، ہماری بلی نہیں ہے۔ پتا نہیں کون اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔

انسپکٹر نے کہا: دیکھو، یہ اسپتال ہے، یہاں شور نہ مچاؤ۔

بھوتیاں نے غصے سے پوچھا: اگر آپ کی بیٹی کو کوئی اغوا کر لیتا تو آپ [illegible]؟

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی انسپکٹر نے اسے ایک ہاتھ سے دھکا دیتے ہوئے کہا: [illegible]۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچی گم ہوئی ہے۔ رپورٹ لکھواؤ، اپنا بیان دو۔

عظمیٰ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے کہا: پتا نہیں ہم کتنی دیر تک ہسپتال میں بے ہوش پڑے رہے۔ میری بچی کو لوگ کہاں لے گئے۔ آپ انہیں تلاش کیجیے۔ بیان ہم بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم سے جو پوچھنا ہے پوچھ لیجیے۔ ہو سکے تو ہمیں مغل پورہ کسی طرح پہنچا دیجیے۔ وہاں ہمارے مکان میں بچی کی تصویر ہے۔

انسپکٹر نے کہا: اے یہ کیا گڑبڑ گڑبڑ بول رہی ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیم الدین بھوتیاں سمجھانے لگا۔ انسپکٹر نے کہا: اچھی بات ہے۔ میں اپنے دو سپاہیوں کو تمہارے ساتھ مغل پورہ تک بھیج سکتا ہوں۔ جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔

انسپکٹر صاحب! کیا آپ ہمارے ساتھ چار قدم چل کر اسپتال کے باہر نہیں جا سکتے؟ آپ کو دیکھ کر کوئی بھی ٹیکسی والا رک جائے گا۔ ہم فوراً چلے جائیں گے۔

ان کی باتوں کے دوران عظمیٰ بلک کر پکار رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو نوچ رہی تھی۔ پھر وہ چکرا کر گرنے لگی۔ بھوتیاں نے فوراً ہی اسے سنبھال لیا۔

* * *

جن کے پاس کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے ایک سے دوسرا جوڑا نہیں ہوتا، سر چھپانے کے لیے کوئی چھت نہیں ہوتی، ایسے لوگ سکۂ رائج الوقت کے بغیر کیسے زندگی گزارتے ہوں گے؟ نین تارا اور خسرو کو چھت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے [illegible] تھے۔ ان کے پاس بڑودیدی کے دیے ہوئے کچھ روپے تھے۔ جنہیں پاکستانی کرنسی میں تبدیل کر لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کم از کم پینتیس ہزار روپے کے زیورات تھے۔ وہ کہیں بھی پناہ حاصل کر سکتے تھے۔

اجنبی شہر کے لوگ ایسے بے مروت بھی نہیں ہوتے تھے کہ رقم ملتی ہو اور کرایہ پر مکان نہ دیں۔ ایک کمرے کا مکان انہیں کرائے پر مل ہی گیا۔ مالک مکان نے یوں تو دور ہی سے بھانپ لیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش سے آئے ہیں۔ پھر بھی اس نے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا اور وہ سیدھے سادے انداز میں جواب دیتے رہے۔ دوسرے دن وہ نین تارا کو مکان میں چھوڑ کر اس علاقے کو اچھی طرح دیکھنے سمجھنے کے لیے نکل گیا۔ خیال تھا کہیں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو ہزاروں روپے کے زیورات تھے انہیں وہ وہاں ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اسے الیکٹریکل گڈز کی خرید و فروخت کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ بجلی کا کاریگر بھی تھا۔ اگر ڈپلومہ ہوتا تو وہ الیکٹریکل انجینئر کہلاتا۔ کسی سند کے بغیر اس نے خود کو بجلی مستری کی حیثیت سے پیش کیا۔ ایک دکان میں اسے ملازمت مل گئی۔

دکاندار تنخواہ کم دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ملازمت قبول کر لی۔ وہ وہاں رہ کر بازار میں لین دین کے طور طریقے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پہلے ایک ملازم کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ تجربات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی۔ ان دنوں سونے کا بھاؤ کچھ بڑھ گیا تھا۔ جب اس نے نین تارا کے زیورات کا ایک سیٹ رکھ کر باقی تمام کو فروخت کیا تو اسے چالیس ہزار روپے ملے۔ اس رقم سے اس نے لالو کھیت میں ایک دکان کرائے پر لی۔ کورنگی میں ایک پلاٹ خرید کر ایک کمرے کا مکان بنا لیا۔ ایک سال کی ملازمت کے دوران کاروبار میں ہاتھ پاؤں پھیلانا اچھی طرح آگیا تھا۔ دکان میں بجلی کا سامان فروخت کرنے کے علاوہ وہ بڑی بڑی زیر تعمیر کوٹھیوں کی الیکٹریکل وائرنگ کے ٹھیکے لینے لگا۔ اس کے لیے اس نے باقاعدہ ملازم رکھے۔ کام اتنی محنت سے چلنے لگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دن پھرنے لگے۔ صرف پانچ سال کے عرصے میں اس نے گلشن اقبال میں ایک بہت بڑا پلاٹ خریدا اور وہاں ایک خوبصورت سی کوٹھی بنانے لگا۔

[illegible] کو ڈھونڈنے کے لیے ضروری نہیں کہ بے ایمانی کی جائے [illegible] ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ لوگ دیانت داری سے کاروبار [illegible] معقول منافع حاصل کرتے ہیں۔ حسن دو کا بھی یہی دستور تھا [illegible] عمارتوں میں کنسیلڈ وائرنگ کے جو ٹھیکے لیتے تھے ان میں وہ صحیح مال استعمال کرتا تھا۔ کچا کام کبھی نہیں کرتا تھا بلکہ [illegible] کے مطابق مقررہ وقت پر اپنا کام ختم کر دیتا تھا۔ کام بھی کھرا کرتا تھا۔ پیسے بھی کھرے لیتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہوتا [illegible]۔ وہ جس دوران جن لوگوں سے ملتا، ان سے بنگلہ دیش میں ان محصور بہاریوں کا ذکر ضرور کرتا اور ان سے اپیل کرتا کہ سب متحد ہو کر تحریک چلائیں۔ حکومت سے درخواست کریں کہ جن لوگوں نے پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے اپنے گھر اپنی زمینیں چھوڑ دیں، اپنا خون بہایا، اپنی عورتوں کی عزتیں داؤ پر لگایا، آج وہ پاکستان آنے کا حق رکھتے ہیں اور ان کا یہ حق ادا کیا جائے۔

لیکن ایک بے حسی طاری تھی۔ لوگ اپنی اپنی ذات کی تعمیر میں لگے تھے انہیں پہلے اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد تن ڈھانپنا تھا۔ اس کے بعد بیوی بچوں کی فکر تھی ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے مستقبل کو روشن اور محفوظ بنائے رکھنے کی فکر لاحق رہتی تھی۔ [illegible] اپنے مسائل سے آزاد نہیں تھا۔ پھر بنگلہ دیش کے بہاریوں کے متعلق سوچنے کی کسے فرصت تھی۔ سب ہی ہمدردی کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کے حالات پر افسوس کرتے تھے۔ وعدہ کرتے تھے ان کے لیے ضرور کچھ کریں گے لیکن وہ وعدہ وفا کرنے کا وقت نہیں آتا تھا۔

[illegible] اس طویل مدت میں [illegible] پاکستان میں [illegible] جو لوگ یہاں۔ لاکھوں کی تعداد میں [illegible] سے [illegible] تو [illegible] چھوڑ [illegible] کیا؟ [illegible] سوالات [illegible] [illegible] کے [illegible]

[illegible] یہاں آ کر [illegible] کے [illegible] آپ کے علاوہ [illegible] سب سے بڑا [illegible] اس شہر [illegible] [illegible] کا [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کے [illegible] دیکھ کر [illegible] [illegible] ہیں [illegible] پاکستان [illegible] تو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کے کاشتکار لاکھوں کی تعداد میں تھے

ہندو بنیے کچا پٹ سن کلکتہ کی جوٹ ملوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان بہاریوں نے مشرقی پاکستان میں قدم رکھا تو جوٹ ملیں چلنے لگیں۔ جوٹ ملیں ہوں، پیپر مل ہوں، ٹیکسٹائل فیکٹریز ہوں یا ریلوے کے شعبے ہوں۔ جہاں جہاں پہیہ چلانے کی بات آئی ان پہیوں کو یہ بہاری ہی برسوں تک چلاتے رہے کبھی انہیں رکنے نہیں دیا۔

صلاحیتیں خواہ کسی قوم میں ہوں، اگر ان صلاحیتوں کو پنپنے [illegible] دیا جائے تو وہ رنگ خود بخود لے آتی ہیں۔ کراچی ایک بندہ پرور شہر ہے یہاں جو لوگ اپنی محنت اپنی ہنرمندی اور اپنی علمی صلاحیتیں لے کر آتے ہیں [illegible] یہاں پھلتے پھولتے [illegible] خاطر خواہ موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے [illegible] کی کثیر تعداد اس شہر میں ہے۔ [illegible] رئیس امروہوی نے [illegible] ایک بہت بڑے علاقے میں آباد کیا ہے [illegible] کو کبھی فروش نہیں کرتے لوگ اس علاقے [illegible] رہتے ہیں۔ [illegible] زندگی میں [illegible] کالونیاں [illegible] محمد مصطفیٰ [illegible] سرفروشان [illegible] کالونیاں ہیں۔ جنہیں پلاٹ فروخت [illegible] قائم کیا ہے۔ یہیں [illegible] کی آبادی میں ایسی [illegible] ہے [illegible] کسی سیاسی رہنما یا سماجی رہنما [illegible] ہستی [illegible] اس بات کا واضح ثبوت ہے [illegible] پاکستان کے محب وطن بہاریوں کو یہاں لائے اور آباد [illegible] شخصیت [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] کی کوئی [illegible] ان کے [illegible] جاتی

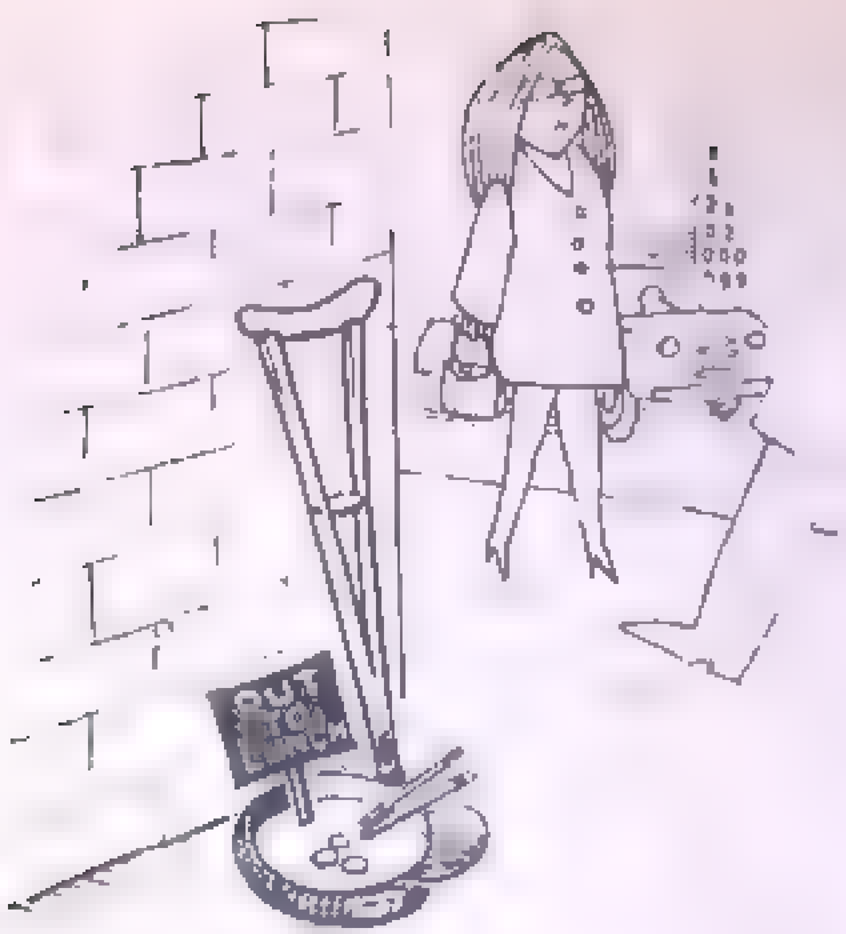

بہرحال بارہ برس کے عرصے میں جو حوصلہ مند لوگ دوسری ہجرت کے زخم بھر رہے ہیں اور جیتے جاگتے ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ بارہ برس کے عرصے میں خسرو نے بھی بے پناہ ترقی کی۔ اس نے گلشن اقبال کی کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ ڈیفنس میں ایک بہت بڑی عالی شان کوٹھی خرید لی۔ اب خسرو اور نین تارا کے لیے الگ الگ نئے ماڈل کی کاریں تھیں۔ ان کے بچوں کو اسکول لے جانے کے لیے بھی الگ کاریں موجود رہتی تھیں۔ اونچی سوسائٹی کی بڑی بڑی تقریبات میں انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ اکثر دعوت دینے والوں کو صورت شکل سے پہچانتے نہیں تھے۔ بس ان کے نام، عبارت میں پڑھ لیتے تھے یا ٹی وی پر دیکھ لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک معروف شخص نے اپنے ہاں بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس پارٹی میں نین تارا کا سامنا اپنے دونوں بھائیوں طارق اور حامد سے ہو گیا۔ حامد نے ایک طویل عرصے سے اپنی بہن کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بارہ سال پہلے طارق نے دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ جس طرح بڑی بڑی پارٹیوں میں چھوٹے لوگ کسی بڑی شخصیت کا سہارا لے کر گھس آتے ہیں، اسی طرح نین تارا اور خسرو بھی آئے ہیں۔ اس نے چھوٹی بہن اور بہنوئی میں جو نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان پر غور نہیں کیا کہ انہوں نے کتنا عمدہ لباس پہنا ہوا ہے ان کے چہروں پر کتنی رونق ہے۔ وہ ایسے پُراعتماد تھے جیسے منزل بہ منزل اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتے وہاں تک چلے آئے ہوں۔ طارق نے قریب آ کر آہستگی سے پوچھا: ”تارا! تم یہاں؟ مگر کیسے؟“

”کیا آپ کو اعتراض ہے؟“

”نہیں، بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔“

نین تارا نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: ”ویسے تو میں اپنے ذاتی معاملات پر کسی سے گفتگو نہیں کرتی ہوں لیکن آپ کو جواب دے دوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ کوئی راتوں رات امیر بننے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے۔ کوئی محنت اور مشقت کے ذریعے ایک مدت کے بعد یہ مقام حاصل کرتا ہے۔ آپ نے ایک مالدار عورت سے شادی کر کے صرف دو برس کے اندر اونچی سوسائٹی میں اپنے لیے جگہ بنائی، ہم بارہ برس کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔“

طارق نے خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”اس کے تیور وہی پہلے جیسے ہیں۔ کیا اسے تم نہیں سمجھا سکتے کہ ایسی محفلوں میں مسکرا کر باتیں کرنا چاہیے۔“

خسرو نے جواب دیا: ”پہلی بات تو یہ کہ کوئی شریف عورت کسی ایرے غیرے سے مسکرا کر بات نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ کہ آپ ہمارے کون ہیں اور ہم کس رشتے سے مسکرا کر باتیں کریں۔ پہلے آپ اپنی شناخت پیش کیجیے کہ آپ کون ہیں؟ اگر آپ میری بیوی کے بھائی ہیں تو ہمارے لیے لکیریں کھینچ لینے کے بعد پہاڑ کی اونچی چوٹی پر جا کر کیوں بیٹھ گئے تھے اور وہاں بیٹھ کر ہماری پستی کا احساس ہمیں کیوں دلا رہے تھے؟“

نین تارا نے کہا: ”ہم بھی بڑی جاں فشانی کے بعد اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اور یہاں آپ کے سامنے آ کر آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو شخص اپنے ماں باپ کو بھول جائے، خونی رشتوں سے انکار کر دے اور اپنی شناخت بدل دے، اس سے ہم کس رشتے سے ملیں۔ اگر ہم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر آئیے اس بھری محفل میں ہم یہ اعلان کریں، کہ ہم مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اور ہم بہاری ہیں۔ کیا اس بات کو آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے سسرال والے برداشت کر سکیں گے؟“

وہ تذبذب میں کبھی بہن کو اور کبھی بہنوئی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا: ”بات جتنی بڑھاؤ بڑھتی جائے گی۔ اس سے بھلا کیا حاصل ہوگا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اس پر خاک ڈالو۔ آؤ، میں تمہیں تمہاری بھابی سے ملاؤں۔“

نین تارا انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسی وقت ایک فربہ اندام خاتون وہاں پہنچ گئیں۔ وہ قد آور تھیں۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے ایسی پھیلی ہوئی تھیں کہ تین عورتوں کی جگہ گھیری ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی طارق یوں مستعد ہو گیا جیسے کسی افسر کے آتے ہی اس کا ماتحت اٹینشن ہو جاتا ہے۔ اس نے مسکرا کر خوشامدانہ لہجے میں کہا: ”بیگم! اچھا ہوا آپ آگئیں۔ میں ابھی نین تارا کو آپ کی طرف لانے والا تھا۔ آپ نے پہچانا۔ یہ ہماری نین تارا ہے۔“

بیگم نے اپنے ماتھے پر بل ڈالے جیسے سوچ رہی ہوں۔ یاد کر رہی ہوں کہ نین تارا کون ہو سکتی ہے اور نین تارا سوچ رہی تھی۔ آخر ہماری ان بھابی میں ایسی کون سی بات تھی کہ بھائی جان نے ان سے شادی کی۔ ہاں ایک بات ضرور تھی۔ ان کے گلے میں جو نیکلس تھا اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، بیش قیمتی تھا۔ بیگم نے ناگواری سے کہا۔ ”طارق! میں نے کتنی بار کہا، مجھ سے پہیلیاں نہ بجھوایا کرو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ یہ کون ہیں!“

اسی وقت ایک شخص مائیک کے سامنے پہنچ کر بلند آواز میں کہنے لگا: ”خواتین و حضرات، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمیشہ ہی اس تقریب میں کسی ایسے جوڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے جو پرکشش اور باوقار ہو اور مہمانوں کے ہجوم میں نمایاں ہو۔ اس تقریب کا جشن اب تک ہم فرد فرداً آپ کی رائے معلوم کرتے رہے ہیں۔ مگر اس بار جس خوش نصیب جوڑے کو منتخب کیا گیا ہے وہ ہے لیڈی آف دی ایوننگ مسز تارا نعیم:“ چاروں طرف سے تالیاں گونجنے لگیں۔ اس کے بعد اعلان کرنے والے نے کہا: ”اور ان کے ساتھ ڈیشنگ پرسنالٹی مسٹر نعیم الدین خسرو:“ تالیاں پھر گونجنے لگیں۔ ان دونوں کو مائیک کے سامنے آنے کے لیے کہا گیا۔ نین تارا نے مسکراتے ہوئے اپنی بھابی سے کہا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے

گا کہ میں کون ہوں اور آپ کے مجازی خدا سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

طارق نے پریشان ہو کر کہا: "نہیں نین تارا! تم ایسا نہیں کرو گی۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ میری باتوں میں آپ لوگوں کا نام ہرگز نہیں آئے گا۔"

وہ خسرو کا ہاتھ تھام کر تالیوں کے شور میں مہمانوں کے ہجوم سے گزرتی ہوئی مائک کے سامنے آ گئی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون اسٹیج کے قریب ہی مائک کے سامنے آ کر کہنے لگی: "خواتین و حضرات! میں نے سب سے پہلے انہیں ووٹ دیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسز تارا نعیم کے حسن میں سنگھار ہیں، ان کے پہناوے میں نہایت ہی سادگی ہے۔ بھرپور شرقیت ہے۔ ان سے میرا سوال ہے۔ مسز تارا نعیم! کیا آپ نے اس تقریب میں منفرد اور نمایاں نظر آنے کے لیے یہ سادگی اختیار کی ہے؟"

خاتون یہ سوال کر کے ان سے ہٹ گئیں۔ مجمع میں شامل ہو گئیں۔

نین تارا نے کہا: "میں بناوٹ کی عادی نہیں ہوں۔ سادگی میری گھٹی میں اور میری مٹی میں شامل ہے۔ شاید آپ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں اور میرے شوہر آج سے بارہ برس پہلے پاکستانی مہاجر کی حیثیت سے بنگلہ دیش سے آئے تھے۔ بنگال کی سادگی مشہور ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں غربت ہے۔ ہیرے جواہرات کے زیورات بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایک زمانے سے وہاں کے سنگھار میں اور ان کے پہناوے میں سادگی چلی آ رہی ہے۔ میرا تعلق ایک بہاری خاندان سے ہے لیکن میں نے بنگال کی مٹی میں جنم لیا۔ وہاں کی ہواؤں میں سانس لیتی رہی اور وہاں کی عورتوں سے متاثر ہوتی رہی۔ یہاں میں جس تقریب میں بھی جاتی ہوں، وہاں ایک ایسی بہاری عورت کی نمائندگی کرتی ہوں جو بنگال کی خوبیوں کو اپناتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی صوبے کی خوبیوں کو اپنانا، انسان دوستی کے مترادف ہے لیکن اپنے صوبے کی شناخت چھوڑ کر کسی دوسرے صوبے کی شناخت اختیار کر لینا، یہ اپنی ذات سے اور اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آباؤ اجداد کے لہو سے سراسر انکار کرنا ہے اور ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

وہ دُور کھڑے ہوئے اپنے بھائی طارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک نوجوان عورت نے مائک کے پاس آ کر کہا: "خواتین و حضرات! میں مسز تارا نعیم سے سوال کرتی ہوں۔ ان کی لانبی، سیاہ اور گھنی زلفوں کا راز کیا ہے؟ یہ کون سا شیمپو اور کون سا ہیئر آئل استعمال کرتی ہیں؟"

یہ سوال کر کے وہ نوجوان عورت وہاں سے ہٹ گئی۔ مجمع میں شامل ہو گئی۔ نین تارا نے کہا: "میں جب سے پیدا ہوئی ہوں تب سے ناریل کے تیل میں سرسوں کا تیل ملا کر اپنے سر میں لگاتی ہوں۔ آج تک میں نے کوئی خوشبودار تیل یا کوئی شیمپو استعمال نہیں کیا۔ یہ لانبی، سیاہ اور گھنی زلفیں بھی بنگال کا عطیہ ہیں۔"

ایک شخص نے مائک کے پاس آ کر سوال کیا: "مسز نعیم! بنگال کی لڑکیوں کو بچپن ہی سے رقص و موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیا آپ نے بنگال کی خوبیوں میں سے فنونِ لطیفہ کی کوئی خوبی اپنائی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم آپ سے کوئی گیت سننا ضرور چاہیں گے۔"

یہ بات سنتے ہی چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ سب اس کی تائید کرنے لگے۔ نین تارا سے گیت سننے پر اصرار کرنے لگے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی: "یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بنگال میں رہے وہ موسیقی اور رقص کی بھی تعلیم حاصل کرے۔ رونا سب کو آتا ہے، گانا سب کو نہیں آتا۔ مگر تقریباً سب ہی گنگنا لیتے ہیں۔ آپ اتنی محبت سے اصرار کر رہے ہیں تو میں ضرور گنگناؤں گی۔ آج سے بارہ برس پہلے جب میں یہاں آئی تو اپنے پیچھے بنگلہ دیش میں اپنے والدین کی لاشیں چھوڑ کر آئی تھی۔ یہاں پاکستان میں میرے دو بھائی ہیں۔ میں نے سوچا ان بھائیوں کی پناہ میں مجھے ایک اچھی گھریلو اور خاندانی زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ لیکن وہ دونوں بھائی میرے لیے جیتے جی مر گئے۔ آج بھی وہ میرے سامنے ہیں — لیکن اس طرح کہ ہمارا درمیانی فاصلہ ختم نہیں ہوتا ہے۔ یہ گیت میں اپنے بھائی کے لیے گا رہی ہوں۔"

اس نے دُور کھڑے ہوئے طارق کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ ایک بنگالی گیت گنگنانے لگی: "اے کولے آمی، اے کولے تمی۔ ماجھ کھانے نودیا بوئے چولے جائے۔ اس پار میں ہوں اور اس پار تم ہو۔ ہمارے درمیان ایک ندی بہتی جا رہی ہے۔"

طارق سخت اضطراب میں مبتلا تھا۔ نین تارا نے گانے کے دوران دیکھا، اس کی بھابی طارق کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس مجمع سے نکل رہی تھی۔ پھر وہ دروازے کے پاس پہنچے۔ طارق نے پلٹ کر بہن کو دیکھا۔ پھر بھابی نے اس کی لگام اپنی طرف موڑ لی۔ وہ دروازے کے اس پار نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ گیت کے بول بھرانے لگے تھے۔ تکلیف سے کراہنے لگے۔ نین تارا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

*

علی اور کلیم الدین بھوئیاں کے لیے دن دن نہیں رہا تھا اور رات رات نہیں رہی تھی۔ وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ کبھی پولیس اسٹیشن جاتے تھے۔ کبھی پولیس انسپکٹر کے گھر پہنچ کر اس کے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ تم قانون کے محافظ ہو۔ تمہارے علاقے میں ہماری بچی ہم سے چھین لی گئی۔ اسے کسی طرح بھی واپس لا کر دو۔

انسپکٹر کبھی انہیں نرمی سے سمجھاتا تھا۔ کبھی بیزار ہو کر دھتکارتا تھا، دھمکیاں دیتا تھا لیکن ان پر غصے اور دھمکیوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ بھلا اثر کیسے ہوتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنے عزیز ترین رشتوں کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ عزتیں لٹتی ہوئی دیکھی تھیں۔ گھر جلتے ہوئے دیکھے تھے۔ مشرقی پاکستان کیسے نابود ہو گیا، یہ وہی جانتے تھے جن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی او

اب ایک بار پھر وہ لٹ گئے تھے۔ اس بار ان کا لٹنا ناقابلِ برداشت تھا۔ کیونکہ عورت اپنی زندگی کی ساری پونجی لٹا سکتی ہے۔ اپنی اولاد کو کسی قیمت پر ہارنا گوارا نہیں کرتی۔

کلیم الدین بھوتیاں مرد تھا۔ حوصلے سے کام لے رہا تھا لیکن اندر سے وہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اوپر سے ظلی کو تسلیاں دیتا تھا۔ وہ روٹی نہیں کھاتی تھی تو اسے اس طرح سمجھاتا تھا کہ نہیں کھائے گی تو زندہ نہیں رہے گی۔ زندہ نہیں رہے گی تو ہم اپنی بیٹی کو کس طرح تلاش کریں گے۔ آخر ایک نہ ایک دن تو وہ ہمیں ضرور ملے گی۔ ہم نے اس دنیا سے کچھ نہیں چھینا۔ یہ اللہ جانتا ہے اور جب وہ جانتا ہے تو آزمائشوں کے بعد انعام ضرور دیتا ہے۔ ہماری بیٹی بھی نہیں چھینی جائے گی۔"

وہ بیٹی کو پالینے کی آس میں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھا لیتی تھی لیکن کھانا بدن کو نہیں لگتا تھا۔ دن بدن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ وہ آنکھ بھر کے نہیں سوتی تھی۔ کبھی نیند کی حالت میں ہوتی، تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔ چیخیں مار کر بیلی کو پکارتی۔ وہ کہاں کھو گئی؟ کس حال میں ہو گی۔ دشمن اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ کیا اسے زندہ رکھا ہو گا۔ یا۔۔۔"

اس کے بعد وہ دعائیں مار مار کر رونے لگتی تھی۔ پاکستان کی جنت ہمیں بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔ کیا ہم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ میری گود اجڑ جائے۔ میری بچی کو اغوا کیا جائے، اور اسے نہ جانے کس گندے ماحول میں پہنچایا جائے۔

کلیم الدین بھوتیاں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا "یہ صرف پاکستان کی یا ملک کی یا ایک شہر کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ متحدہ بنگال سے لے کر آج تک بنگال میں جتنی لڑکیاں اغوا کی گئیں اور بازاروں میں فروخت کی گئیں ان کی مثال پورے برصغیر کے کسی اور صوبے میں نہیں ملتی۔ یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا، جب تک قانون کمزور رہے گا اور عورت بے بس رہے گی اور غنڈے سرکش رہیں گے۔"

وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی بیلی چھن گئی ہے۔ جو اسے سمجھانے آتا تھا تو اس سے پوچھتی تھی، وہ کیسے ملے گی؟ کہاں ملے گی؟

محلے پڑوس کی عورتیں سمجھاتی تھیں: "تم کب تک ماتم کرو گی؟ صبر سے کام لو۔ ابھی جوان ہو۔ اللہ نے چاہا تو اور بھی اولادیں ہوتی رہیں گی۔"

وہ ایسے وقت سہم کر ایک ایک کا منہ تکتی تھی اور کہتی تھی نہیں نہیں۔ اب میں ماں نہیں بنوں گی۔ میں نے دیناج پور سے یہاں تک کتنی ہی ماؤں کی گودیں اجڑتے دیکھی ہیں۔ اب مجھ میں اپنی گود اجاڑنے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

بھوتیاں اسے تنہائی میں سمجھاتا تھا: "پاگل نہ بنو۔ اگر اولاد ہو گی تو تمہارا غم ہلکا ہو جائے گا۔"

وہ اس سے کتراتی تھی۔ سوال کرتی تھی: "کیا اس لیے اولاد چاہتے ہو کہ میں اپنی بیلی کو بھول جاؤں۔ دوسری اولاد میں مگن ہو جاؤں؟ نہیں پلیز مجھے میری بیلی کا حساب دو۔ ایک کے بعد دوسرے زخم لگتے چلے جائیں تو آدمی حوصلے سے برداشت کر لیتا ہے لیکن ایک اولاد کے بعد دوسری اولاد چھننے کا اندیشہ ہو تو اس کے تصور سے ہی خوف آتا ہے۔ سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ نہیں پلیز مجھے بیلی چاہیے۔۔ مجھے میری بیلی چاہیے۔"

وہ مطالبہ کرتی رہی۔ کرتی ہی رہی۔ ایک برس گزر گیا۔ دو برس گزر گئے۔ سلیم الدین بھوتیاں کے نام ایک سرکاری خط موصول ہوا۔ اسے ملازمت کے سلسلے میں پھر اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ اب ظلی کو نہ تو اس کی ملازمت سے دلچسپی تھی، نہ ہی اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ وہ لاہور چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر آنے والی صبح یہ یقین دلاتی تھی کہ کہیں سے بیلی کے متعلق کوئی اطلاع ملے گی۔ وہ مجبوراً اسے پڑوسیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر اسلام آباد گیا۔ وہاں پتا چلا بہت سے بیرسٹر حضرات اور جج صاحبان نے اس کی سفارش کی تھی۔ دو برس پہلے اس نے جو خطوط لکھے تھے ان کے جوابات اسے براہِ راست موصول نہیں ہوئے تھے لیکن جواب دینے والوں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ وہ نوجوان خود کو مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کا بیٹا کہتا تھا تو اسے مجسٹریٹ سلیم الدین بھوتیاں کی وفاداری اور خدمات کے طفیل تسلیم کر لیا جائے۔ وہ جو کوئی بھی ہو، "ایک پاکستانی ہے" جو آگ اور خون کے دریا سے گزر کر اپنے وطن کی محبت میں یہاں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کی درخواستیں دو سال میں رنگ لائی تھیں۔ یہ بھی بڑا کرم تھا۔ اگر جواب بھوتیاں کی موت کے بعد آتا یا نہ آتا تو بھی کون پوچھنے والا تھا۔

بہرحال اسے لینگوئج ڈپارٹمنٹ کے انگریزی اور بنگالی سیکشن میں ملازمت مل گئی۔ بنگلہ دیش سے خوشگوار تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ایسے میں بنگالی زبان جاننے اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ اسامی خالی تھی، اس لیے اسے ملازمت مل گئی۔

اس نے اسلام آباد سے واپس آ کر یہ خوشخبری سنائی لیکن ظلی کے لیے بیلی کی بازیابی ہی خوشخبری تھی اور وہ کوئی خبر نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے اسلام آباد جانے سے انکار کر دیا۔ بھوتیاں نے سمجھایا۔ "دیکھو یہاں ہم دو برس سے اپنی بچی کو تلاش کر رہے ہیں۔ میں باپ ہوں اور مجھے کتنا دکھ ہے اور میں اندر سے اپنے آپ کو کتنا منظم کر کے رکھتا ہوں، یہ میں جانتا ہوں۔ ورنہ میں بھی تمہاری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔ ہمیں زندگی گزارنے کے لیے صبر، تحمل اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ جہاں ہم نے اتنی آفات کا سامنا کیا، وہاں اس بچی کی جدائی بھی ہمارے مقدر میں تھی۔ اسے ہم برداشت نہیں کریں گے تو زندگی کیسے گزرے گی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے، وہ آج کہیں مل جائے، کل مل جائے۔"

"اس آج اور کل میں کتنے دن گزر چکے ہیں۔ یہاں محلے پڑوس والے ہمیں جانتے ہیں۔ میں اپنے دکان دار سے بھی کہہ دوں گا۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی اپنا اسلام آباد کا پتا لکھوا دوں گا۔ جب بھی بجلی ملے گی۔ وہ ہمیں فوراً ٹیلی گرام یا ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دے دیں گے۔ ہم یہاں پہنچ جائیں گے۔"

محلے کے بزرگوں اور جاندیدہ بوڑھوں نے سمجھایا: "بی بی! تمہارا یہاں سے جانا ہی مناسب ہے۔ اس شہر میں رہو گی تو تمہارا صدمہ کبھی کم نہیں ہوگا۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں، جب بھی تمہاری بجلی کے بارے کوئی اطلاع ملے گی، ہم ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع کر دیں گے یا اپنا کوئی آدمی تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ جاؤ، اپنا گھر بساؤ۔"

عظمیٰ نے دل پر پتھر رکھ کر وہ شہر چھوڑ دیا۔ اسلام آباد آ گئی۔ یہ غلط ہے کہ جگہ چھوڑ دینے سے دکھ درد سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ مرنے والوں پر اس لیے صبر آ جاتا ہے کہ موت انہیں واپس دنیا میں نہیں بھیجتی۔ لیکن جو غائب ہو جاتے ہیں، ان کے واپس آنے کی امید بندھی رہتی ہے۔ وہ کلیم الدین بھوئیاں کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاتی، کسی پارک میں یا کسی بازار میں ڈھائی تین برس کی بچیوں کو دیکھتی تو بے تحاشا ادھر دوڑ کر جاتی۔ ہر بچی اسے پیچھے سے بجلی نظر آتی تھی۔ سامنے جا کر دیکھتی تو کلیجے پر پتھر سا لگتا۔

بھوئیاں اس کے پاگل پن کا عادی ہو گیا تھا لیکن وہاں جو زندگی گزر رہی تھی، اس میں کوئی لطف نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا، میں یہاں کیوں آیا۔ اگر بنگلہ دیش میں ہی رہ جاتا تو کیا برا تھا۔ جب وہ دفتر میں کام کرتا رہتا تو اس کے ساتھ کام کرنے والوں اس سے ملنے والوں کا پہلا سوال یہ ہوتا: "بھئی! تم تو بنگالی ہو۔ تمہیں تو بنگلہ دیش میں رہنا چاہیے تھا۔"

بھوئیاں کہتا "اگر میں وہاں رہتا تو وہ مجھ سے سوال کرتے کہ بنگلہ دیش میں کیوں ہو؟ پاکستان جاؤ۔ تمہارا باپ تو پاکستان کا وفادار تھا۔ تو میں انہیں کیا جواب دیتا یا اب آپ کو کیا جواب دوں؟"

کبھی کوئی کہتا: "بھئی اب تو بنگلہ دیش سے اچھے تعلقات ہیں۔ تم یہاں سے جاؤ گے تو کوئی تمہارا محاسبہ نہیں کرے گا۔ وہاں تمہارے لیے زیادہ بہتر ترقی کے مواقع ہیں۔"

وہ جھلا کر جواب دیتا: "آخر آپ لوگ ہمیں پاکستان میں کیوں برداشت نہیں کرنا چاہتے۔ کیا یہ پاکستان میرا نہیں ہے۔ میرا باپ آخر دم تک پاکستان کا وفادار رہا۔ اس نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا اور میں اپنے باپ کا جائز وارث ہوں۔"

"بے شک پاکستان آپ کا ہے لیکن ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی باشندے مختلف ملکوں میں جا کر روزگار حاصل کرتے ہیں۔ وہیں زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ باہر رہنے سے وہ پاکستانی نہیں رہے۔ بے شک ہیں۔ ان کے ذریعے ہمارے ملک کو زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ بنگلہ دیش میں رہتے تو....."

"تو کیا ہوتا؟ کیا بنگلہ دیش میں تیل نکلتا ہے۔ کیا وہ امیر ترین ملک ہے کہ پاکستان سے مزدور، کاریگر، انجینئر، ڈاکٹر اور دوسرے باصلاحیت لوگوں کو وہاں جا کر پاکستان کے لیے زرِ مبادلہ کمانا چاہیے۔"

"مسٹر بھوئیاں! آپ تو ناراض ہو کر جواب دیتے ہیں۔ ہم سیدھی طرح بات کرتے ہیں اور آپ کو غصہ آ جاتا ہے۔"

"آپ سیدھی باتیں کرتے ہیں یا آپ کی باتوں کے پیچھے خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ میں تو خیر بنگالی ہوں۔ نہ ادھر کا رہا ہوں، نہ ادھر کا رہا ہوں لیکن آپ لوگ تو بنگلہ دیش کے لاکھوں محبِ وطن پاکستانیوں سے غفلت برت رہے ہیں۔"

"ہمارے غفلت برتنے یا نہ برتنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر حکومت رائے عامہ کو تسلیم کرتی ہے، بشرطیکہ آپ اور ہم اور ہمارے لیڈر رائے عامہ کو صحیح طور پر حکومت کے سامنے پیش کریں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے ملک کے ایک دانشور منظور احمد اپنے ایک مضمون کے مطابق ایک رات لاہور نکلسن روڈ پر ایک بہت مشہور معروف سیاست داں سے ملنے گئے۔ ان سے ملاقات کے دوران عرض کیا "جناب! آپ کا سیاسی ماضی بڑا جمہوری، انقلابی اور تابناک ہے۔ آپ سہروردی صاحب کے ساتھی اور عوامی لیگ کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ کیا آپ اپنے پلیٹ فارم سے بہاریوں کو بنگلہ دیش سے پاکستان منتقل کرنے کے لیے کوئی تحریک چلا رہے ہیں؟"

معروف سیاسی رہنما نے فرمایا "لاکھوں افراد کا منتقل کرنا ایک مشکل کام ہے بلکہ ناممکن ہے۔ پھر مقامی آبادی اور پاکستان کے صوبے ان کو لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔"

منظور احمد صاحب نے کہا "جناب دو قومی نظریے کے مطابق بنگلہ دیش کے ہندی النسل باشندے پاکستانی ہیں اور وہ اپنے وطن آنے کا ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ اگر بنگلہ دیش کے بے وطن لوگ اپنے مطالبے میں حق بجانب ہیں تو سیاست دانوں کا فرض ہے کہ رائے عامہ کو تیار کریں۔"

انہوں نے فرمایا "ان بہاریوں کو ہندوستان جانا چاہیے، یا بنگلہ دیش میں رہنا چاہیے۔ پاکستان میں ان کی آمد ناممکن ہے۔"

منظور احمد صاحب نے کہا "لیکن ان کا جمہوری اور قانونی حق جو پامال ہوگا؟"

"انہوں نے کہا "صاحب! وہ تو ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

پھر آج کل ملک جن حالات سے گزر رہا ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ وہ لوگ محفوظ ہو جائیں گے؟

منظور احمد نے کہا: ہمارا انجام پاکستان سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک موہوم خدشے کی وجہ سے لاکھوں افراد کو موت کے منہ میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

لیکن وہ سیاسی رہنما بہاریوں کے بارے میں کوئی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور یہ صرف ان ہی پر منحصر نہیں ہے۔ یہ سیاسی رویہ عام ہے۔"

ایک دن بھویاں نے پریشان ہو کر کہا: "عظمیٰ! ہم یہاں کیوں آئے تھے؟"

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولی۔ "اپنی بچی کا ماتم کرنے۔"

"عظمیٰ! بچی سے ہٹ کر بھی کبھی سوچا کرو۔ کب تک اس کی جدائی کا ماتم کرتی رہو گی۔ ہم نے سوچا تھا کہ یہاں آ کر اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے تحریک چلائیں گے اور ان کے لیے یہاں آنے کا راستہ ہموار کریں گے ہمیں فخر ہے کہ ہم پاکستان کے نادر ہیں لیکن وہ لاکھوں بہاری جو پاکستان سے وفا کر رہے ہیں۔ کیا خطا کر رہے ہیں؟"

عظمیٰ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

بھویاں نے کہا: "ہم بنگلہ دیش واپس جائیں گے۔"

عظمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں اپنی بچی کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔ پہلے اسے ڈھونڈ نکالو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

وہ اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا: "ہم یہاں سے جائیں گے۔ میں بنگالی ہوں۔ وہاں میرا تمہارا گزارا ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں وہاں جائیں اور ہمارے پاسپورٹ اور اجازت نامے پر وہاں سے دو بہاری ادھر چلے آئیں۔ وہ ہم سے زیادہ یہاں آنے کا حق رکھتے ہیں۔"

یہ بھویاں کے جذبات تھے لیکن قانون جذبات کو نہیں سمجھتا۔ ایسا کہیں نہیں ہوتا کہ ایک کے پاسپورٹ پر کوئی دوسرا چلا آئے۔ پھر عظمیٰ بچی کے بغیر کہیں جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔ اس دوران صرف دو ہزار بہاریوں کو حکومت کی طرف سے پاکستان بلا لیا گیا اور انہیں لانڈھی کے ایک دور افتادہ علاقے یا کالونی میں بسایا گیا۔ یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ اسی طرح قسطوں میں بہاریوں کو بلایا جائے گا۔ لیکن شاید یہ خبر محض ایک خبر تھی۔ کیونکہ آج تک بہاریوں کی دوسری قسط یہاں بلائی نہیں گئی۔

یہ ۱۹۸۴ ہے۔ اکتوبر کا آخری [illegible] ہے۔ ابھی ابھی دن کے ساڑھے دس بجے خبر ملی ہے کہ [illegible] اندرا گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ نہایت ہی افسوسناک خبر ہے۔ [illegible] کے کسی حصے میں کسی کے ساتھ [illegible] ہو تو وہ قابلِ مذمت ہے

[illegible] مذمت ہے

تین لاکھ سوختہ بخت

محبِ وطن بہاری ابھی تک ظلم سہہ رہے ہیں۔ تیرہ برس گزر چکے ہیں اور پتہ نہیں کتنے برس گزرتے جائیں گے۔ نین تارا اور خسرو، عظمیٰ اور کلیم الدین بھویاں کی یہ داستان ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکے گی جب تک محبِ وطن بہاریوں کا ایک ایک بچہ ملک پاکستان نہیں پہنچ جائے گا۔ یہ ذکر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اسلامی مملکت کا ہر فرد اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے گا کہ ایک طرف اسلامی نظام قائم کیا جا رہا ہے، دوسری طرف ہزاروں بہاری مسلمان بنگلہ دیش میں کسمپرسی کی زندگی سے تنگ آ کر اپنا مذہب تبدیل کر رہے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد عیسائیت کی تبلیغ کرنے والوں نے خانماں برباد مسلمانوں کے لیے خیمے مہیا کیے تھے۔ انہیں سونے کے لیے بستر، اوڑھنے کے لیے کمبل، کھانے کے لیے روٹی اور مختلف امراض کے لیے مفت دوائیں تقسیم کرتے رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ نہیں کی تھی لیکن اب اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ جسے روٹی کپڑا، محفوظ پناہ گاہ اور بچوں کی تعلیم اور علاج کی ضرورت ہو، وہ اس دروازے سے گزر جائے اور وہ گزر رہے ہیں۔ وہ مجرم نہیں ہیں۔ انہیں چاروں طرف سے کالی بلاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ پاکستان کا دروازہ ان کے لیے بند ہے۔ کوئی اسلامی مشن ان کی دلجوئی کے لیے بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ جب چاروں طرف دروازے بند ہوں اور ایک ہی دروازہ کھلا ہو تو اپنی عورتوں اور بچوں کو بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس ایک دروازے سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

اگر جرم و وفا محض ایک خیالی داستان ہوتی تو اس کا اختتام کسی بھی اچھے موڑ پر کیا جا سکتا تھا لیکن سچائی کسی موڑ پر ختم نہیں ہوتی۔ تاریخ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جس لمحے اس سچی داستان کا اختتام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اسی لمحے دور کہیں ایک نو برس کی بچی کے پاؤں میں گھنگھرو باندھے جا رہے ہیں۔ تا تھئی، تھا تھا تھئی کی تال پر اسے رقص کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ایک عورت نو برس سے اپنی اجاڑ ممتا کا ماتم کرتی نظر آ رہی ہے۔ وہ رقص کرتے ہوئے پاؤں ابھی رقص کرتے رہیں گے۔ اب وہ ماں باپ اس معصوم بچی کو کبھی پہچان نہیں سکیں گے بالکل ایسے ہی جیسے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد یہاں کے پاکستانی وہاں کے پاکستانیوں کو پہچاننا بھول گئے ہیں۔ اس عرصے میں بچی کا چہرہ بدل گیا ہے اور ہماری آنکھیں بدل گئی ہیں۔